جاگے ہیں خواب میں

(ناول)

اختر رضا سلیمی

جاگے ہیں خواب میں

(ناول)

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں
(غالب)

جاگے ہیں خواب میں

(ناول)

اختر رضا سلیمی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب: جاگے ہیں خواب میں

مصنف: اختر رضا سلیمی

پہلی اشاعت: مارچ ۲۰۱۵ء

دوسری اشاعت: مئی ۲۰۱۵ء

تیسری اشاعت: اپریل ۲۰۱۷ء

کمپوزنگ: عابد محمود

مصور: وصی حیدر

ٹائٹل کولاژ: عمیمہ وصی

قیمت:

اوریجنل پینٹنگ ٹائٹل: 2500 روپے

35 ڈالر (بیرونِ ملک)

عام ٹائٹل: 300 روپے (پاکستان)

10 ڈالر (بیرونِ ملک)

نعمان فاروق کے نام

کہاں سے آئے ہیں ہم لوگ یہ نہیں معلوم
مگر یہ طے ہے بہر حال اس جہاں کے نہیں

اظہارِ تشکر

میں ممتاز مصور اور اپنے انتہائی عزیز دوست جناب وصی حیدر کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس ناول کے سرِ ورق کے لیے ایک ہزار ایک (1001) پینٹنگز بنائیں۔ یوں اس ناول کے پہلے ایک ہزار ایک نسخوں کا سرِ ورق نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہے بل کہ ہر نسخہ اوریجنل پینٹنگ کا حامل ہے۔ وہ اس سے قبل میری پچیس نظموں کو بھی بصری قالب میں ڈھال چکے ہیں۔

میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے وصی حیدر جیسے محبت کرنے والے دوست ملے۔

اس پر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

اختر رضا سلیمی

ای میل: ar.saleemipal@gmail.com

0300-5171427, 0335-0550748

فہرست ابواب

پہلا باب

ایک خواب جو حقیقت میں بھی موجود تھا

(۱)

''یہ سب خواب سا ہے، بالکل خواب سا۔'' زمان نے پتھریلے تکیے پر سر رکھ کر خلا میں گھورتے ہوئے سوچا۔

گزشتہ کئی سال سے اس کا معمول تھا کہ وہ مہینے میں دو چار دن اور ایک آدھ چاندنی رات یہاں ضرور گزارتا۔ دن کے وقت اس کی نظریں نشیب میں بسنے والی بستی پر، جب کہ رات کو آسمان پر مرکوز رہتیں۔ وہ جب بھی یہاں آتا ہمیشہ اسی مقام پر بیٹھتا۔ یہ ایک غار کے دہانے کا پتھریلا چبوترا تھا، جس کی لمبائی سات فٹ اور چوڑائی چار فٹ کے قریب تھی۔ پتھریلا ہونے کے باعث نہ تو اس پر گھاس واس اور جڑی بوٹیاں اگتیں، اور نہ ہی مٹی اور دھول جمتی۔ اگر کبھی کبھار دھول پڑتی تو بھی اسے آسانی سے صاف کیا جا سکتا تھا۔ البتہ خشک پتے اس پر عموماً سرسراتے رہتے، جن کی سرگوشیوں سے وہ بہت مانوس ہو چکا تھا۔

دن ہو یا رات، وہ جب بھی یہاں آتا، اپنے کالے کمبل کو بچھانے کی غرض سے، دوہرا کرتے ہوئے، چٹان کی سطح کو بغور دیکھتا۔ پھر کمبل ایک طرف رکھ کر، ایک نظر اپنی بائیں ہتھیلی پر ڈالتا، کچھ سوچتا اور پھر کمبل کو احتیاط سے بچھا کر اس پر لیٹ جاتا۔ یہ پتھریلا پلنگ اسے، ایک ایسا سرور بخشتا، جسے وہ گزشتہ بارہ برسوں میں کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔

چبوترے پر مغرب کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوا جائے تو دائیں اور بائیں جنگلی اناروں کی جھاڑ جھنکاڑ، پاؤں کی سمت غار کا دہانہ، جس کے نشیب میں میل بھر کے فاصلے پر ایک بستی؛ اور پشت کی طرف بتدریج بلند ہوتا پہاڑ ہے، جس کی چوٹی چیڑ کے درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ غار کے عقب میں عین اس جگہ پر، جہاں سے ہموار زمین یک دم بلند ہونا شروع ہو جاتی ہے، چیڑ کا ایک درخت، ڈار سے بچھڑے ہوئے پرندے کی طرح، تنہا کھڑا ہے۔ جس کا تنا اتنا موٹا ہے کہ اگر دو آدمی اس کے مدور تنے

کے گرد، آمنے سامنے، بازو پھیلا کر اسے اپنے کلاوں میں لینے کی کوشش کریں تو ان کے ہاتھوں کی انگلیاں بمشکل ہی ایک دوسرے کو مس کر سکیں۔ تنا بالکل سیدھا ہے اور ما سوائے ایک ڈال کے، جو زمین سے سولہ سترہ فٹ کی بلندی پر واقع ہے، باقی سب کے سب چوبیں پچیس فٹ کی بلندی سے شروع ہو کر چوٹی تک شاخ در شاخ پھیلے ہوئے ہیں، جن کی دنبالہ دار شاخیں دوپہر تک چٹان پر سایہ کیے رکھتی ہیں۔ دوپہر کے بعد ان کا سایہ آہستہ آہستہ عقبی پہاڑ کے ساتھ لپٹنا شروع ہو جاتا ہے۔ شام ڈھلے جب سورج مغرب کی سمت واقع کوہ مل کی چوٹیوں پر غروب ہو رہا ہوتا ہے، ان کا سایہ اوپر پہاڑ پر موجود دوسرے درختوں کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتا اور سورج غروب ہوتے ہی معدوم۔

چیڑ کے تنے پر زمین سے تقریباً تین فٹ اوپر ایک گہرا گھاؤ ہے جو تنے کے کل کا ایک چوتھائی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی شخص نے اسے کلھاڑیوں سے کاٹنے کا ارادہ باندھا اور چوتھائی بھر کاٹنے کے بعد اسے ہواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ کٹے ہوئے حصے سے ایک لیس دار مادہ رِس رہا ہے جو نیچے، زمین سے فٹ بھر اوپر تنے میں نصب، ٹین کے ایک ڈبے میں گر رہا ہے۔ یہ لیس دار مادہ، جسے مقامی زبان میں ''جیکن'' کہا جاتا ہے، تنے سے نکلتے وقت خاصا نرم اور نسبتاً پتلا ہوتا ہے، لیکن جیسے ہی اسے ہوا کے جھونکے چھوتے ہیں یہ بتدریج گاڑھا اور سخت ہو کر ایک دھار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خالص شہد کی مسلسل دھار کی طرح۔ لیکن اس کے گرنے کی رفتار انتہائی ست ہے۔ اتنی ست کہ بغور دیکھنے کے بعد ہی مشاہدے میں آ سکتی ہے۔ اسے ہتھیلی پر لگا کر مٹھی بند کر لی جائے تو دوبارہ کھولتے ہوئے خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اگر کچھ وقت گزر جائے تو یہ دشواری ناممکن کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔ بستی کی اکثر خواتین آج بھی اسی جیکن کے ذریعے اپنے ناپسندیدہ بالوں سے نجات حاصل کرتی ہیں۔ وہ اسے کسی سوتی کپڑے پر لیپ کر جسم کے متعلقہ حصوں پر چپکا دیتی ہیں اور کچھ ہی دیر بعد جب اسے کھینچ کر اتارتی ہیں تو ایک طویل، لذت آمیز سسکاری کے ساتھ، بال جڑوں سمیت کپڑے سے چپک جاتے ہیں۔ اس عمل کے بعد جسم کے مذکورہ حصے یوں صاف و شفاف دکھائی دیتے ہیں، جیسے وہاں بال کبھی تھے ہی نہیں۔

آج سے تقریباً پچاس برس پہلے تک، بستی والے، چیڑ کے درختوں کے بغیر، زندگی کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔ بستی کے مکانوں کے ستون، کڑیاں، بالے، بلیاں، چوکھٹیں، کھڑکیاں، دروازے، الماریاں اور فرنیچر سب کا سب چیڑ کا ہوتا تھا۔ مکانوں کے چھت کی مٹی روکنے کے لیے بھی وہ چیڑ کے نوک دار باریک پتے، جنھیں پتوں کے بجائے تنکے کہنا زیادہ مناسب ہے، استعمال کرتے تھے۔ گھروں کی دیواروں کی لپائی میں بھی وہ انھی پتوں کا باریک کترا استعمال کرتے تاکہ گارا پتھروں کے

ساتھ آسانی سے چپک سکے۔بطور ایندھن بھی زیادہ تر لکڑی چیڑ ہی کی استعمال کی جاتی۔بہت پہلے جب لالٹینیں اور تیل سے جلنے والے لیمپ موجود نہیں تھے۔بستی والے روشنی کے لیے بھی یا تو چیڑ کے تنے کے عین مرکز میں واقع سرخ رنگ کی لکڑ، جسے وہ ''دِلی'' کہتے ہیں،بطور مشعل استعمال کرتے ،یا چیڑ کے چیکن کو مٹی کے پیالوں میں ڈال کر جلاتے۔موسم گرما خاص کر ساون کے دنوں میں صحن کے ایک کونے میں آگ جلا کر اس میں چیڑ کی سبز ٹہنیاں ڈال دی جاتیں،جو یک دم جلنے کے بجائے آہستہ آہستہ سلگتیں اور فضا میں کڑوے دھویں کے مرغولے چھوڑتی رہتیں۔یہ کڑوا دھواں صحن میں موجود ڈینگی ،مچھروں اور مکھیوں کو یا تو مار گراتا یا پھر انھیں دور بھاگنے پر مجبور کر دیتا۔کمہار چیڑ کی چھال سے مٹی کے برتن پکاتے۔بستی میں اب بھی یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ چیڑ کی چھال کی آگ سے پکے ہوئے برتن زیادہ پر کشش ،خوش نما اور دیر پا ہوتے ہیں۔عورتیں گھر کے برتن مانجھنے کے لیے چیڑ کی کوجیاں استعمال کرتیں۔چلغوزے سے ملتا جلتا اس کا پھل سردیوں میں خاصے کی چیز سمجھا جاتا تھا۔علاقے کے قدیم حکما و اطبا کا خیال تھا کہ تپ دق کے مریض کو اگر چیڑ کے درخت کے نیچے لٹایا جائے یا اسے ،اس کی سبز ٹہنیاں سونگھائی جائیں تو وہ جلد صحت یاب ہو جاتا ہے۔

چبوترے کے نیچے ایک تنگ و تاریک غار ہے جس کا دوسرا دہانہ،بستی والوں کے بقول،کسی نامعلوم مقام پر ہے، جو پریوں کا دیس ہے۔سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی یہ روایت اب تواتر کے درجے تک پہنچ چکی ہے کہ چودھویں کے چاند کی راتوں میں،عین اس وقت، جب چاند کی کرنیں، غار کے دہانے کے اندر پڑتی ہیں، وہاں سے پریاں نمودار ہوتی ہیں۔اگر بدقسمتی سے اس وقت وہاں کوئی آدم زاد موجود ہو تو اسے اسی غار کے رستے اپنے دیس لے جاتی ہیں۔اس روایت کو ثقاہت کے درجے تک پہنچانے میں ایک مخبوط الحواس شخص کا بھی ہاتھ ہے، جو قریباً پچاس سال قبل بستی سے ایسی ہی کسی رات اچانک غائب ہو گیا تھا اور اپنے پیچھے ایک طلسم ہوش ربا سی داستان چھوڑ گیا تھا۔بعض بوڑھے بزرگوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اسے،تقریباً پانچ کلومیٹر دور، پہاڑ کی دوسری جانب بہنے والی ندی نیلاں میں اس جھیل میں چلہ کرتے ہوئے دیکھا تھا جہاں حضرت ظفر علی خان غار والی سرکار چلہ کشی کرنے جایا کرتے تھے، جن کا مزار اب بھی بستی میں مرجع خلائق ہے۔

غار کے نشیب میں تقریباً دو سو گز نیچے دو بڑی بڑی گول چٹانیں خاصی ابھری ہوئی ہیں جو دائیں بائیں متوازی ہیں اور ان کے درمیان پچاس پچپن گز کا فاصلہ ہے۔ان چٹانوں کے بارے میں مشہور ہے کہ چودھویں کے چاند کی راتوں میں پریاں ان پر بیٹھ کر چاند ڈھلنے تک چاندنی سے غسل کرتی رہتیں ہیں۔

ان چٹانوں کے عین درمیان میں، مگر کچھ نیچے ایک گہرا گڑھا سا بنا ہوا ہے، جو پیالہ نما ہے۔ اس گڑھے سے دونوں چٹانوں کا فاصلہ بالکل برابر ہے۔ اگر گڑھے کے عین وسط میں ایک کھمبا نصب کر کے، دونوں چٹانوں کو پہلے آپس میں اور پھر انھیں اس کھمبے سے، کسی تنے ہوئے رسے سے ملا دیا جائے تو؛ غار سے دیکھنے پر ایک متساوی الاضلاع مثلث بنتی نظر آتی ہے۔

گڑھے سے تقریباً بیس گز نیچے ٹیکسلا کو جانے والا ایک قدیم راستہ ہے، جو ایک لکیر کے مانند وادی کو اوپر نیچے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ راستے سے فرلانگ بھر نیچے ایک چشمہ ہے اور چشمے کے آگے ایک میدان۔ میدان میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ ایک بڑی چٹان ہے، جو میدان کے آخری سرے پر یوں ایستادہ ہے جیسے اگر کوئی اسے ہلکا سا دھکا دے دے تو وہ بستی کے بعض مکانوں کو مسمار کرتی ہوئی نیچے بڑے برساتی نالے میں جا گرے۔

اس چٹان کے بارے میں صدیوں سے ایک کہانی چلی آ رہی ہے۔ کہانی کچھ یوں ہے:

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ راجا رسالو کی بیوی رانی کوکلاں اور ایک آدم خور دیو کہیں چھپ کر ایک دوسرے پر فریفتہ ہو رہے تھے۔ راجہ کی بیوی کے ساتھ طوطے اور مینا کی ایک جوڑی بھی تھی۔ وہ دونوں اپنی رانی کو آدم خور دیو کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئے۔ مینا سے رہا نہ گیا، اس نے رانی کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ رانی نے غصے میں آ کر مینا کی گردن مروڑ دی۔ مینا کا انجام دیکھ کر طوطا اڑ کر رجوعیہ کے میدان میں پہنچ گیا۔ جہاں راجا بے خبر سویا ہوا تھا۔ طوطے نے دریائے دوڑ میں اپنے پروں کو بھگو کر پانی راجا رسالو کے منہ پر چھڑکا، پانی کے چھینٹے منہ پر پڑتے ہی وہ جاگ اُٹھا۔ راجا کے جاگتے ہی طوطے نے اسے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ راجا نے طوطے کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ کر اپنی بیوی کو قتل کر دیا جب کہ دیو گھبرا کر بھاگ نکلا، اور اوپر وادی میں موجود پریوں والی غار میں آ چھپا۔ راجا نے غار کا دہانہ ایک بڑی چٹان سے بند کر دیا لیکن جیسے ہی راجا اسے بند کر کے نیچے اترا، دیو نے زور لگایا اور چٹان تیزی سے سرکتی ہوئی راجا کے پیچھے پیچھے میدان میں پہنچ گئی۔ وہ میدان کے آخری سرے سے نیچے گرنے ہی والی تھی کہ راجا نے اسے اپنے بائیں ہاتھ سے روک لیا۔ دیو نے یہ منظر دیکھا تو وہ مزید گھبرا گیا اور میلوں دور گندگر پہاڑ کی ایک غار میں جا چھپا۔ جس کا دہانہ، راجا نے، ایک اس سے بھی بڑی چٹان سے بند کر دیا اور چٹان کی اندرونی طرف ایک تیر کی مدد سے اپنی تصویر کندہ کر دی۔ جسے دیکھ کر دیو ڈر گیا اور اس نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بستی والوں کے بقول وہ دیو آج بھی وہاں بند ہے، اور یہ کہ اس کے گرجنے اور کراہنے کی آواز گندگر پہاڑ سے اب بھی کبھی کبھی آتی ہے۔ جو بادلوں کے

دور سے گرجنے کی آواز سے مشابہ ہے۔''

زمان جب بھی غار کے چبوترے پر بیٹھ کر اس چٹان کو دیکھتا، اسے یہ کہانی ضرور یاد آتی، جو اسے گاؤں کے بوڑھے بزرگوں نے سنائی تھی۔

دن کو زمان کے یہاں غار پر آنے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا لیکن سردیوں میں چودھویں کے چاند کی وہ راتیں؛ جن میں تمام علاقہ برف کی چادر میں لپٹا ہوتا، وہ چاند ابھرنے کا انتظار کرتا رہتا۔ پھر جوں ہی مشرق کی طرف سے چاند منہ نکالتا، اس کے قدم بھی حویلی کی دہلیز پار کر رہے ہوتے۔ اس کے قدموں کی رفتار، چاند کی حرکت سے اتنی ہم آہنگ ہوتی کہ اس کی ابتدائی کرنیں بھی عین اسی وقت پہاڑ کے عقب سے چبوترے پر پڑنا شروع ہوتیں، جب وہ غار کے پتھریلے چبوترے پر اپنے قدم رکھ رہا ہوتا۔

''ماہِ کامل کے نظارے کا لطف یا تو ساحل سمندر پر ہے یا برف پوش پہاڑوں پر۔'' یہ فقرہ اس نے ساڑھے بارہ سال قبل اس وقت کہا تھا جب وہ اپنے یونیورسٹی فیلوز کے ساتھ کراچی چھٹیاں گزارنے گیا ہوا تھا۔

''اور ماہِ نور کا۔۔؟'' اس کے ایک دوست نے اسے چھیڑا تھا اور پھر وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

''تم کیا جانو۔ لہروں کو کشش کرتی اور برف میں سرایت کرتی چاندنی کا منظر کیا ہوتا ہے؟'' اس نے انتہائی سنجیدگی اور متانت سے کہا تھا۔

برف میں سرایت کرتی چاندنی کا منظر اسے واقعی پاگل کر دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سخت سردی کے باوجود، گزشتہ بارہ برسوں میں، اس نے، ایسی صرف وہی راتیں گھر میں گزاری تھیں، جن میں برف باری یا مطلع ابر آلود ہونے کے باعث، چاند کا چہرہ بادلوں کی اوٹ میں رہا تھا۔ ایسی راتوں میں، پچھلے پہر جب چاند ڈھلنا شروع ہوتا اور اس کی چاندنی غار کے دہانے پر پڑنا شروع ہوتی۔ زمان مغرب کی سمت واقع ایک چھوٹی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اس پہاڑ کا نظارا کرتا، جو اسے کسی اور ہی دنیا میں لے جاتا۔ وہ ٹک ٹکی باندھے ادھر کو دیکھتا رہتا۔ دیکھتے دیکھتے غار اسے کسی حسینہ کے دہن کے مانند دکھائی دینے لگتا۔ ایک ایسا دہن جس کا اوپر والا ہونٹ نسبتاً پتلا اور ابھرا ہوا ہو۔ غار کے دہانے پر پڑے ہوئے برف آلود پتھر، چاندنی میں اسے، اس حسینہ کے دانت معلوم ہوتے۔ برف میں لپٹے ہوئے اس منظر میں، اس کا اپنا کمبل، جسے وہ دانستاً وہاں چھوڑ آتا، اسے ایک سیاہ تل کے مانند دکھائی دیتا۔ جب کہ چیڑ کے تنے کو وہ ایک لمبی اور پتلی ناک، مخالف اطراف میں پھیلے ہوئے، اس کے نچلے ڈالوں کو آنکھیں

،ان کے اوپر لٹکتی ہوئی دنبالہ دار شاخوں کو بھنوئیں اور اس سے پچھلے بڑے ٹیلے کو اس حسینہ کا سر تصور کرتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی نظریں نیچے کی جانب لے آتا، جہاں وادی میں موجود دو بڑی چٹانیں ؛اس کی آنکھوں کے آگے اس حسینہ کے سینے کے ابھاروں کے مانند ابھرتیں۔ان دونوں چٹانوں کے عین درمیان میں؛ نیچے کی جانب واقع پیالہ نما گڑھا، جو ایسی راتوں میں برف سے بھرا ہوتا، اسے پیالہ ءناف معلوم پڑتا۔گڑھے سے نیچے، وادی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والا قدیم راستہ، اسے،اس حسینہ کے سفید جسم پر کس کر باندھے ہوئے آزار بند سے پڑنے والا نشان لگتا۔ یہاں آ کر اس کی نظر ٹھہر جاتی۔اس نشاط انگیز پتھریلی حسینہ کا نچلا دھڑ دیکھنے کا اسے کبھی حوصلہ نہیں ہوا۔اسے ہمیشہ یہ خوف دامن گیر رہا کہ اگر اس کی نظر نچلے دھڑ پر پڑ گئی تو اس حسینہ کا سارا طلسمی حسن زائل ہو جائے گا۔لہٰذا وہ اپنی نظریں آہستہ آہستہ دوبارہ اوپر کی طرف لے جاتا اور خود کو اس کے ابھرے ہوئے ہونٹ کے پیچھے سیاہ لمبوترے تل میں تلاش کرتا؛ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے ماہ نور کے چہرے کے خدوخال کو ذہن میں لاتا اور پھر خود ہی فرض کر لیتا کہ وہ وہاں موجود ہے۔وہ ایک مرتبہ پھر پورے منظر کو دیکھتا اور تصور کرتا کہ برسوں پہلے کسی شخص نے یہیں کھڑے ہو کر کسی حسینہ کے سراپے سے مماثل یہ منظر دیکھ کر غار سے پریوں کے نکلنے کی کہانی گھڑی ہو گی۔

تین روز کی مسلسل برف باری کے بعد آج دوپہر کو مطلع صاف ہونے کے آثار پیدا ہوئے تو وہ چودھویں کے چاند کی چاندنی سے پیدا ہونے والے منظر کے بارے میں سوچ کر سرشار ہو گیا۔ پارسال اس کی یہ خواہش بادلوں اور دھند کی نذر ہو گئی تھی، جس کا اسے بے حد افسوس رہا تھا۔

ظہر کے وقت جب مغرب کی جانب سے آسمان صاف ہونا شروع ہوا اور برف سے ڈھکی ہوئی بستی سورج کی پہلی کرنوں کا استقبال کرنے لگی تو اس کا وجود کسی ان دیکھی آگ سے سلگ اُٹھا۔اس نے پھاوڑا اٹھایا اور غار کی طرف چل دیا۔غار کے چبوترے پر پہنچ کر اس نے فوراً پھاوڑے سے برف ہٹانے کا کام شروع کر دیا۔چوں کہ گزشتہ تین دنوں میں کسی بھی لمحے بادل نہیں چھٹے تھے بل کہ وقفے وقفے سے برف باری بھی ہوتی رہی تھی،اس لیے برف پر ابھی کہرے کی وہ تہہ نہیں جمی تھی جو اسے سخت کر دیتی ہے۔برف ابھی تک روئی کے گالوں کی طرح نرم تھی۔لہٰذا اسے چبوترا صاف کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

برف ہٹانے کے بعد اس نے پہلے تو چبوترے کو سرسری طور پر دیکھا۔پھر اس کے عین وسط میں ابھری سیاہ لکیروں کو یوں بغور دیکھنے لگا، جیسے ریاضی کا کوئی پیچیدہ مسئلہ حل کر رہا ہو۔ایک آدھ بار اسے کچھ شک سا گزرا تو وہ فوراً اپنی بائیں ہتھیلی کی لکیروں کا، پتھر پر بنی لکیروں سے موازنہ کرنے لگا۔ چار پانچ منٹ کے موازنے کے بعد اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ پتھر پر بنی لکیریں اس کی ہتھیلی کی

لکیروں سے بدستور مشابہ ہیں ۔اس نے چبوترے کے ارد گرد کے منظر پر نظر دوڑائی ۔سارا منظر برف کی شال میں لپٹا ہوا تھا سوائے چیڑ کے بڑے درختوں کے؛ جن کے شاخ در شاخ پھیلے ڈالوں کی صرف ان ٹہنیوں پر برف تھی جو اوپر فضا کی طرف تھے ۔ نچلے ڈالوں کی وہ شاخیں، جن پر مزید شاخوں کی تہہ تھی، برف سے مکمل طور پر ڈھکی تھیں ۔اگر کوئی یہاں کے منظر کا فضائی جائزہ لیتا تو یقیناً چیڑیں بھی اسے مکمل طور پر برف سے ڈھکی نظر آتیں ۔لیکن زمین سے اوپر کی سمت دیکھتے ہوئے ایسا منظر نہیں بنتا تھا ۔

دھوپ نکل آنے کے باعث درختوں کی شاخوں پر کھلی برف آہستہ آہستہ پگھلنا شروع ہو گئی تھی اور پتوں کے کناروں پر سے پانی کے چھوٹے چھوٹے قطرے گرنا شروع ہو گئے تھے ۔ جب ہوا کا تیز جھونکا آتا اور شاخ پر کھلی برف کا کوئی پھول نما گالا نیچے گرتا تو ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوتی جو اگلے ہی لمحے چیڑ کے درختوں کی مخصوص ''شوں کار'' میں غائب ہو جاتی ۔

زمان نے نشیب میں بستی کی طرف دیکھا جس پر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے ۔آدھی بستی مغربی پہاڑ کے سائے میں آ چکی تھی تاہم اس کے اپنے ارد گرد کا تمام منظر دھوپ میں نہایا ہوا تھا ۔ جب،اس نے اپنی نظریں بستی سے آہستہ آہستہ پہاڑی ڈھلان کی طرف لانا شروع کیں تو اس کے دل میں ایک چبھن سی ہوئی، جیسے کسی نے چیڑ کے باریک نوکیلے پتے اس کے سینے میں ترازو کر دیے ہوں ۔ اس نے دیکھا کہ جہاں جہاں سایوں نے اپنے پر پھیلا رکھے ہیں وہاں برف کی سفیدی زیادہ واضح ہے لیکن جہاں جہاں دھوپ ہے وہاں برف کا رنگ ہلکا سا زردی مائل ہے ۔اسے لگا جیسے سورج برف کی سفیدی میں پیلاہٹ گھول رہا ہے ۔سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی ۔اس سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور اس کے قدم خود بخود چبوترے کے ساتھ بنے قدرتی زینے کی طرف اٹھنے لگے ۔

سورج غروب ہونے تک وہ اپنے کمرے میں لیٹا منقش چھت کو گھورتا رہا پھر سہ پہر کے وقت دیکھے ہوئے دل شکن منظر کا انتقام؛ رات بارہ بجے کے قریب ابھرنے والے جادوئی منظر سے لینے کے بارے میں سوچنے لگا ۔

بستی کی مسجد کے میناروں سے مغرب کی اذان بلند ہوتے ہی وہ اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گیا ۔ برف باری کے بعد مطلع صاف ہو تو رات کا پہلا پہر گزرنے تک برف کے اوپر کہرے کی ایک مضبوط تہہ جم جاتی ہے، جس سے سردی کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔

''آج تین پاجامے ٹھنڈ پڑے گی'' اس نے سوچا ۔

وہ ہمیشہ سردی کو پاجاموں کی تعداد سے ناپتا تھا ۔جتنی زیادہ سردی اتنے زیادہ پاجامے ۔ وہ

اٹھا؛اور کونے میں پڑی میز پر رکھے،ایک ٹرنک کی طرف بڑھا۔ٹرنک پر جمی گرد کی موٹی تہہ گواہی دے رہی تھی کہ اسے کئی مہینوں سے نہیں کھولا گیا۔اس نے ٹرنک کھولا اور اوپر والے پلڑے کو فضا میں سیدھا کھڑا کرنے کی کوشش کرنے لگا،لیکن قبضے ڈھیلے ہونے کی وجہ سے وہ اپنا وزن سہار نہیں پا رہا تھا اور بار بار نیچے اس کے بازوؤں پر لڑھک آتا۔اس نے وہیں کھڑے کھڑے پہلے اپنی کمر اور پھر گردن میں خم پیدا کر کے،اپنا منہ ٹرنک کے اندر گھسا کر،ٹرنک کا پلڑا اپنے سر کے پچھلے حصے پر جما دیا اور ٹرنک میں موجود کپڑوں کو الٹنے پلٹنے لگا۔پرانے کپڑوں کی مخصوص بو کا ایک بھبھوکا اس کی ناک میں گھسا جس سے اس کے نتھنے خود بخود سکڑنے لگے۔اس نے الم غلم کپڑوں کے نیچے پڑے تین موٹے پاجامے اور اسی سے ملتی جلتی پورے بازوؤں والی تین شرٹیں باہر نکالیں اور جسم پر پاجاموں اور شرٹوں کی تہیں چڑھانے لگا۔تین تہوں کے بعد اس نے وہی موٹی شلوار قمیص پہنی جو اس نے ابھی ابھی اتاری تھی۔پھر اس نے ٹرنک میں سے موزوں کے دو جوڑے نکال کر اوپر نیچے پہنے اور میز کے نیچے رکھے ہوئے لیدر کے بوٹ نکال کر پہننے لگا جنہوں نے پاؤں کے ساتھ ساتھ اس کی پنڈلیوں کو بھی ڈھانپ لیا۔بوٹوں کی زپ بند کرنے سے پہلے اس نے شلوار کے دونوں پائنچے احتیاط سے بوٹوں کے اندر کیے۔پھر کھونٹی پر ٹنگا ہوا لیدر کا اوور کوٹ اتار کر پہنا جس کا گھیرا،اس کی پنڈلیوں کو بھی اپنے حصار میں لیے ہوئے تھا۔پھر ایک بڑے گرم مفلر اور ٹوپی سے سر اور گردن کو یوں ڈھانپا کہ آئینے کا سامنا کرتے ہوئے ــــ اپنی آنکھوں کی گہرائی میں اترے بغیر ــــ وہ خود کو پہچان نہ پایا۔آئینے میں سر سے پاؤں تک اپنا جائزہ لینے کے بعد اس نے پلنگ پر پڑا کالے رنگ کا ایک چھوٹا کمبل اور اس کے نیچے رکھی کاہو کے لمبے دستے والی کلھاڑی اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

قدیم راستے کو عبور کرتے ہوئے اس نے ایک نظر نیچے میدان میں ایستادہ چٹان پر ڈالی،جس پر جمی برف،میدان میں پڑی ہوئی برف کی نسبت زیادہ واضح دکھائی دے رہی تھی۔چاند ابھی اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔تاہم سامنے کی چھوٹی پہاڑی پر چاندنی کی چادر بچھ چکی تھی،جس سے منعطف ہوتی روشنی اسے راستہ سجھا رہی تھی۔یہاں سے آگے راستہ خاصا عمودی تھا جو دو بڑی چٹانوں کے درمیان واقع گڑھے کے کنارے سے ہوتا ہوا غار کے دہانے تک جا پہنچتا تھا۔پہاڑ کے عقب سے نمودار ہوتے چاند کی چاندنی وادی میں صرف دو بڑی چٹانوں کے ابھاروں پر چمک رہی تھی۔باقی تمام وادی پر ابھی پہاڑ کی چوٹی کا سایہ تھا۔تاہم کچھ درختوں کی چوٹیاں بھی چاندنی میں نہانے کی تیاری کر رہی تھیں،پیالہ نما گڑھے کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے؛حسبِ معمول کسی بھاری چٹان سے چھینیوں کے ٹکرانے کی آوازیں سنائی دیں،اگرچہ،وہ،یہ آوازیں،گزشتہ بارہ برسوں سے متواتر سن رہا تھا،لیکن ان کی پہچان،

اسے چار سال پہلے، اس وقت ہوئی جب وہ ٹیکسلا میں سنگ تراشوں کے محلے سے گزر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ ان آوازوں پر غور کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے رکا، بے خیالی میں بائیں سمت والی چٹان کی طرف قدم بڑھائے لیکن ہر بار کی طرح، اگلے ہی لمحے، ادھر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے چڑھائی چڑھنے لگا۔ اس کی منزل اب اس سے صرف اڑھائی سو گز کے فاصلے پر تھی۔

وہ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا جنگل گھنا اور راستہ تنگ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بعض جگہوں پر دونوں طرف کی جھاڑیاں اوپر جا کر آپس میں یوں مل گئی تھیں کہ راستے پر جگہ جگہ محرابی دروازے سے بن گئے تھے جن میں سے بعض کے نیچے سے اسے خاصا جھک کر گزرنا پڑ رہا تھا۔ جب وہ جھاڑیوں کی کسی تنگ محراب سے گزرتا اور کلھاڑی کے لمبے دستے سے نیچے لٹکتی شاخوں کو پرے دھکیلتا تو جھاڑیوں میں ایک سنسنی سے دوڑ جاتی اور ان پر جمی برف اس کے شانوں پر سے پھسلتی ہوئی زمین پر جا گرتی۔ غار کے دہانے پر پہنچ کر اس نے کلھاڑی کا پھل اپنی گردن کے کالر میں اڑسا اور چٹان میں بائیں طرف بنے ہوئے چار قدرتی زینوں میں سے تیسرے کو پکڑ کر اپنے دونوں پاؤں؛ پہلے زینے پر مضبوطی سے جمائے؛ پھر یکے بعد دیگرے اپنے ہاتھ چوتھے اور آخری زینے کی طرف بڑھائے اور دایاں پاؤں دوسرے؛ جب کہ بایاں پاؤں تیسرے زینے پر جماتے ہوئے چھاتی پر زور ڈال کر چٹانی چبوترے پر چڑھ گیا۔ چاند بھی، حسبِ معمول اپنی ابتدائی کرنیں، عین اسی لمحے چبوترے پر نچھاور کر رہا تھا۔

چبوترے پر پہنچ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔

''چاند آج معمول سے زیادہ روشن ہے''۔ اس نے پہاڑ کی عقبی چوٹی سے نمودار ہوتے ہوئے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

کاندھے پر رکھا کمبل اتار کر اسے درمیان سے دوہرا کرتے ہوئے اس نے ایک نظر چٹان پر بنی آڑھی ترچھی لکیروں کو دیکھا، باوجود اس کے کہ آج سہ پہر کو وہ ان کا موازنہ اپنے ہاتھ کی لکیروں سے کر چکا تھا، اس نے اپنے بائیں ہاتھ کی لکیروں کا موازنہ چٹانی لکیروں سے ضروری سمجھا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے حسبِ معمول ایک بے نام سی راحت کا احساس ہوا۔

اس نے کمبل احتیاط سے بچھایا اور قریب پڑے ہوئے، ڈیڑھ فٹ لمبے اور فٹ بھر چوڑے پتھر کو تکیے کی جگہ کمبل کے نیچے رکھا۔

''یہ سب خواب سا ہے۔ بالکل خواب سا۔'' اس نے پتھریلے تکیے پر سر رکھ کر خلا میں گھورتے ہوئے سوچا۔

(۲)

بارہ سال قبل یہاں پہلی مرتبہ آنے سے پہلے وہ یہ منظر کئی مرتبہ خواب میں دیکھ چکا تھا۔خواب میں پہلی دفعہ اس نے یہ منظر ان دنوں دیکھا تھا جب وہ یونیورسٹی میں طبعیات کا طالب علم تھا اور محبت جیسی مابعدالطبعیاتی چیز سے پہلی مرتبہ دوچار ہوا تھا۔یہ ایک مختصر اور مبہم سا خواب تھا،اس نے دیکھا کہ وہ ایک غار کی چھت پر لیٹا خلاؤں میں گھور رہا ہے لیکن کوئی بھی منظر واضح نہیں ہے۔جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اسے ایک معمول کا خواب سمجھا اور صبح تک بھول گیا۔کچھ عرصے بعد اس نے یہی خواب جزئیات کی معمولی تبدیلیوں کے ساتھ دوبارہ دیکھا تو اسے حیرت ہوئی اور وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔اس کی حیرت، پریشانی میں اس وقت تبدیل ہوئی جب وہ ایک تسلسل کے ساتھ یہی خواب معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ہر تیسرے چوتھے روز دیکھنے لگا۔اس نے اپنے خاندانی معالج کو اس پریشانی سے آگاہ کیا تو اس نے اسے دائیں کروٹ لیٹنے اور خواب میں دیکھے ہوئے مناظر کو بھول جانے کا مشورہ دیا۔

لیکن اس خواب کا وہ حصہ جس نے آگے چل کر نہ صرف اس کی اپنی بلکہ کئی اور لوگوں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہونا تھا، دائیں کروٹ لیٹنے سے ٹلنے والا نہیں تھا۔مگر یہ خواب ایسا نہیں تھا جسے کہیں بھی اور کسی بھی وقت دیکھا جا سکے۔اس کے لیے اس کا نور آباد آنا ناگزیر تھا۔

یونیورسٹی میں جس روز وہ موسمِ سرما کی تعطیلات کسی برفانی علاقے میں تنہا گزارنے کا ارادہ باندھ رہا تھا اور پھر جس لمحے اس نے اپنے آبائی گاؤں نور آباد جانے کا فیصلہ کیا، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ گرم کپڑوں اور کتابوں سے بھرا بیگ ڈگی میں رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا، اپنی زندگی کے اس اہم ترین خواب سے اتنا ہی بے خبر تھا جتنی اس کی گاڑی کے پچھلے ٹائر سے چمٹی ہوئی وہ چیونٹی جو اگلے ہی لمحے اپنی موت سے ہم کنار ہونے والی تھی۔

راستے بھر وہ اپنی آبائی حویلی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔وہ حویلی جو اس کے شاندار ماضی کی گواہ تھی، ماضی جو اس کے آباؤ اجداد کا حال تھا۔کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کی تمام تر ترقی کا سہرا اسی حویلی کے سر ہے اور حقیقتِ حال بھی یہی ہے۔آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے دریائے ہرو سے نور آباد تک

ایک دشوار گزار سڑک محض گلیات سے دیودار کی لکڑی اور خان پور سے قیمتی پتھر لانے کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔ ایک ایسے دور میں جب لوگ ڈھاروں اور کچے مکانوں میں رہتے تھے، کوئی تصور بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں سے میلوں دور واقع گلیات کے بلند و بالا پہاڑوں سے دیودار کی لکڑی یہاں لائی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عجوبہء روزگار حویلی کو، جس کی تعمیر کے قصے علاقے کی لوک روایات کا حصہ بن چکے ہیں، آج بھی لوگ رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ زمان اسی حویلی کے ایک کمرے میں پیدا ہوا تھا اور اس کے بچپن کے دن اسی حویلی میں گزرے تھے۔ شہر میں جدید طرز کی بود و باش رکھنے کے باوجود اُس کے ذہن میں اِس قدیم طرز کی حویلی سے جڑی یادیں ہمیشہ تازہ رہیں۔ اُس نے اپنی شعوری زندگی کا ایک انتہائی مختصر حصہ یہاں گزارا تھا لیکن وہ جب بھی یہاں آتا، اُسے محسوس ہوتا جیسے وہ یہاں ایک طویل عرصے تک قیام پذیر رہا ہو۔ اُسے اپنے بچپن کا عرصہ، اپنے لڑکپن، نوجوانی اور جوانی کے عرصے کے مقابلے میں آج بھی طویل لگتا ہے۔ ایک عرصے تک وہ اس کا سبب حویلی سے جڑی اپنی حسین یادوں کو سمجھتا رہا۔ بعد میں جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی کچھ حیاتیاتی وجوہات ہیں تو اسے ایک دھچکا سا ضرور لگا لیکن حویلی سے اس کے ماورائی لگاؤ میں کبھی کمی واقع نہیں ہوئی۔

علاقے بھر میں مرکزی حیثیت کا حامل ہونے کی وجہ سے نور آباد کو کئی پختہ سڑکوں کے ذریعے دارالخلافے سے ملایا گیا تھا۔ براستہ بیر سوہاوہ جانے والی سڑک نہ صرف فاصلے کے لحاظ سے، بلکہ ٹریفک کے کم بہاؤ کی وجہ سے بھی سب سے زیادہ موزوں تھی لیکن وہ اس راستے کو شاذ ہی اختیار کرتا۔ وہ وہاں جانے کے لیے عموماً ہری پور شہر سے ہو کر آنے والا راستہ اختیار کرتا تاکہ باڈی کے نزدیک دریائے ہرو پر بنے پُل پر سے دریا کا نظارہ کر سکے۔ یہ پُل بھی دریائے اٹک پر بنائے گئے پُل کی طرح عین اس جگہ پر بنایا گیا ہے جہاں گلیات اور ستوڑہ سے آنے والا دریائے ہرو، مری اور لورہ کی طرف سے آنے والے دریائے ہرو سے آ کر ملتا ہے۔ وہ اپنی گاڑی پُل کے عین وسط میں، کراسنگ کے لیے بنائے گئے اضافی چھجے پر کھڑی کر کے گاڑی سے اترتا اور پُل کی گرل پر ہاتھ ٹیک کر دونوں دریاؤں کے درمیان واقع کوہِ پیسر پر اپنی نظر جما لیتا، جو کچھ ہی دیر میں اسے ایک دیو قامت بحری جہاز کی طرح آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا محسوس ہوتا۔ پھر وہ اپنی نظریں دونوں دریاؤں کے سنگم سے آہستہ آہستہ پُل کی جانب لاتا اور اپنے قدموں کے بالکل نیچے، تیزی سے بہتے ہوئے پانی پر گاڑ لیتا۔ کچھ ہی دیر میں وہ خود کو ہواؤں میں تیرتا ہوا محسوس کرتا۔ ایسے میں چٹانوں اور پُل کے پایوں سے ٹکراتی اور بل کھاتی لہروں کا شور پہلے اسے ایک خاص ردھم میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا اور پھر آہستہ آہستہ لفظوں کا روپ دھار لیتا:

"میں ہرو ہوں

ہزاروں برس سے یونہی اپنی رو میں بہے جا رہا ہوں

مری اور گلیات کی چھاتیوں سے نکلتی ہوئی دودھیا آبشاریں

مرے ظرف کو آزماتی رہی ہیں

مگر میں نے اپنے کنارے پہاڑ ایستادہ رکھے

تا کہ چاہوں بھی تو اپنے آپے سے باہر نہ ہو پاؤں میں

قسم ہے زمانے کی

میں نے کسی بھی زمانے میں اپنے کنارے پہ آباد گاؤں اجاڑے نہیں

سو مرے پانیوں میں لہو کا نہیں

سیب و شہتوت و زیتون و انجیر کا ذائقہ ہے

مرے ساحلوں پر دیودار اور چیڑ کی خوشبوئیں تیرتی ہیں

میں گنگا نہ جمنا نہ نیل و فرات ۔۔۔

ایک گم نام دریا ہرو ہوں ہرو

مقدس صحیفے مرے تذکرے سے تہی ہیں

کہ میں نے کسی بھی زمانے میں انسانی جانوں کا نذرانہ مانگا نہیں

داستانوں میں میرا حوالہ نہیں

کہ میں نے کسی سوہنی کو ڈبویا نہیں

اور تاریخ کی سب کتابیں مرے باب میں چپ

کہ میری روانی میں پن چکیوں کی حسیں گونج ہے العطش العطش کی صدائیں نہیں

تشنگی پیتے ہونٹوں کی آہیں نہیں۔"

شام ڈھلے جب اُس نے حویلی کے پچھواڑے واقع قبرستان کے قریب گاڑی کھڑی کی تو اس نے ہمیشہ کی طرح کچھ لوگوں کو اپنا منتظر پایا۔ یہ لوگ اسے ہمیشہ چھوٹے سردار جی کہہ کر پکارتے اور اس کی تعظیم بجالاتے تھے۔ جب وہ حویلی میں داخل ہوا تو حویلی میں صفائی ستھرائی کا کام مکمل ہو چکا تھا اور اس کے کمرے میں آتش دان شعلے اگل رہا تھا۔ وہ کچھ دیر آتش دان کے پاس بیٹھا آگ تاپتا رہا اور پھر نہانے اور کپڑے بدلنے غسل خانے چلا گیا جہاں نیم گرم پانی اس کے جسم سے مس ہونے کے لیے

بے تاب تھا۔ جوں ہی کپڑے بدل کر وہ غسل خانے سے نکلا، ایک ادھیڑ عمر شخص لیدر کے بوٹوں کا جوڑا، ایک گرم اوورکوٹ اور مفلر ہاتھ میں تھامے اس کا منتظر تھا جیسے وہ اس کے ارادوں تک سے باخبر ہو۔ اس نے جوتے اس کے سامنے رکھے، اسے اوورکوٹ پہننے میں مدد دی اور مفلر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے مفلر اپنی گردن کے گرد لپیٹا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ سورج غروب ہونے تک وہ برف کی سفید چادر پر اپنے نقشِ پا کاڑھتا رہا۔ ادھیڑ عمر شخص اس کے پیچھے پیچھے تھا لیکن وہ اتنی احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا کہ جیسے اسے خدشہ ہو کہ اگر اس کا کوئی قدم چھوٹے سردار جی کے نقشِ پا پر پڑ گیا تو گناہِ کبیرہ سرزد ہو جائے گا۔ وہ چھوٹے سردار جی کا احترام کسی خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ کسی ایسے لاشعوری جذبے کے تحت کرتا تھا جس کے بغیر اسے اپنی ذات ادھوری محسوس ہوتی۔ شروع شروع میں چھوٹے سردار جی نے اسے ایسا کرنے سے منع بھی کیا لیکن اس کا کہنا تھا کہ اسے ایسا کر کے دلی سکون ملتا ہے۔ صرف اسی پر موقوف نہیں ساری بستی والے اس کے خاندان کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کر کے وہ ان احسانات کا بدلہ چکا رہے ہیں جو، ان کے آباواجداد نے ان پر کیے تھے۔

رات کے کھانے کے فوراً بعد اس نے سب لوگوں سے درخواست کی کہ اب وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔ انھوں نے اس کی درخواست کو حکم جانا اور اپنی گرم چادریں اپنے جسموں کے گرد لپیٹنے لگے۔ ان کے جاتے ہی وہ اٹھ کر کونے میں رکھے میز کی طرف بڑھا جس پر ادھیڑ عمر شخص نے اس کی کتابیں بیگ سے نکال کر سلیقے سے سجا رکھی تھی۔ اس نے ایک کتاب نکالی اور کچھ دیر اس کی ورق گردانی کرتا رہا، لیکن تھکاوٹ کی وجہ سے مطالعے میں اس کا جی نہیں لگا۔ اس نے اٹھ کر بتی بجھائی تو کھڑکی کے شیشے سے پھوٹتی روشنی سے اسے اندازہ ہوا کہ بادل چھٹ چکے ہیں اور چاند نے برف پر اپنی کرنیں بکھیرنا شروع کر دی ہیں۔ اس کے دل میں حویلی کی چھت پر جا کر اس نظارے سے لطف اندوز ہونے کی شدید خواہش پیدا ہوئی لیکن تھکاوٹ اور سردی کی وجہ سے وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا اور لیٹے لیٹے اپنے تخیل کے ذریعے اسے پورا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ نیند کی وادی میں تھا، جہاں ایک جادوئی منظر اس کا منتظر تھا۔

اس نے دیکھا کہ چودھویں چاند کی رات میں وہ بستی کے عقبی پہاڑ پر واقع ایک غار کے پتھریلے چبوترے پر لیٹا ہوا خلا میں گھور رہا ہے۔ چبوترے پر ایک ہتھیلی کندہ ہے جو حیرت انگیز طور پر اس کی بائیں ہتھیلی سے مماثل ہے۔ آسمان بالکل صاف شفاف ہے، اتنا شفاف کہ اس پر ٹھہرے ہوئے سمندر کا گمان ہوتا ہے۔ زمین پر ہر طرف برف کی دبیز چادر بچھی ہوئی ہے۔ پوری آب و تاب سے چمکتا

چودھویں کا چانداس کے اتنا نزدیک ہے کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا ہے۔ پہلے تو وہ تذبذب کا شکار ہوتا ہے پھر ہاتھ بڑھا کر چاند کو چھوتا ہے، چاند سے اس کا ہاتھ مس ہوتے ہی شفاف آسمان سے برف روئی کے گالوں کی طرح اُڑنے لگتی ہے۔اس عجیب وغریب منظر کو دیکھ کر وہ گھبرا جاتا ہے اوراس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

اس خواب کا اثر اس کے دماغ پر اتنا گہرا تھا کہ جاگنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک خواب اور حقیقت کے درمیان جھولتا رہا۔ یہ ایک واہمے کی سی کیفیت تھی ۔ اسے لگا جیسے وہ تھوڑی دیر پہلے پہاڑ پر کھڑا چاند کو واقعی چھو رہا تھا اور ابھی ابھی وہاں سے اتر کر حویلی میں آیا ہے ۔ اسے خود کو یہ سمجھانے میں خاصا وقت لگا کہ یہ سب محض ایک خواب تھا۔ جب وہ اس کیفیت سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ کمرہ اب پہلے سے کہیں زیادہ روشن ہو چکا ہے ۔چاند کے مغرب کی طرف ڈھل جانے کی وجہ سے اس کی کرنیں مشرقی سمت واقع برف سے ڈھکی چھوٹی پہاڑی سے منعکس ہو کر حویلی کے سفید درو بام کو یوں جگمگا رہی تھی کہ ان پر ایک جادوئی سا ہالہ بن رہا تھا ۔وہ چاند کے مکمل طور پر ڈھلنے تک کھڑکی کے اس پار برف سے ڈھکی پہاڑی پر نظریں جمائے اس عجیب وغریب خواب کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح کے نورانی سائے سرسرانے لگے۔

دن چڑھے جب وہ مخصوص برفانی لباس پہن کر برف پر چہل قدمی کی تیاری کر رہا تھا،اس نے دیکھا کہ اس کا رضا کار ملازم حسبِ معمول حویلی کے گیٹ پر اس کا منتظر ہے ۔

''گل زیب چچا! اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں آج اکیلے گھومنا چاہتا ہوں۔''اس نے ادھیڑ عمر شخص کے پاس لمحہ بھر کے لیے رکتے ہوئے کہا اوراس کا جواب سنے اوراس کی آنکھوں میں مایوسی کی ابھرتی ہوئی لہر دیکھے بغیر دہلیز پار کر گیا۔

جوں ہی اس نے بستی کے عقب میں واقع پہلا ٹیلا عبور کیا وہ اس میدان میں داخل ہو گیا جہاں بچپن میں وہ اپنے والد کے ساتھ اس عوامی میلے میں آیا کرتا تھا جس کا افتتاح کرنے وہ ہر سال اب بھی باقاعدگی سے نور آباد آتے ہیں ۔وہ کافی دیر میدان کے سرے پر کھڑا اپنے بچپن کی یادوں میں کھویا رہا۔ان یادوں میں سب سے واضح یاد وہ تھی جس میں وہ میدان کے کنارے ایستادہ چٹان پر کھڑا ہو کر پہلی مرتبہ گھوڑے پر سوار ہوا تھا لیکن پاؤں زین تک نہ پہنچنے کی وجہ سے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا تھا اور گھوڑے سے گر کر زخمی ہو گیا تھا۔اپنے گرنے کے منظر کو یاد کرتے ہوئے اس نے ایک نظر چٹان کی طرف دیکھا جس پر سے برف پگھل چکی تھی ۔وہ چٹان کی طرف بڑھا اور پھسلن کے باوجود کسی نہ کسی

طرح اس پر چڑھ بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا اس کا رخ پہاڑ کی طرف اور نظریں وادی میں موجود اس طلسمی غار پر مرکوز تھیں جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ پریوں کا مسکن ہے ۔

وہ کب چٹان سے اترا اور کیسے دشوار گزار راستہ طے کرتا ہوا غار تک پہنچا تھا؟ باوجود کوشش کے آج تک اسے یاد نہ آسکا۔ اسے بس اتنا یاد رہا کہ وہ پیالہ نما گڑھے کے قریب سے گزرتے ہوئے لحہ بھر کو بائیں چٹان کی طرف مڑنے والے راستے پر مڑا تھا اور پھر واپس اس عمودی راستے پر ہولیا تھا جو غار کی طرف جاتا ہے ۔ پون میل کے لگ بھگ کا وہ فاصلہ جو اس نے طے کیا تھا اور وہ وقت جو اس میں صرف ہوا تھا اس کی یادداشت سے ہمیشہ محو رہا۔ جیسے زندگی کا وہ مختصر مگر اہم ترین دورانیہ، جس نے اس کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا، اس نے کسی اور زمان و مکاں میں بسر کیا ہو۔

(۴)

وہ خواب اور حقیقت کے درمیان معلق، زمان و مکاں سے باہر بسر کیے ہوئے اپنی زندگی کے اس دورانیے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ نیچے وادی میں بڑی چٹانوں کے درمیان کوئی گیدڑ چلایا۔ جس کا جواب، سامنے والی چھوٹی پہاڑی کو، اس بڑے پہاڑ سے جدا کرنے والے برساتی نالے کے پار کھڑے، ایک اور گیدڑ نے بھرپور طریقے سے دیا اور پھر بستی سے بیک وقت کئی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔

اس نے اپنی کلائی میں بندھی گھڑی پر وقت دیکھا ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔

''وقت اور خلا ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہم اس وقت تک خلا میں نہیں دیکھ سکتے جب تک پیچھے مڑ کر وقت میں نہ دیکھیں''۔ اس نے خلا میں گھورتے ہوئے سوچا۔

پھر اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیوں کو ہلکا سا جنوب کی سمت گھمایا اور دبِ اکبر (Big Dipper) کو تلاش کرنے لگا۔ جس کے بارے میں اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ اس کی عمر صرف دس لاکھ سال ہے اور اس دوران میں کئی شکلیں بدل چکا ہے۔

''ہمارے آباؤ اجداد نے یہاں ایک بالکل مختلف منظر دیکھا ہوگا۔'' اس نے بگ ڈپر پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے خود کلامی کی۔

''یقیناً ہماری آنے والی نسلیں بھی یہاں مختلف منظر دیکھیں گی''۔

''لیکن کب؟'' اس نے سوال اٹھایا۔

''شاید دس لاکھ سال بعد''۔ اس نے مبہم سا جواب ڈھونڈا۔

بگ ڈپر کو بغور دیکھتے ہوئے اسے لگا جیسے وہ خود کہیں خلا میں معلق ہے اور نیچے گہرے نیل گوں سمندر کا مشاہدہ کر رہا ہے، جس میں چھوٹے بڑے بے شمار موتی جھلملا رہے ہیں۔ جن میں سے کچھ زیادہ چمک دار ہیں اور کچھ کم۔ سمندر کی گہرائی میں بہت دور موتیوں کا ایک جمگھٹا سا ہے، جو اگرچہ دھندلا ہے لیکن حرکت کرتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ جمگھٹے کے اردگرد جھاگ کے بادل سے منڈلا رہے ہیں

جوا ڑتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ کافی دیر تک انھیں بغیر پلک جھپکے دیکھنے کے بعد جب اس نے پلک جھپکی اور دوبارہ بغور دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہاں کے منظر میں کوئی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ بادلوں کی باریک تہہ کے نیچے موتیوں کا جو جمگھٹا اسے ابھی صاف دکھائی دے رہا تھا لہریں اسے بہا کر کہیں دور لے جا چکی تھیں۔ یہ دیکھ کر اسے ایک دھچکا سا لگا اور مارے خوف کے اس کی نظریں بحرِ کائنات کا ساحل تلاش کرنے لگیں۔ ساحل کی تلاش میں وہ دوبارہ زمین پر آ رہا۔ جہاں ہر طرف برف تھی اور چاند کی چاندنی۔ جس میں وہ اپنی ہتھیلی کی لکیریں بھی دیکھ سکتا تھا۔

اس واقعے سے اس کا ذہن فوری طور پر Adromeda کی طرف گیا۔ جسے یونانی دیو مالا کے مطابق Perceus نے سمندری بلا سے بچایا تھا۔ Adromeda کے جھرمٹ پر کچھ دیر نظریں جمائے رکھنے کے بعد اس نے اپنی نظر الدبران Aldebaran پر جا ٹکائی۔ رات میں وہ جب بھی یہاں آتا اس پر ایک نظر ضرور ڈالتا؛ اس وجہ سے نہیں کہ وہ روشن ترین ستاروں میں سے ایک ہے بل کہ اس سے وابستہ ان دیو مالائی قصوں کی وجہ سے، جو اسے بہت لبھاتے تھے۔ الدبران پر نظر جماتے ہوئے اسے وہ ہندو دیو مالا ضرور یاد آتی جس کے مطابق روہنی (الدبران) دَکش کی ان ستائیس بیٹیوں میں سب سے خوبصورت تھی جنھیں اس نے چندر دیوتا سے اس شرط پر بیاہا تھا کہ وہ ان میں سے کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ لیکن چندر دیوتا اپنی دوسری ساری بیویوں کو نظر انداز کر کے ہر وقت روہنی پر فریفتہ ہوتا رہتا تھا۔ روہنی کے باپ (دَکش) کو جب اس کا علم ہوا تو وہ غصے سے بپھر گیا اور اس نے چندر دیوتا کو سزا کے طور پر تپ دق کا مریض بنا دیا۔ بعد میں دوسرے دیوتاؤں کی مداخلت سے اس سزا میں تخفیف کر دی گئی یوں اب چندر دیوتا صرف پندرہ دن تپ دق میں مبتلا رہتا ہے۔ مہینے کے باقی دن اسے دوبارہ صحت یاب ہونے کی مہلت دی جاتی ہے۔

''کل چاند کی پندرھویں ہے۔ تپ دق کا پہلا دن۔'' اس نے الدبران سے نظریں ہٹا کر چاند پر ٹکاتے ہوئے سوچا۔ لحظہ بھر کے لیے اسے لگا جیسے چاند واقعی تپ دق کا دائمی مریض ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے چاند سے نظریں ہٹا کر دوبارہ الدبران پر مرکوز کر لیں، جو اس کے نصابی علم کے مطابق زمین سے پینسٹھ نوری سال کے فاصلے پر تھا۔

''یہ کرنیں 1940ء میں وہاں سے روانہ ہوئیں تھیں۔ جب ساری دنیا کو دوسری جنگ عظیم کی آگ میں جھونکا جا چکا تھا''۔ اس نے الدبران پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پورے وثوق سے سوچا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ناگاساکی اور ہیروشیما سے بلند ہونے والے شعلوں کی روشنیاں پانچ

سال بعد الدبران پر پہنچیں گی۔" اس نے حساب لگایا۔

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ انھی دنوں جب ہیروشیما اور ناگاساکی تباہ ہو رہے تھے۔ الدبران ایک دھماکے سے پھٹ گیا ہو اور اس کا مادہ خلا میں بکھر گیا ہو!"

"اگر ایسا ہو چکا تو مجھے اس کا نظارہ کرنے کے لیے 2010ء میں جانا ہوگا۔" اس نے خیالوں ہی خیالوں میں بات آگے بڑھائی۔

"ہم وقت میں صرف پیچھے ہی کیوں دیکھ سکتے ہیں؟ آگے کیوں نہیں؟"

"اگر میں 65 سال پہلے کا منظر دیکھ سکتا ہوں تو پانچ سال بعد کا کیوں نہیں؟ کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ میں ساٹھ سال پہلے ہونے والی الدبران کی مفروضہ تباہی کا نظارہ ابھی اور اسی وقت کر سکوں؟ صرف پانچ سال ہی کا فاصلہ تو ہے۔"

"کیا کائنات میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں دیکھنے والا ماضی کے ساتھ ساتھ مستقبل میں بھی جھانک سکے؟۔

"کیا میں کسی ایسے ستارے کو بھی دیکھ سکتا ہوں جو ہزار سال بعد وجود میں آئے گا؟ نہیں! تو کیوں؟"

"اگر میں اربوں سال پہلے بننے والے ستاروں کو اس طرح آسانی سے دیکھ سکتا ہوں جیسے وہ ہزاروں سال پہلے تھے تو ایسا کیوں ممکن نہیں؟۔" وہ جیسے جیسے سوچتا مزید الجھتا جاتا۔

"دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ روشنی کی ماہیت اور سب سے بڑا اسرار اس کی رفتار ہے"۔ وہ اپنی نگاہیں الدبران پر سے ہٹا کر چاند پر مرکوز کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

"یقیناً اسی رفتار کے اسرار میں خلا اور وقت کے دروازے کی چابی ہے"۔

"۔۔۔اور اس چابی تک رسائی روشنی کی رفتار میں ضم ہو کر ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔" اس نے اپنی سوچ کا تسلسل برقرار رکھتے ہوئے خود کلامی کی۔

"اگر میں کسی کرن کی رتھ پر سوار ہو جاؤں تو۔۔۔۔۔!!!! اس نے فرض کرتے ہوئے سوچا۔

"۔۔۔تو میں ساری عمر ایک لمحے میں گزار سکتا ہوں۔ جیسے بگ بینگ سے پھوٹنے والا ایک فوٹان؛ جس کی عمر اب بھی اتنی ہے جتنی بگ بینگ کے وقت تھی۔"

"پونے چودہ ارب سال کو محیط ایک لمحہ۔" اس نے سوچا؛ اور پھر اپنے اس خیال پر زور زور سے ہنسنے لگا۔

فضا میں اس کا قہقہہ بلند ہوتے ہی اس کے عقب کی جھاڑیوں سے ایک خرگوش نکل کر، اس کی

دائیں جانب سے، غار کے دہانے کی طرف لپکا اور آگے بلندی دیکھ کر برف کے نرم گالوں پر اپنے پنجوں کے نشان چھوڑتے ہوئے، بائیں طرف کی جھاڑیوں میں گم ہو گیا۔

''کل دن کا سورج ان نشانوں کی موت بن کر طلوع ہوگا، سورج جو زندگی کی علامت ہے۔''

اس نے پنجوں کے نشانوں کو بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔

''ہم قوانینِ فطرت میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ ہم انھیں توڑ نہیں سکتے''۔

''لیکن اگر ہم انھیں توڑ سکیں تو کیا ہمیں اس کی کوئی قیمت ادا کرنی پڑے گی؟''

یہ سوچتے ہوئے، اس کا دھیان فوری طور پر اپنے ساتھ پیش آنے والے ایک واقعے کی طرف گیا، جب اسلام آباد میں گاڑی چلاتے ہوئے، اس نے سرخ اشارہ کراس کر لیا تھا اور سارجنٹ نے مک مکا نہ کرنے پر، اس کے ہاتھ میں سو روپے کا چالان تھما دیا تھا۔ وہ آج تک نہیں سمجھ پایا تھا کہ اسے یہ جرمانہ قانون توڑنے کی وجہ سے ادا کرنا پڑا تھا، یا مک مکا نہ کرنے پر۔ حالاں کہ اس کے نقطۂ نظر سے اس کے پاس سرخ اشارہ کراس کرنے کی کئی معقول وجوہات تھیں:

پہلی اور سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ ماہ نور کے یونیورسٹی سے نکلنے کا وقت بہت قریب تھا اور اسے ہر حال میں، وہاں وقت سے پہلے پہنچنا تھا۔ اگر وہ اشارے پر رک جاتا تو کم از کم چار منٹ ضائع ہو جاتے اور وہ وقت پر، یونیورسٹی کے باہر، بائیں طرف والے، اس کھوکھے تک نہیں پہنچ سکتا تھا، جس کے پیچھے کھڑے ہو کر، وہ ماہ نور کی گاڑی کو یونیورسٹی کے گیٹ سے آہستہ آہستہ باہر نکلتے ہوئے ہر روز دیکھتا تھا، جس کی فرنٹ سیٹ پر وہ اپنے منگیتر نوید کے ساتھ براجمان ہوتی۔ یونیورسٹی سے نکل کر گاڑی اس کی سمت مڑتی اور سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو جاتی لیکن پیچھے سڑک پر دیر تک اس کا نورانی ہالہ، فضا میں لہریے لیتا رہتا۔

بالآخر ہوا بھی وہی، جس کا اسے خدشہ تھا۔ سارجنٹ نے اس کی خواہش کے برعکس چالان کاٹنے میں خاصی دیر لگا دی تھی۔

اس کے علاوہ ایک اور اہم وجہ بھی تھی۔ جب وہ اشارے سے ابھی ڈیڑھ سو گز دور تھا اور اس کی نظر سبز بتی پر مرکوز تھی، اس کے دماغ میں ایک عجیب سا خیال ابھرا۔ اس نے سوچا؛ زرد اور سرخ تو ٹھیک۔ لیکن سبز کیوں؟ سبز کی جگہ تو نیلی بتی ہونی چاہیے۔ کیوں کہ کائنات میں جب کوئی نیا ستارہ ابھرتا ہے، تو نوجوانی تک اس کا رنگ نیلا رہتا ہے۔ پھر جب وہ اپنی درمیانی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کا رنگ زرد ہونا شروع ہو جاتا ہے جو اس کی ادھیڑ عمری تک برقرار رہتا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں جب وہ ستارہ

قریب المرگ ہوتا ہے تو سرخ ہو جاتا ہے ۔ جب اشارے کی سبز بتی بجھی اور زرد روشن ہوئی تو وہ صرف 50 گز کے فاصلے پر تھا۔اس کے دل میں ٹریفک کے قوانین کو طبیعیات کے قوانین سے ہم آہنگ کرنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی ۔اسی اثنا میں سرخ بتی روشن ہو چکی تھی اسے دھچکا سا لگا کہ زرد بتی کا دورانیہ اتنا کم کیوں؟ ستارے تو اپنی عمر کا بیش تر حصہ زرد رنگت میں گزارتے ہیں ۔وہ اسی سوچ میں غلطاں سرخ اشارہ کراس کر گیا۔

چالان لے کر جب وہ گاڑی کے اسٹیرنگ پر بیٹھا تو خاصا مایوس تھا ۔اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کے وہاں پہنچنے تک ماہ نور کی گاڑی یونیورسٹی کے گیٹ سے نکل کر سڑکوں پر فراٹے بھر رہی ہو گی اور اس کا نورانی ہالہ بھی فضا میں تحلیل ہو چکا ہو گا۔

''ماہ نور''۔اس نے برف پر ثبت خرگوش کے پنجوں کے نشانوں پر نظر جماتے ہوئے، سرد آہ بھری جو اسے ایک مرتبہ پھر دور ماضی میں لے گئی۔ جب بارہ سال آٹھ ماہ اور بیس دن قبل اپریل کی ایک دوپہر، وہ یونیورسٹی کے سرسبز و شاداب لان میں تازہ کٹی ہوئی گھاس پر ٹہلتے ہوئے طبیعیات کے کسی پیچیدہ مسئلے میں الجھا ہوا تھا کہ اسے سبزے کے درمیان پیچ و خم دار روش کی طرف سے انسانی جسم کی عجیب و غریب خوشبو کا جھونکا موصول ہوا، جس میں پرفیوم کی خوشبو کے علاوہ، تازہ کٹی ہوئی گھاس کی مہک بھی شامل تھی ۔خوشبو اتنی تیز اور پر کیف تھی کہ وہ متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔اس نے خوشبو کے منبع کی طرف پلکیں اٹھائیں، پلکیں جن کے جھپکنے کا دورانیہ ویسے بھی معمول سے دوگنا تھا سرے سے جھپکنا ہی بھول گئیں تھیں ۔خوشبو کے منبع کا قد پانچ فٹ سے کچھ انچ اوپر اور جسم دبلا پتلا تھا ۔دبلے پن نے سینے کی گولائیوں کو کچھ اس طور نمایاں کر رکھا تھا کہ دیکھنے والے کی نظر وہیں اٹک جاتی ۔اس سے پہلے کہ اس کی نظر سینے کی گولائیوں کو سر کر کے چہرے تک پہنچتی، وہ اس کے بہت قریب آ چکی تھی ۔اتنی قریب کہ وہ نہ صرف اس کی گہری نیلی آنکھوں میں اتر سکتا تھا بلکہ بائیں نتھنے کے نیچے اور اوپر والے ہونٹ کے درمیان، جو نسبتاً ابھرا ہوا تھا، وہ سیاہ لمبوترا تل بھی دیکھ سکتا تھا، جس کا مفہوم بہت دنوں بعد اس پر کھلنے والا تھا۔وہ کسی کے دیکھے جانے سے بے خبر اپنے آپ میں مست اس کی سمت چلی آ رہی تھی ۔اس سے پہلے کہ وہ اپنی پتلیوں کو ہلکا سا گھما کر اس کی طرف دیکھتی زمان کو الہام سا ہوا کہ اس کا سارا حسن اس کی بے خبری میں مستور ہے اور یہ کہ اگر اس نے دیکھ لیا کہ اسے کوئی دیکھ رہا ہے تو اس کا سارا حسن زائل ہو جائے گا، اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنی نظریں اس کے چہرے سے فوراً ہٹا لیں اور وہ اس کے دیکھے جانے سے بے خبر، اپنے آپ میں مست، فضا کو معطر کرتی ہوئی آگے نکل گئی اور زمان نے اپنی ساری توجہ

بے خودی کے سے عالم میں اٹھتے ہوئے اس کے قدموں پر مرکوز کر لی۔اس کے دماغ نے، جو کچھ دیر پہلے طبیعیات کے کسی پیچیدہ مسئلے میں الجھا ہوا تھا، اس کی سبک رفتاری سے نتیجہ نکالا تھا کہ اس کے قدم کشش ثقل سے آزاد ہیں اور اگر وہ چاہے تو فضا میں بھی اسی آسانی سے چل پھر سکتی ہے۔

کئی دنوں بعد اس نے یہی الفاظ ماہ نور کے سامنے اپنی اس پہلی ملاقات میں سرگوشی کے سے انداز میں دوہرائے تھے، جو بظاہر تو اتفاقی تھی لیکن درحقیقت اس کے انتظام کی کوششیں اس کے ایک دوست نے اس کی درخواست پر، اسی دن شروع کر دیں تھیں، جب اس نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ جس لمحے اس کے دوست نے اسے یقین دلایا تھا کہ: ''تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں کل چھٹی کے وقت کیفے ٹیریا پر اس سے تمھاری ملاقات ہو جائے گی''، وقت کی رفتار اس کے لیے بتدریج دھیمی ہونا شروع ہو گئی تھی اور نصف رات کے قریب بالکل تھم سی گئی تھی۔نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔صبح ملاقات کے انتظار میں اس کی نظریں بار بار دیوار گیر گھڑی کی طرف اُٹھتیں جہاں سیکنڈوں والی سوئی اسے منٹوں اور منٹوں والی گھنٹوں کی رفتار سے چلتی ہوئی محسوس ہوتی۔اس نے وقت کے اضافی ہونے کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا لیکن اس کا عملی تجربہ اسے، اس رات، زندگی میں پہلی بار ہوا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ آئن سٹائن وقت کے اضافی ہونے کے نظریے تک اپنے عظیم دماغ کے ذریعے نہیں دلِ گداز کے رستے پہنچا ہو گا۔

''جب تم قدم اُٹھاتی ہو تو تمھارے قدم کشش ثقل سے آزاد ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔'' ماہ نور کے رگ و پے میں سرایت کرتی اور اس کی قلبِ ماہیت کرتی ہوئی یہ سرگوشی، اگلے دن پوری یونیورسٹی میں گونجنے لگی تھی، جس پر اس کے قریبی دوستوں نے اس وقت تک یقین نہیں کیا تھا جب تک اس نے خود اس کی تصدیق نہیں کی تھی۔

''کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔'' اس کے ایک قریبی دوست نے برجستہ تبصرہ کیا تھا اور یہ تبصرہ کچھ بے جا بھی نہیں تھا۔

اس کا لمبا قد، مضبوط چوڑا جسم، کھلتا ہوا گندمی رنگ، گول چہرہ، چوڑا ماتھا، گہری کالی آنکھیں، پر وقار لہجہ اور منظم شخصیت کسی بھی لڑکی کو پگھلانے کے لیے کافی تھی۔سب سے پر کشش چیز اس کا پلکیں جھپکنے کا دورانیہ تھا جو معمول سے کہیں زیادہ تھا وہ جتنی دیر میں ایک بار پلک جھپکتا عام لوگ دو سے تین مرتبہ پلک جھپک چکے ہوتے۔اس کی آنکھوں میں جھانکنے والا کوئی بھی شخص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یونیورسٹی میں آتے ہی کئی لڑکیوں نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی، بعض نے تو

باقاعدہ ڈورے بھی ڈالے مگر اس نے سب سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ایک خاص طرح کا فاصلہ رکھا۔

''زیادہ قربت چیزوں کو دھندلا دیتی ہے۔ دیکھنے کے لیے فاصلہ ضروری ہے۔'' وہ کہا کرتا۔

لیکن اس کا یہ فلسفہ اس دن دھرے کا دھرا رہ گیا تھا جب اس نے پہلی مرتبہ ماہ نور کو دیکھا تھا۔

اگلے تین مہینوں میں ان کی محبت کے چرچے یونیورسٹی سے نکل کر گلی محلوں میں پھیل چکے تھے۔

(۴)

''کیا ماہ نور کی یاد کبھی میرے ذہن سے مٹ پائے گی؟''

اس نے برف پر ثبت خرگوش کے پنجوں کے نشانوں پر، آنے والے دن کے سورج کی کرنوں کی تمازت محسوس کرتے ہوئے سوچا۔اس نے چشم تصور سے دیکھا کہ برف پگھل رہی ہے اور اس پر موجود نشان آہستہ آہستہ دھندلے ہو رہے ہیں۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دل میں دکھ کی ایک سر دلہر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئے۔

''میں سات ارب انسانوں میں واحد انسان ہوں جس نے یہ نشان دیکھے۔باقی چھ ارب ننانوے کروڑ، ننانولے لاکھ، ننانوے ہزار، نوسوننانوے، اس منظر سے محروم رہے''۔

''میں کتنا خوش نصیب ہوں اور وہ کتنے بدنصیب؟''

ایسا سوچتے ہوئے اس کے اندر سرشاری کی ایک لہر ابھری، جو اگلے ہی لمحے مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گئی۔

''نہیں وہ تو خوش نصیب ہیں۔بدنصیب تو میں ہوں۔جس نے انھیں دیکھا اور ان کی ناپائیداری کا دکھ اٹھایا''۔

اس نے مایوسی سے سوچا۔

''کیا ان نشانوں کے وجود کی کوئی معنویت ہے؟اگر ہے تو کیا دوسروں کے لیے بھی یہ اتنی ہی معنویت کے حامل ہیں؟''اس نے فلسفیانہ انداز میں سوچا اور پھر خود کلامی کا سلسلہ چل نکلا۔

''یہ نشان؛ جو میرے لیے موجود ہیں۔کیا دوسروں کے لیے بھی موجود ہیں؟''

''اگر ہیں۔تو کیا وہ بھی ان کی معدومیت کا دکھ اٹھا رہے ہیں؟''

''کیا چیزیں اس لیے موجود ہیں؛ کہ وہ وجود رکھتی ہیں؟''

''یا اس لیے ہیں کہ ہمیں ان کی موجودگی کا احساس رہتا ہے''۔اس کا ذہن الجھنے لگا۔

''ممکن ہے ایسے ہی نشان نیچے وادی میں موجود، دو بڑی چٹانوں میں سے کسی ایک کے ابھار

پر، کوئی دوسرا خرگوش چھوڑ گیا ہو۔''

''کیا ان کی معدومیت کا دکھ بھی کوئی اٹھائے گا؟''

''کم از کم میں تو نہیں!''

''اٹھاؤں بھی تو کیسے؟ ابھی تو میں ان کے وجود ہی کے بارے میں تذبذب کا شکار ہوں۔''

''کیا خدا اس لیے موجود ہے کہ وہ ہے؟''

''یا اس لیے' ہے' کہ مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہے؟''

''اگر وہ اس لیے موجود ہے کہ وہ' ہے تو پھر بعض لوگ اس کے وجود کے منکر کیوں ہیں؟

''اس کا سیدھا سادا مطلب یہی ہے کہ خدا کا وجود صرف ان لوگوں کے لیے ہے، جنھیں اس کی ذات کا عرفان ہے۔ باقیوں کے لیے کوئی خدا نہیں۔''

''پھر، یہ خدا کے ہونے اور نہ ہونے کا جھگڑا کیوں؟''

''میں تو کبھی ماہ نور سے اس بات پر نہیں جھگڑوں گا کہ وہ ان نشانوں کے وجود کی منکر کیوں ہے؟''

''۔۔اور نہ ہی کبھی یہ اصرار کروں گا کہ وہ اس بات پر ایمان لائے کہ ایسے نشان موجود تھے۔ حالاں کہ میں انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور اس وقت؛ ان کے وجود کے حوالے سے عین الیقین کے درجے پر ہوں؟''

''برف پر ثبت خرگوش کے پنجوں کے یہ نشان تو کل مٹیں گے مگر یہ ستارے جو ابھی نظر آ رہے ہیں ان میں سے بے شمار صدیوں پہلے مٹ چکے ہیں۔'' اس نے اپنی نظریں، پنجوں کے نشانوں سے ہٹا کر، خلا میں مرتکز کرتے ہوئے سوچا۔

یہ جو 'میں' کبھی کبھی 'دیکھتا' ہوں رات کو

رات کیا سمجھ سکے ان معاملات کو

محبوب خزاں کے شعر پر اصلاح دے کر اسے حسبِ معمول سرشاری ہوئی۔ وہ موقع محل کی مناسبت سے ہمیشہ شعر میں رد و بدل کر دیتا تھا۔ ایسا کر کے اسے شعر اپنا اپنا سا لگتا تھا۔

''میں ماضی میں بہت دور تک دیکھ سکتا ہوں: اتنا دور کہ یہ رات اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ویسے رات بھی عجیب سے ہے۔ نظر جھکاؤ تو لمحہ موجود میں، نظر اٹھاؤ تو دور ماضی بعید میں۔'' ایسا سوچتے ہوئے اس نے اک نظر خرگوش کے پنجوں کے نشانوں کو مکرر دیکھا اور پھر اپنی نظریں دوبارہ خلا میں وہیں

مرکوز کرلیں، جہاں گھنٹہ بھر پہلے اسے کسی تبدیلی کا شبہ ہوا تھا۔

''یہ کیا؟ وہ جھرمٹ کہاں ہے؟ جو میں نے ابھی کچھ دیر پہلے دیکھا تھا۔''

''یہیں تو تھا۔ان روشن ستاروں کے پیچھے۔اب کہاں گیا؟''

''میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے بائیں ہاتھ پر چٹکی کاٹی، ہلکی سی سسکاری بھری اور ٹہلنے لگا۔وہ خواب اور حقیقت کے درمیان تفریق، ہمیشہ چٹکی کاٹ کر کیا کرتا تھا۔چٹکی کاٹنے اور یہ یقین کر لینے کے بعد کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا، اس نے ایک مرتبہ پھر وہیں دیکھا۔اسے یہ دیکھ کر شدید دھچکا لگا کہ منظر واقعی بدل چکا ہے۔

''کیا واقعی منظر بدل گیا ہے یا مجھے ایسا لگ رہا ہے؟''اس نے ٹہلتے ہوئے سوچا۔

''اگر واقعی بدل گیا ہے تو، اس کا سبب کہیں میں تو نہیں؟''

ہر پل میں لاکھوں تصویریں ، ہر لحہ اک دنیا
کتنے منظر کھو دیتا ہے آنکھ جھپکنے والا

پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ بغیر کسی ترمیم کے کوئی شعر اسے اپنا اپنا سا لگا۔اسے لگا جیسے یہ شعر سات ارب انسانوں میں سے صرف اسی کے لیے کہا گیا ہے۔

''پلک صرف میں نے جھپکی تھی یا کسی اور نے بھی؟''اس خیال کے آتے ہی وہ ٹھٹھکا۔

''بگ ڈِپر کے منظر میں تبدیلی، صرف میرے لیے واقع ہوئی ہے یا سب کے لیے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ باقی ناظرین کے لیے منظر اب بھی وہی ہے، مبدل منظر صرف میری آنکھ دے پا رہی ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو کیا اس تبدیلی میں میری ذات یا سوچ کا کوئی عمل دخل ہے؟''

''میں نے جیسا دیکھا ویسا ہوا، یا جیسا ہوا، ویسا دیکھا؟''اس کا ذہن الجھنے لگا۔

''ہمارا ہر عمل ہمارے معروض پر اثر انداز ہوتا ہے۔''اسے عرفان احمد کا جملہ یاد آیا۔عرفان؛ ایک عجیب وغریب شخص۔پڑھے لکھے نوجوانوں میں وہ ''غاؤسہ'' کے عجیب وغریب نام سے مشہور تھا جب کہ بستی کے بوڑھے بزرگوں کی نظر وہ میں ایک پُراسرار آدمی تھا اور اس کی پراسرار گمشدگی اسے اور بھی پراسرار بنا گئی تھی۔وہ اچانک بستی میں وارد ہوا تھا۔لیکن کہاں سے؟ اس کے بارے میں مختلف روایات تھیں۔کسی کے بقول وہ انڈیا کا ایجنٹ ہے اور کسی خفیہ مشن پر ہے اور کوئی اسے ولی سمجھتا جو یہاں چلہ کاٹنے آیا ہے۔وہ دن میں اپنا بیشتر وقت بستی کے گرد ونواح میں واقع جنگل میں گزارتا اور رات مزار

کے احاطے یا چچا گل زیب کے کمرے میں۔اس کا لباس معمولی مگر صاف ستھرا ہوتا اوراس کے کندھے سے ہر وقت ایک چرمی تھیلا سا لٹکا رہتا، جس پر "غازۂ سہ فروس" کے الفاظ کسی ماہر خطاط سے یوں کندہ کرائے گئے تھے کہ ان مبہم اور نا قابلِ فہم الفاظ کی پراسراریت مجسم ہو کر رہ گئی تھی۔تھیلا ہر وقت پرانی کتابوں اور سگریٹ کے پیکٹوں سے بھرا رہتا۔وہ جہاں کہیں بیٹھتا تھیلے سے کوئی کتاب نکال کر مطالعے میں غرق ہو جاتا۔تقریباً اڑھائی سال قبل ایک رات وہ حسبِ معمول گل زیب چچا کے کمرے میں لیٹا اور صبح غائب تھا لیکن خلافِ معمول اس کا تھیلا وہیں چارپائی کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔اس دن کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آیا۔وہ بہت کم لوگوں پر کھلتا تھا مگر جب کھلتا تو سائنس، تاریخ، مذہب، فلسفہ، کیمیا گری، ادب اور نجوم جیسے متنوع علوم ایک ذات میں سمٹ آتے۔سننے والوں کو لگتا جیسے یہ سب علوم اپنی اصل میں ایک ہیں۔زمان ان چند خوش نصیبوں میں سے تھا جن پر وہ پہلی ہی ملاقات میں کھل گیا تھا۔

"ہر آدمی کا اپنا سچ ہے۔جسے پانے کے لیے وہ ان میں سے کسی ایک علم کا انتخاب کرتا ہے۔" عرفان نے سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے کہا تھا۔"لیکن فساد وہاں سے شروع ہوتا ہے جب ہر آدمی اپنے سچ کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کرتا ہے۔دیکھو میں، میں ہوں اور تم، تم۔ہم دونوں کا اپنا اپنا سچ ہے۔جب میری کیمسٹری تم سے مختلف ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میرا سچ تمھارا بھی سچ ہو؟ سچ ایک ہاتھی کے مانند ہے اور اس کے متلاشی اندھے۔جس کا ہاتھ اس ہاتھی کے جس حصے پر پڑتا ہے وہ اسی کو سچ سمجھ لیتا ہے، کوئی سمجھتا ہے کہ سچ ہاتھی کی اگلی ٹانگوں کی طرح ہے، کسی کے نزدیک اس کی پونچھ کی طرح اور کوئی اس کی سونڈ کو اپنا سچ سمجھ لیتا ہے۔حالاں کہ یہ سارے سچ مل کر کائناتی سچ تشکیل دیتے ہیں۔مجھے یہ حق تو ضرور ہے کہ میں اپنا سچ تم سے شیئر کروں، مگر مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنا سچ تم پر مسلط کروں۔ہوسکتا ہے میرے ہاتھ صرف ہاتھی کی سونڈ آئی ہو۔اس کی ٹانگوں کا ادراک تمھیں ہوا ہو۔میں یہاں اپنا سچ تلاشنے آیا ہوں۔" زمان کو عرفان سے اپنی پہلی ملاقات یاد آئی۔

شروع شروع میں عرفان کی یہ باتیں زمان کو بہت عجیب لگتیں۔مگر آہستہ آہستہ وہ اس کی باتوں کا قائل ہوتا چلا گیا۔وہ، مابعد الطبیعیات کے بارے میں بھی اپنا موقف، سائنسی انداز میں پورے دلائل کے ساتھ پیش کرتا تھا:

"تمام کی تمام نظری سائنس مابعد الطبیعیاتی ہے۔" عرفان نے دلائل دیتے ہوئے کہا تھا۔ "طبیعیات بھی ایک سطح پر جا کر مابعد الطبیعیات سے مل جاتی ہے۔بل کہ تم یوں سمجھ لو کہ طبیعیات نے مابعد الطبیعیات کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔بہت سی اہم مساواتیں ابتدا میں مابعد الطبیعیاتی تھیں۔یہاں تک

کہ آئن سٹائن کی الہامی مساوات E=mc2 بھی۔ ہاں۔ میں اسے الہامی ہی سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ میں تصور تک نہیں کرسکتا کہ اتنی بڑی آیت کائنات پیٹنٹ آفس کے ایک کلرک پر اتر سکتی ہے اور وہ بھی ایک جونیئر کلرک پر۔ تمھارا چہیتا اسٹیفن ہاکنگ، جسے تم ایک طبعیات دان سمجھ رہے ہو، بنیادی طور پر مابعدالطبعیات کا آدمی ہے، اس کی بلیک ہول تھیوری اس وقت تک طبعیات کا حصہ نہیں بن سکتی جب تک وہ عملی طور پر ثابت نہیں ہو جاتی۔ ہوسکتا ہے کل کلاں وہ جون پی پریسکل سے ہاری ہوئی شرط دوبارہ جیت لے اور مجھا یسے ان تمام لوگوں کی خوشیاں دوبارہ لوٹ آئیں، جو بلیک ہولز کو دوسری کائناتوں تک سفر کے لیے شارٹ کٹ کے طور پر استعمال کرنے کے خواہش مند ہیں۔''

''سائنس نے اب تک جو ترقی کی ہے وہ طبعیات میں کی۔ نفسیات کا شعبہ ابھی بہت پیچھے ہے۔ بہت سے لوگوں نے آئن سٹائن کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ لیکن فرائیڈ، ژونگ اور ایڈلر کا ابھی تک کوئی قابلِ ذکر جانشین پیدا نہیں ہوا۔ ہم کائنات کے بارے میں تو بہت کچھ جانتے ہیں، مگر اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ہم یہ تو بتا سکتے ہیں کہ آئندہ صدی میں پہلا سورج گرہن کس سَن کے کون سے دن، کتنے بجے ہوگا۔ مگر یہ نہیں جان سکتے کہ ہماری محبوبہ، جسے ہم پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ کرتے ہیں، ہمارے سامنے بیٹھی کیا سوچ رہی ہے۔''

آخری فقرہ سنتے ہوئے زمان کا دھیان فوری طور پر ماہ نور کی طرف گیا تھا اور اگلے ہی لمحے وہ اس کی تمام باتوں پر ایمان لے آیا تھا۔

ایک دن عرفان نے اسے 'ٹائی ٹن کی تباہی' کے عنوان سے چھپا ہوا ایک ناول پڑھنے کو دیا۔ جس پر مصنف کے طور پر مارگان رابرٹ سن کا نام درج تھا۔ ناول کا لبِ لباب یہ تھا کہ:

''اپریل کی ایک سرد رات۔ دنیا کا سب سے بڑا، سب سے شاندار اور محفوظ ترین بحری جہاز ٹائی ٹن بحرِ اوقیانوس میں رواں دواں ہے۔ ناول کے ایک کردار کا دعویٰ ہے کہ 'خود خدا بھی اس بحری جہاز کو نہیں ڈبو سکتا'۔ یہی وجہ ہے کہ ستر ہزار ٹن وزنی اس جہاز کے ساتھ صرف چوبیس حفاظتی کشتیاں ہیں۔ دورانِ سفر وہ ایک برفانی تودے سے ٹکراتا ہے اور پچیس سو لوگ ڈوب جاتے ہیں۔''

جوں ہی اس نے ناول ختم کیا وہ ایک مخمصے کا شکار ہو گیا۔ اسے اس بات کی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ مشہورِ زمانہ بحری جہاز ٹائی ٹینک کی تباہی کے حوالے سے لکھا گیا یہ ناول، عرفان نے اسے پڑھنے کے لیے کیوں دیا۔ اچانک اس کی نظر ناول کے پس ورق پر پڑی اور وہ اس راز کی تہہ تک پہنچ گیا۔

پس ورق پر درج تھا:

''یہ ناول 1898 میں لکھا گیا۔''

اس نے فوراً انٹرنیٹ سے ٹائی ٹینک کی تباہی کے حوالے سے معلومات ڈاؤن لوڈ کیں اور دونوں میں مماثلتیں تلاش کرنے لگا۔

''ناول میں ٹائی ٹن، حقیقت میں ٹائی ٹینک۔ دونوں اپریل کی ایک رات حادثے سے دوچار ہوتے ہیں۔ دونوں حادثے بحرِ اوقیانوس میں پیش آتے ہیں۔ دونوں مضبوط ترین اور محفوظ ترین جہاز تصور کیے جاتے ہیں۔ دونوں پر مسافروں اور عملے کے افراد کی ایک بڑی تعداد سوار ہے۔ دونوں ایک برفانی تودے سے ٹکرا کر غرق ہوتے ہیں۔ دونوں جہازوں کے مسافروں کی ہلاکتوں کا سبب حفاظتی کشتیوں کی کم تعداد ہے۔ ٹائی ٹن میں چوبیس ٹائی ٹینک میں بیس۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس نے حیرت سے سوچا تھا۔

''1912 میں حادثے کا شکار ہونے والے اور پندرہ سو تین افراد کی موت کا سبب بننے والے ٹائی ٹینک کی تباہی کا سکرپٹ مارگان رابرٹسن نے چودہ سال پہلے 1898 میں لکھ دیا تھا؟''

وہ اسی وقت بھاگا بھاگا عرفان کے پاس گیا تھا جو گل زیب چچا کے برآمدے میں لیٹا ایک پھٹی پرانی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا جس کی جلد ناپید تھی۔ عرفان نے اس کی طرف دیکھے بغیر، سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا تھا:

''ہاں۔ ہمارا ہر عمل ہمارے معروض پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کس حد تک اور کیسے؟ یہ بہت تفصیل طلب ہے۔ اس پر پھر کبھی بات ہوگی۔''

وہ حیران تھا کہ عرفان نے اس کا ذہن کیسے پڑھ لیا۔ ابھی تو وہ، اُس سے یہ سوال کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔

''تمھارا اگلا سبق یہ ناول ہے۔'' اس نے غاؤسہ فروس نامی پراسرار تھیلے سے ایک اور کتاب نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ جس کے سرورق پر 'چاند کا سفر' کے الفاظ درج تھے۔ ''میں اس کے بارے میں، تمھیں کسی تجسس میں نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ ناول 1865 میں لکھا گیا تھا۔ ٹھیک 104 سال بعد 1969 میں سب کچھ اس ناول کے مطابق ہوا۔ تم یہ ناول پڑھو۔ دونوں میں اتنی مماثلتیں ہیں کہ یقین نہیں کر پاؤ گے۔ مگر تمھیں یقین کرنا ہی پڑے گا۔'' اور پھر اسے یقین کرنا ہی پڑا تھا۔

اس نے اپنے ذہن سے عرفان کی باتوں اور یادوں کو باہر دھکیلا اور دوبارہ بگ ڈپر میں دیکھنے لگا۔ جہاں اس کی نظریں مبدل منظر سے دوچار ہوئیں۔ اب اس کے پاس یہ یقین کرنے کے سوا

کوئی چارہ نہیں تھا کہ منظر واقعی بدل چکا ہے۔

''میں جیسا سوچتا ہوں یقیناً ویسا ہی ہوتا ہے۔''اس نے سوچا۔

یک دم اس کے ذہن میں کسی انہونی کا خدشہ ابھرا۔اس نے اپنا کمبل اٹھا کر بائیں طرف والی جھاڑی پر پھینکا اور غار کے دہانے والے کونے میں کھڑے ہو کر چٹان کی لکیروں کا بغور مشاہدہ کرنے لگا۔پھر ایک ایک لکیر کو مختلف زاویوں سے گھوم کر دیکھنے لگا۔تقریباً نصف گھنٹے تک باریک بینی سے تمام لکیروں کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

پھر وہ آہستگی سے کمبل اٹھانے کے لیے بڑھا جو گرنڈے کی کانٹے دار جھاڑی کی لچکیلی شاخ کو دبوچے ہوئے زمین پر آ پڑا تھا۔کمبل کا بوجھ ہٹتے ہی شاخ اس کی ہتھیلی میں کانٹا چبھوتے ہوئے دوبارہ اپنی جگہ جا لگی۔اس نے کمبل کو اپنی طرف کھینچا تو اس کے کناروں سے نکلے ہوئے دھاگے کانٹوں میں الجھ گئے۔جنھیں ٹوٹتے ہی بنی۔

اس نے ایک نظر جھاڑی پر ڈالی تو دیکھا کہ کمبل کی سفید دھاری کے کچھ دھاگے ساون کے باریک کیڑوں کی طرح شاخوں کے گرد لہرا رہے ہیں۔کمبل کو دہرا کر کے بچھاتے ہوئے اسے بائیں ہتھیلی میں شدید چبھن کا احساس ہوا۔کمبل نیچے پھینک کر اس نے ہتھیلی، چاندنی میں پھیلائی اور اس میں چبھے گرنڈے کی نوک تلاش کرنے لگا۔کانٹا اس کی بائیں ہتھیلی میں عین دماغ کی لکیر کے ایک سرے میں چبھا تھا۔لیکن بے احتیاطی سے کمبل کھینچتے ہوئے، لکیر کو دوسرے سرے تک چھیل گیا تھا اور جہاں یہ لکیر ختم ہوتی تھی، وہاں اس کی نوک ٹوٹ کر گوشت میں پیوست ہو گئی تھی۔اس نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے بڑھے ہوئے ناخنوں سے پکڑ کر، سسکاری بھرتے ہوئے اسے باہر کھینچا۔ہاتھ سہلاتے ہوئے اس نے چاندنی میں دیکھا کہ دماغ کی پوری لکیر خون میں ڈوبی ہوئی ہے۔عین اسی لمحے اسے ایک زوردار جھٹکا محسوس ہوا۔اس نے اپنے آپ کو گرنے سے بمشکل بچایا۔لڑکھڑاتے ہوئے اسے اپنے پاؤں کے نیچے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی اور اس نے دیکھا کہ چٹان میں عین اس جگہ پر، جہاں اس کے دماغ کی لکیر سے ملتی جلتی لکیر تھی، دراڑ پڑ چکی ہے۔اسے زمین ڈولتی ہوئی محسوس ہوئی۔اس کا رخ، اس وقت پہاڑ کی طرف تھا۔جہاں چیڑ کے درخت زور زور سے ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے اور ان کی گھنی شاخوں سے برف روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑتی ہوئی زمین پر گر رہی تھی۔

شدید نوعیت کے اس زلزلے کا دورانیہ تین منٹ سے زائد رہا ہوگا۔اس دوران میں وہ چیڑ کے جنگل میں مسلسل برف باری ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔اس نے دن کی روشنی میں بارہا برف باری

ہوتے دیکھی تھی، لیکن چودھویں کے چاند کی روشن ترین رات میں اس نے یہ منظر، سوائے اس خواب کے جس میں اس نے چاند کو چھوا تھا، کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ یہ منظر ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اسے یوں لگا کہ جیسے یہ ساری برف اس کے دماغ میں گر رہی ہے اور اس کے ماضی کا ہر منظر آہستہ آہستہ دب رہا ہے۔ یہ نظارہ اسے پہلے نظارے سے بھی بڑھ کر لطف دینے لگا۔

زمین رک گئی، پیڑ ساکت ہو گئے، مگر برف باری ہوتی رہی۔ ہوتی رہی۔

دوسرا باب

خواب کا پس منظر

(۱)

"میرا خیال ہے یہ جگہ آرام کرنے کے لیے مناسب ہے۔"

نور خان نے غار اور اس کے ارد گرد کے جنگل کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ یہ گزرگاہ سے خاصی ہٹ کر ہے۔ یہاں ہم بہت محفوظ رہیں گے۔ یہاں سے تمام نشیبی علاقے پر نظر رکھی جا سکتی ہے۔" عبداللہ خان نے نور خان سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

رات بھر وہ دریائے ہرو کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے تھے لیکن صبح صادق کے وقت، نہ جانے ان کے جی میں کیا سمائی کہ انھوں نے ایک نامعلوم مقام پر ___ جہاں ایک ندی دریا میں آ کر گرتی تھی ___ دریا سے علاحدگی اختیار کر کے اس ندی کے بہاؤ کے الٹی سمت سفر آغاز کر لیا تھا، جو انھیں اس غار کے نشیب میں واقع اپنے سر چشمے تک لے آئی تھی۔ چشمے پر آ کر انھوں نے ہاتھ منہ دھویا اور پھر چشمے کے آگے پھیلے میدان کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر جب وادی کا نظارہ کیا تو ان کی نظر براہِ راست اس غار پر پڑی؛ اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف کھنچے چلے آئے۔

وہ ایک نامعلوم منزل کے مسافر تھے۔ اگلے دن ان کا پڑاؤ کہاں ہوگا؟ خود انھیں بھی اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ البتہ یہ بات وہ بخوبی جانتے تھے کہ اندھیرا پھیلتے ہی انھیں دوبارہ اپنی نامعلوم منزل کی سمت گامزن ہونا ہے۔ بصورتِ دیگر وہ کسی بھی وقت گرفتار ہو کر تختۂ دار پر لٹک سکتے ہیں۔

وہ جینا چاہتے تھے، اس لیے موت سے چھپتے پھر رہے تھے۔ حالاں کہ ابھی کچھ دن پہلے انھوں نے موت کا سامنا، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کیا تھا۔ موت؛ زندگی میں کئی بار ان کے سامنے آئی لیکن ان کی آنکھوں میں خوف کے بجائے خون دیکھ کر مارے خوف کے خود ہی واپس پلٹ گئی تھی۔ محاذِ جنگ بھی عجیب شے ہے۔ جہاں کسی کو مارنا یا مر جانا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ بزدل سے بزدل

آدمی بھی جنگ کا طبل بجتے ہی بہادر ہو جاتا ہے اور موت سے آنکھیں چار کر لیتا ہے، اور وہ تو تھے ہی بہادروں کے قبیلے سے۔اس قبیلے سے؛ جس کے سربراہ نے اپنے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیے جانے پر، راجہ سے ٹکر لے لی تھی؛ اس راجہ سے جس کی راجدھانی میں، ان کے پورے قبیلے کی حیثیت، بکریوں کے ایک ریوڑ سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر آسمان نے یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک بکری نے شیر کا شکار کر لیا۔ قلی خان اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھا، جب تک اس نے راجہ کو قتل نہیں کر دیا؛ اور وہ بھی اپنے ہاتھوں سے۔ یوں اس نے اس خطے میں بغاوت کا پہلا بیج بویا تھا۔جس کی فصل اب سروں تک آ گئی تھی۔

اس فصل کو سروں تک لانے میں ان دونوں نے بھی بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ٹھیک دس سال پہلے، جب سکھا شاہی آغاز ہوئی تھی، اور ان کی ریاست کے راجہ سمیت اردگرد کی بیشتر ریاستوں کے سربراہان نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کر لی تھی؛ ان کی ریاست کے راجہ نے امر سنگھ مجیٹھہ کو، جسے رنجیت سنگھ نے ہزارہ کا گورنر مقرر کیا تھا، ان کے چھوٹے سے قبیلے کے خلاف یہ کہہ کر اکسایا کہ ہزارہ میں سکھ حکومت اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک وہ اس سرکش قبیلے کو مطیع نہیں کر لیتی۔ راجہ، درپردہ اپنے دادا کے قتل کا قرض چکانا چاہتا تھا۔اس نے ان کے خلاف امر سنگھ کے کان خوب بھرے۔طاقت کے نشے میں چور امر سنگھ نے فوراً اپنے درباری نجومی کو بلایا؛ اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور زائچہ بنانے کا حکم دیا۔نجومی نے ایک رات کا وقت مانگا۔اگلی صبح نجومی نے اسے بتایا کہ آپ مطمئن ہو کر حملہ کر دیں، زائچے کے مطابق آپ کی موت سمندر میں واقع ہو گی۔وہ بہت خوش ہوا اور اس نے نجومی کا منہ نانک شاہی سکوں سے بھر دیا اور دوسرے ہی دن اپنی فوج لے کر ان کے گاؤں پر چڑھ دوڑا۔جو بھی رستے میں آیا اسے قتل کر دیا۔گاؤں کے باقی لوگوں نے بھاگ کر جان بچائی۔اس نے مال مویشی اور دیگر سامان لوٹ کر پورے گاؤں کو آگ لگانے کا حکم دیا اور اپنی فتح کے جشن کے لیے رات وہیں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔گاؤں ایک ندی کے کنارے اونچے ٹیلے پر واقع تھا، دوسرے دن صبح سویرے اُٹھ کر وہ ایک مختصر دستے کے ساتھ بول براز کرنے اور نہانے دھونے کے لیے ندی کنارے اترا۔جہاں بڑے بڑے پتھروں کے درمیان شفاف پانی بہہ رہا تھا۔امر سنگھ کو بہتا پانی بچپن سے ہی بہت بھاتا تھا۔اس منظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس نے یہاں کچھ دیر بیٹھ کر ستانے کا فیصلہ کیا اور حفاظتی دستے کے ایک سپاہی کو حکم دیا کہ وہ اس کے چھوٹے بھائی کو بلا لائے؛ جو جشن کے سبب رات گئے تک جاگتا رہا تھا اور ابھی تک سویا پڑا تھا۔امر سنگھ کے بھائی کو جگا کر جیسے ہی پیغام دیا گیا وہ سمجھ گیا کہ امر سنگھ کو افیون کی طلب ہو رہی ہے۔اس نے افیون ساتھ لی اور بھاگتا ہوا ندی کنارے پہنچا۔

امر سنگھ نے اپنے حفاظتی دستے کو پیچھے ہٹنے کو کہا۔ حکم ملتے ہی حفاظتی دستہ کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ امر سنگھ نے افیون کی یومیہ مقدار لی اور اپنی نظریں فراز سے نشیب کی طرف بہتے ہوئے پانی پر گاڑھ لیں۔ تھوڑی دیر میں اسے یوں لگا جیسے پانی ساکن ہے اور زمین چل رہی ہے۔ ساکن پانی سے اس کا دھیان فوری طور پر سمندر کی طرف گیا۔ جہاں اس کے نجومی کے بقول اس کی موت لکھی ہوئی تھی۔ اپنی موت کا خیال آتے ہی اس کے بدن میں خوف کی لہر ابھری۔ اس نے فوراً اس خیال کو جھٹکا اور اپنی نظریں بھی پانی سے ہٹا لیں۔ ابھی وہ اس خیال کو پوری طرح جھٹک بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے بھائی نے اس کی توجہ تین گھڑ سواروں کی طرف دلائی، جو عقب سے ان کے سروں پر آ چکے تھے۔ یہ عبداللہ خان، نور خان اور احمد خان تھے۔ ان تینوں نے اُن دونوں کو گھیر لیا۔ امر سنگھ نے اپنے حفاظتی دستے کو آواز دی۔ دس سپاہیوں پر مشتمل اس دستے نے ان تینوں کا گھیراؤ کر لیا اور دو بدو لڑائی شروع ہوگئی۔ احمد خان دادِ شجاعت دیتے ہوئے زخمی ہو کر اپنے گھوڑے سے گر پڑا۔ جوں ہی احمد خان گھوڑے سے گرا۔ نور خان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے سپاہیوں کو چھوڑ کر امر سنگھ پر حملہ کر دیا اور اگلے چند لمحوں میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس دوران میں عبداللہ خان امر سنگھ کے بھائی کا کام بھی تمام کر چکا تھا۔ پھر وہ دونوں سپاہیوں کی طرف پلٹے؛ سپاہیوں نے، جو اپنے سردار اور اس کے بھائی کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، بھاگنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ وہ دونوں سپاہیوں کا پیچھا کرنے کے بجائے احمد خان کی طرف لپکے، جو، ان کے پہنچنے سے پہلے دم توڑ چکا تھا۔ انھوں نے احمد خان کی لاش اُٹھائی اور اپنے گاؤں لے جا کر دفن کر دی جب کہ امر سنگھ اور اس کے بھائی کی لاشیں ایک ماہ سے زائد عرصے تک ندی کے کنارے پڑی گلتی سڑتی رہیں۔ آخر کار علاقے کے ہندوؤں اور برہمنوں کا ایک وفد قبیلے کے سربراہ کے پاس آیا اور لاشیں ورثا کے حوالے کرنے کی درخواست کی جنھیں سرائے صالح لے جا کر جلایا گیا اور ان کی سمادھی بنائی گئی۔ ''سمندر کٹھہ'' آج بھی اسی زور و شور سے بہہ کر دریائے ہرو کی جولانیوں میں اپنا حصہ ڈال رہا ہے مگر نور خان کی آنکھوں میں اتر آنے والے خونی منظر کو یاد کر کے کبھی کبھی دہل سا جاتا ہے اور اس چٹان سے بچ کر گزرنے کی کوشش کرتا ہے، جہاں اس نے امر سنگھ مجیٹھ اور اس کے بھائی کی لاشیں ایک ماہ تک گلتے سڑتے دیکھیں تھیں۔

ابھی چند ماہ پیشتر اُن کے قبیلے کے سردار کو اطلاع ملی کہ سید احمد بریلوی ایک قریبی علاقے بھوگڑ منگ میں قیام پذیر ہیں۔ اس نے ان دونوں کو اپنا نائب بنا کر وہاں بھیجا۔ وہ سید احمد بریلوی اور ان کے مریدِ خاص سید اسماعیل دہلوی کی تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے۔ واپس آ کر انھوں نے سید

صاحب کا خصوصی پیغام اپنے قبیلے کے سربراہ تک پہنچایا۔ قبیلے کے سربراہ نے اگلے ہی ہفتے سید صاحب سے ملاقات کی اور پورے قبیلے کی طرف سے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

واپسی پر جب اس نے اپنا فیصلہ قبیلے کے سامنے رکھا تو کسی نے بھی اس سے بغاوت نہیں کی۔ جن لوگوں کو اس سے اختلاف تھا، انھوں نے بھی یہ کہہ کر کہ اب یہ قبیلے کی غیرت کا مسئلہ ہے ساتھ دینے کی ہامی بھر لی۔ یہاں تک کہ ان کے آباواجداد صدیوں سے جس طریقے سے نماز ادا کرتے چلے آ رہے تھے اس میں بھی تبدیلی لا کر، انھوں نے اپنے آپ کو سید احمد بریلوی کے مسلک سے ہم آہنگ کر لیا البتہ شادی بیاہ اور مرگ و موت کی رسومات جنھیں سید احمد بریلوی غیر اسلامی قرار دیتے تھے، انھوں نے برقرار رکھیں۔ شاید اس معاملے میں عقائد نے ثقافت اور رسوم و رواج کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

سید احمد بریلوی نے جب دیکھا کہ ان کا پورا قبیلہ ظاہری طور پر ہی سہی ان کا ہم خیال ہو چکا ہے تو انھوں نے چھوٹے موٹے فروعی مسائل سے صرف نظر کیا۔ بہت سی دیگر وجوہات کے علاوہ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ سید صاحب مقامی رسوم و رواج کو ختم کرنے کا انجام دیکھ چکے تھے۔ اس سے پہلے پشاور میں، جہاں انھوں نے کچھ عرصہ اپنی حکومت قائم کیے رکھی تھی، ان کا سب سے بڑا حمایتی؛ ایک ایسا قبیلہ تھا، جس میں صدیوں سے رواج چلا آ رہا تھا کہ جب کوئی لڑکی جوان ہوتی، اس کا رشتہ اس کے ہم کفو سے طے کر دیا جاتا لیکن جب تک اس کا منگیتر ایک سو اسی روپے کما کر لڑکی والوں کو ادا نہ کرتا اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ سید احمد بریلوی نے اس رسم کو بدعت قرار دے کر منادی کرا دی کہ جو شخص لڑکی کا شیر بہا لے گا وہ حرام کھائے گا۔ انھوں نے حکم جاری کر دیا کہ تمام نامزد شوہر نکاح پڑھانے والے کو صرف پانچ آنے ادا کر کے اپنی نامزد بیویاں اپنے گھر لے آئیں۔ اس حکم کے جاری ہوتے ہی عام لوگوں بالخصوص جوانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سینکڑوں لڑکیاں، جن کی منگنی ہو چکی تھی لیکن شیر بہا ادا نہ ہونے کی وجہ سے اپنے والدین کے گھروں میں بیٹھی ہوئی تھیں، ان کے نامزد شوہر پانچ پانچ آنے نکاح خوانوں کو ادا کر کے انھیں اپنے اپنے گھروں میں لے آئے۔ اگر چہ یہ ایک نیک اور غریبوں کے لیے فائدہ مند کام تھا، لیکن ایسے ہی رواج رکھنے والے دوسرے قبائل نے اس قبیلے کو طعنے دینا شروع کر دیے کہ ان کی لڑکیوں کی قیمت اب صرف پانچ آنے رہ گئی ہے۔ یہ طعنہ مذکورہ قبیلے کو بہت برا لگا اور اس کے نمائندین نے آپس میں مشورہ کر کے سید احمد بریلوی کے خلاف بغاوت کر دی، جو ان کی حکومت کے خاتمے پر منتج ہوئی۔

نماز کے طریقوں میں معمولی تبدیلی کے علاوہ ایک اور اہم تبدیلی، جو ان کی زندگیوں میں

رونما ہوئی تھی، وہ ایک مسلم سلطنت کے قیام کا خواب تھا۔اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے وہ ہر قربانی دینے کو تیار تھے۔انھیں یقین تھا کہ وہ بہت جلد اس کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اسی دوران میں سید احمد بریلوی نے موضع بالاکوٹ میں جا کر ڈیرے جما لیے۔قیام بالاکوٹ کے دوران میں خطے کے وہ تمام لوگ، جو سکھا شاہی کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے تھے، جوق در جوق آ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے اور اپنا مال و متاع ان کے قدموں میں ڈھیر کرنے لگے۔جب اس کی اطلاع علاقے کے ناظم الامور مہاں سنگھ کو ملی ؛تو وہ فوراً کنور شیر سنگھ کی، جو رنجیت سنگھ کی ہزارہ میں مسلح افواج کا سربراہ تھا، خدمت میں حاضر ہوا؛ اور عرض کی:

''خلیفہ مقامی لوگوں کو ہمارے خلاف اکسا رہا ہے اور ان سے مالیہ وصول کر رہا ہے۔اگر یہی صورت حال رہی تو علاقے میں تعینات فوج کو تنخواہ دینا مشکل ہو جائے گی۔حملے کی صورت میں مقامی لوگ بھی اس کا ساتھ دیں گے۔اگر بروقت اس کا تدارک نہ کیا گیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔''

''اور تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تماشا دیکھ رہے ہو''۔کنور شیر سنگھ نے چلا کر کہا۔

''مہاراج میں اپنی سی کوشش تو کر رہا ہوں۔لیکن میرے پاس فوج بہت کم ہے۔''مہاں سنگھ نے دست بستہ عرض کی۔

یہ جواب سنتے ہی کنور شیر سنگھ نے ؛وزیر سنگھ، سادھو سنگھ اور رنجناک ورتن سنگھ کو طلب کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ مع اپنی فوج کے فوراً یہاں سے کوچ کریں اور گڑھی کے مقام پر قیام کریں؛ اور مہاں سنگھ جو پلان تیار کرے، اس میں اس کی مدد کریں۔

دوسرے ہی دن تمام دستے گڑھی کے مقام پر دریائے کنہار کے کنارے جا ٹھہرے اور مہاں سنگھ کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

سردار مہاں سنگھ نے کنارو ریا؛ گڑھی فتح سنگھ کے نام سے، ایک گڑھی تیار کرنا شروع کر دی۔ تین دن بعد ابھی اس کی بنیاد ہی رکھی گئی تھی کہ ہر طرف یہ افواہ پھیل گئی کہ آج شام کو سید احمد بریلوی اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ دریا کے دوسرے کنارے ڈیرا جمائیں گے اور شب کے پچھلے پہر سکھوں کے ڈیرے پر شب خون ماریں گے۔یہ خبر سنتے ہی سکھ فوج کے افسران گھبرا گئے۔انھوں نے ڈیرے کے گرد خندق کھود کر خارجہ بندی کرنا شروع کر دی۔رات بھر سید احمد بریلوی کی آمد کی افواہ سارے میں گردش کرتی رہی۔اردگرد کے جنگلوں میں جہاں کوئی سرسراہٹ ہوتی وہ چوکنے ہو جاتے۔وہ رات بھر نقارے پیٹتے

رہے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ دوسرے دن انھوں نے کنور شیر سنگھ کو عرضی بھیجی:

''خلیفہ دریا کے پار آ چکا ہے۔ اس کے پاس میدانی علاقوں سے آئے ہوئے تربیت یافتہ مسلح باغیوں کی ایک بھاری تعداد ہے۔ بہت سے مقامی لوگ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں۔ آج رات وہ ہمارے ڈیرے پر شب خون مارے گا۔ ہمارے پاس صرف آٹھ سو سپاہی ہیں۔ جو کسی بھی صورت اس کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔ وہ ہم سب کو قتل کر دے گا۔ لہٰذا فوری طور پر فوج کی ایک بھاری نفری بھیجی جائے۔''☆

یہ عرضی رات کو پہنچی۔ عرضی ملتے ہی کنور شیر سنگھ نے مزید فوج کو بھی کوچ کا حکم دے دیا۔ صبح سویرے فوج کی ایک اور بھاری نفری گڑھی پہنچ گئی۔ بھاری فوج کو دیکھتے ہی پہلے سے موجود دستوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور انھوں نے گڑھی کی تعمیر شروع کر دی، جو اگلے سولہ دنوں میں مکمل ہوئی۔

کنور شیر سنگھ نے بھی معاملے کی نزاکت کے پیشِ نظر وہاں جانا ضروری سمجھا۔ اس نے گڑھی کا معائنہ کیا اور پھر دریا کے کنارے چلتا چلتا بالاکوٹ سے تین کوس کے فاصلے پر واقع کوٹ بھلہ کے مقام پر آ ٹھہرا۔ جہاں سے اس نے دوربین کے ذریعے سید احمد بریلوی کے پڑاؤ کا مشاہدہ کیا اور اپنی فوج کے سالاروں سے کہا:

''دریا کے اس کنڈے سے ان کے ڈیرے پر حملے کی صورت میں فتح مشکل ہے۔ کوئی اور صورت نکالنا پڑے گی۔'' اگلے کئی دن تک حملے کے سلسلے میں صلاح مشورے ہوتے رہے۔

سید احمد بریلوی اور ان کے ساتھی بھی اس معاملے پر بدستور نظر رکھے ہوئے تھے۔ ایک رات انھوں نے اپنے پانچ سو مسلح افراد کو دریا عبور کرا کر وہاں سے تقریباً دو کوس کے فاصلے پر واقع جنگل میں چھپا دیا اور صبح سویرے ڈیرے پر چاول پکا کر کھلے برتنوں میں چھوڑ دیے، اور خود بھی اپنے باقی ساتھیوں سمیت وہاں سے غائب ہو گئے۔ شام کے وقت کنور شیر سنگھ نے دوربین لگا کر دیکھا تو پڑاؤ کی جگہ ہر طرف پرندے اُڑتے پھر رہے اور وہاں کسی آدمی کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

''لگتا ہے خلیفہ بھاگ گیا ہے۔ کسی انسان کی موجودگی میں پرندے یوں بے خوف و خطر برتنوں سے رزق نہیں چگ سکتے۔ بہر حال اصل صورت حال معلوم کرنے کے لیے پانچ مسلح لوگوں کو فوراً وہاں بھیجا جائے'' کنور سنگھ نے مہاں سنگھ کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

☆ عرضی بنام کنور شیر سنگھ بحوالہ تاریخ ہزارہ

پانچ مسلح افواج کا دستہ جب جنگل میں داخل ہوا تو سید احمد بریلوی کے ساتھیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ تین افراد مارے گئے۔ باقی دو، تیراک تھے انھوں نے دریا میں چھلانگ لگا دی، اور کنارے پہنچ کر کنور سنگھ کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

اتنے میں جمعدار ٹیک سنگھ کشمیر سے ایک ہزار مسلح افراد کا دستہ لے کر گڑھی پہنچ گیا۔ دوسری طرف ہزارہ کی جو فوج شنکیاری میں تھی اور جسے پیش قدمی کا حکم پہلے ہی مل چکا تھا، شام ڈھلے مٹی کوٹ کے پہاڑ پر پہنچ گئی اور پھر رات کے اندھیرے میں موضع بالاکوٹ کی پہاڑی پر اتر آئی۔☆ جہاں نیچے ہوتڑوں☆ میں سید احمد بریلوی اوران کے ساتھی پڑاؤ کیے ہوئے تھے۔

پو پھٹتے ہی کنور سنگھ اور مہاں سنگھ نے اپنی فوج کو حملے کا حکم دے دیا۔ سید احمد بریلوی اور اسماعیل دہلوی بھی اپنی مختصر سی فوج لے کر میدان میں اتر گئے اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کا آوازہ بلند کرتے ہوئے جوابی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔ دن کے پہلے پہر سے دوپہر تک دونوں جانب سے گولہ باری ہوتی رہی۔ دونوں طرف سے کچھ لوگ مارے بھی گئے، مگر کوئی بھاری جانی نقصان نہیں ہوا۔ دونوں طرف کا پلڑا برابر رہا۔

دوپہر کے وقت نور خان اور عبداللہ خان نے اپنے ایک مختصر سے دستے کے ساتھ پہاڑی کی دوسری طرف سے جا کر سکھ فوج کے نشان برداروں کو نشانہ بنایا۔ جو وہیں ڈھیر ہو گئے اوران کے ہاتھ سے جھنڈے گر گئے۔ جس سے سکھ فوج میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ اس دوران میں سکھ فوج کا خاصا جانی نقصان ہوا جس کے سبب وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئی۔ سید احمد بریلوی نے میدانی علاقوں سے ساتھ آئے ہوئے چار سو کے قریب اپنے فدائیوں کو وہیں ہوتڑوں میں پوزیشنیں سنبھالے رکھنے کا حکم دیا۔ جب کہ خود دو سو ستر کے قریب مقامی جاں نثاروں، جن میں عبداللہ خان اور نور خان بھی شامل تھے، کو لے کر پہاڑ کے دامن کی طرف، جدھر کو سکھ فوج نے پسپائی اختیار کی تھی، نکل کھڑے ہوئے۔ وہ پہاڑ کے دامن میں پہنچے ہی تھے کہ ایک طرف سے شام سنگھ اور پرتاب سنگھ اٹاری جب کہ دوسری طرف سے سردار عطر سنگھ کالیاں والا اور گورکھ سنگھ بھلہ کے زیرِ کمان بھاری دستوں نے انھیں گھیر کر ایسا بھرپور حملہ کیا کہ سید صاحب کی فوج کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ پرتاب سنگھ کی زیرِ کمان فوج کے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر سید احمد بریلوی کو نشانہ بنایا۔ ایک گولی ان کے دائیں ہاتھ پر جب کہ دوسری ان کے سینے کے بائیں حصے

☆ بحوالہ تاریخ ہزارہ، از پرتاب سنگھ۔ ☆ دھان کے کھیت

میں عین دل پر لگی۔سید احمد بریلوی کے گرتے ہی جنگ کا پا سا پلٹ گیا۔سہ پہر کے وقت سید صاحب کے جان نثاروں کی ایک سو ستاسی لاشیں، پہاڑی کے دامن میں جب کہ چارسو کے قریب، پیچھے ہوتروں میں پڑی تھیں۔

باقی ماندہ جاں نثاروں کو، جن کی تعداد اسی کے قریب تھی، پسپائی اختیار کرتے ہی بنی۔جاتے ہوئے، انھوں نے سید احمد بریلوی کی لاش کو بھی اُٹھا کر ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ سکھ فوج کا ایک دستہ ان کے بہت قریب پہنچ چکا ہے تو انھوں نے لاش کو بہت احترام کے ساتھ دوبارہ زمین پر رکھا اور آگے بڑھنے لگے۔یک دم نور خان کے ذہن میں کوئی خیال ابھرا اس نے عبداللہ خان اور اپنے دو چار دیگر ساتھیوں کے کان میں کچھ کہا؛ انھوں نے اپنی بندوقیں پرے پھینکیں اور نیام سے تلواریں نکال کر واپس میدانِ جنگ کی طرف دوڑ لگادی؛ اور وہاں پہنچ کر اپنے ہی ساتھیوں کے مردہ جسموں پر پل پڑے۔انھوں نے دو درجن کے قریب لاشوں کے سر تن سے جدا کیے اور پھر نور خان نے سید احمد بریلوی کا سر تن سے جدا کر کے ساتھ لیا اور اپنے دوسرے ساتھیوں سمیت ،میدانِ جنگ سے فرار ہوگیا۔سکھوں نے بالاکوٹ تک ان کا پیچھا کیا لیکن وہ ہاتھ نہ آئے۔

فتح کے بعد شام ڈھلے کنور شیر سنگھ میدانِ جنگ میں گیا اور حکم دیا کہ بالاکوٹ سے کسی ایسے شخص کو بلا کر لایا جائے جو خلیفہ کی لاش کی شناخت کر سکتا ہو۔جتنے لوگ بھی لائے گئے وہ سید احمد بریلوی کی لاش کی شناخت میں ناکام رہے۔پھر انہوں نے تمام سر بریدہ لاشوں کو اکٹھا کیا تو سر بریدہ تن بائیس جب کہ کٹے ہوئے سر اکیس تھے۔کنور سنگھ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔اس نے نواب خان کو بلایا جو اڑھائی تین سال سید احمد بریلوی کے ساتھ رہا تھا اور بعد میں ان کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔نواب خان نے سر بریدہ تنوں کا معائنہ کرنے کے بعد کہا:

"باری باری ہر سر بریدہ تن کے پاؤں کی انگلیاں دیکھی جائیں۔جس تن کے پاؤں کی انگلیوں کے تمام ناخن ٹیڑھے ہوں۔وہ سید احمد بریلوی کی لاش ہوگی۔"

کنور شیر سنگھ نے خود تمام سر بریدہ لاشوں کی انگلیوں کا معائنہ کیا۔ایک لاش کے پاؤں کی انگلیوں کے ناخن واقعی ٹیڑھے تھے۔

"خلیفہ کی لاش سکھ فوج کے مسلمان ملازموں کے حوالے کر دو تا کہ وہ اسے کہیں دفن کر دیں"۔کنور شیر سنگھ نے مہاں سنگھ کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

"مہاراج کا حکم سر آنکھوں پر لیکن اس طرح مسلمانوں میں خلیفہ سے عقیدت بڑھے گی۔وہ

اس کی قبر کو پوجیں گے اور اس کی کرامات کا چرچا کریں۔ اس سے مسلمانوں میں ہمارے خلاف بغاوت کا جذبہ اور بڑھے گا۔'' مہاں سنگھ نے عاجزی سے کہا۔

''ہاں۔ تم نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ ٹھیک ہے اس کو جلا دو۔'' کنور سنگھ نے کہا۔

''نہیں۔ مہاراج اس مُسلے کی لاش کو جلانا مناسب نہیں ہوگا۔'' مہاں سنگھ نے اختلاف کیا۔

''تو پھر۔۔۔؟'' کنور سنگھ نے پوچھا۔

''اس کے ٹکڑے کر کے دریا میں بہا دیتے ہیں۔'' مہاں سنگھ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اسے اُٹھا کر لے جاؤ'' کنور شیر سنگھ نے مہاں سنگھ سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

رات کے پچھلے پہر آٹھ سکھوں نے مہاں سنگھ کی نگرانی میں لاش کا انگ انگ جدا کیا اور اسے دریا میں بہا دیا۔ جنھیں بعد میں پچیس پچیس روپے انعام سے نوازا گیا۔

عین اس وقت جب مہاں سنگھ اپنی نگرانی میں لاش کو دریا برد کروا رہا تھا۔ میل بھر کے فاصلے پر، دریائے کنہار ہی کے کنارے، نور خان، عبداللہ خان اور ان کے ساتھی سید احمد بریلوی کا سر دفن کر رہے تھے۔

سکھوں نے علاقے کا کنٹرول سنبھالتے ہی مختلف دیہات میں ان تمام لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دی۔ جن کے بارے میں انھیں شک تھا کہ انھوں نے سید احمد بریلوی کا ساتھ دیا۔ نور خان اور عبداللہ خان کے بارے میں انھیں رپورٹ ملی کہ وہ سید احمد بریلوی کے قابلِ اعتماد ترین ساتھیوں میں سے ہیں۔ چناں چہ ان کے پورے گاؤں کو آگ لگا دی گئی، جن میں ان کے خاندان کے بہت سے افراد جل مرے۔ باقی لوگوں نے بھاگ کر جان بچائی۔ اس بار بھی قسمت نے ان کی یاوری کی اور وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ دن تک تو وہ اپنے گاؤں کے اردگرد جنگلوں میں چھپے رہے۔ لیکن کل دوپہر کے وقت انھوں نے وقتی طور پر علاقہ چھوڑنے اور کچھ عرصے کے لیے روپوش ہونے کا فیصلہ کر لیا اور شام کے سائے پھیلتے ہی اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ وہ رات بھر چلتے رہے تھے اور ابھی کچھ دیر پہلے یہاں پہنچے تھے۔

یہ جون کی ایک گرم صبح تھی سورج مشرقی افق سے بلند ہو چکا تھا۔ لیکن جس جگہ وہ کھڑے تھے وہ ابھی عقبی پہاڑی کے سائے میں تھی۔ انھوں نے اپنا سامان ایک طرف رکھا غار کے آگے پڑے پتھر ہٹائے اور اس کے اندرونی حصے کا بغور جائزہ لینے لگے۔ غار تقریباً پانچ فٹ چوڑا اور چار فٹ اونچا تھا۔ البتہ اس کی لمبائی کا انھیں بالکل اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ کیوں کہ روشنی آٹھ، نو فٹ تک ہی پہنچ پا رہی تھی، آگے مکمل طور پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بہر حال جتنا حصہ روشن تھا وہ اس میں آرام سے بیٹھا اور

لیٹ سکتے تھے۔وہ یکے بعد دیگرے جھک کر غار میں داخل ہوئے اورآگے کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں۔زمین پر چیونٹیوں کے گھروں اور چھت کے ساتھ مکڑیوں کے چھوٹے موٹے جالوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔وہ مایوسی سے غار کے تاریک حصے کی طرف دیکھنے لگے۔لیکن انھیں اپنے سایوں اور پھر ان سے آگے مکمل اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔پھر وہ تھوڑے سے باہر کی طرف سرکے اور دہانے کے قریب جنوبی سمت والی پتھریلی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر تاریک حصے کی طرف بغور دیکھنے لگے۔

اچانک نورخان کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر ابھری اور اس نے عبداللہ خان کو انگلی کے اشارے سے، غار کے اندر تاریک حصے کی طرف، کچھ دکھانے کی کوشش کی۔

''وہ دیکھ! وہ۔''

''نظر آیا؟''

''نہیں!''

''وہ یار۔وہ۔میری انگلی کی سیدھ میں''

''ہاں۔آ گیا نظر''۔

''نیچے سے لے کر اوپر تک ہے۔''

انھوں نے آگے بڑھ کر مکڑی کے ایک بڑے جالے کا باریک بینی سے جائزہ لیا، جو غار کی چوڑائی اور اونچائی کو محیط تھا۔جالا دیکھ کر وہ یوں خوش ہوئے، جیسے ان کے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو۔

یہ جالا اس بات کا غماز تھا کہ غار محفوظ ہے۔وہ کتنا ہی لمبا اور تاریک کیوں نہ ہو۔اس میں نہ تو کوئی درندہ گھسا اور نہ ہی کوئی سانپ۔انھوں نے کاہو کے درخت کی ٹہنیوں کے جھاڑو بنا کر، غار کے روشن حصے کی صفائی کی؛ اپنا سامان اٹھایا؛ اندر رکھا اور چادریں بچھا کر لیٹ گئے۔اگلے چند ہی لمحوں میں وہ گہری اور پرسکون نیند کے مزے لے رہے تھے، جو مہینے بھر سے انھیں نصیب نہیں ہوئی تھی۔

جب نورخان کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ غار پھیل چکا ہے اور اس کی لمبائی پہلے سے تقریباً دوگنی ہو چکی ہے۔سورج ڈھلنے کی وجہ سے اب اس کی روشنی غار میں کافی آگے تک جا رہی تھی اور مکڑی کا بڑا جالا بہت واضح دکھائی دے رہا تھا۔تاہم ابھی تک غار کا پچھلا کونہ تاریکی میں غائب تھا۔

نورخان نے عبداللہ کو جگایا دونوں نے سامان سمیٹا اور غار سے نکل کر اس کی بائیں سمت بنے قدرتی زینوں پر قدم جماتے ہوئے، اس کی چھت پر آ کھڑے ہوئے اور نشیب میں پھیلے جنگل کا نظارہ

کرنے لگے۔سورج مغرب کی سمت واقع ایک دوردراز پہاڑ پر یوں ٹنگا ہوا تھا جیسے چوٹی پر کھڑے ہوکر ،اس پر،آسانی سے مچھلی تلی جا سکتی ہو۔۔

انھوں نے پوٹلی میں رکھی مکئی کی میٹھی روٹیاں نکالیں ،انھیں کھایا اور جھاڑیوں میں راستہ بناتے ہوئے نیچے اسی گزرگاہ کی طرف اترنے لگے،جس سے وہ صبح الگ ہوئے تھے۔وادی میں موجود دو بڑی گول چٹانوں میں سے دائیں سمت والی چٹان کے قریب پہنچ کر وہ جھاڑیوں میں بیٹھ گئے اور سورج ڈوبنے کا انتظار کرنے لگے۔اندھیرا پھیلتے ہی وہ مزید نیچے اترے اور ویران گزرگاہ کی رہنمائی میں اپنی نامعلوم منزل کی سمت بڑھنے لگے۔

رات کے پچھلے پہر وہ ایک بڑے پہاڑ سے اتر کر کسی میدانی بستی میں داخل ہو گئے۔جہاں انھوں نے رات کا باقی حصہ،وہاں موجود ایک مزار کے احاطے میں گزارا جو بستی کے عین وسط میں واقع تھا اس بستی کا نام نور پور شاہاں تھا۔صبح اٹھ کر انھوں نے یہ سوچ کر یہیں قیام کرنے کا ارادہ کر لیا کہ جب تک انھیں کوئی کام وام نہیں ملتا خانقاہ کے لنگر سے گزارا چلتا رہے گا۔

مہینے بھر کے بعد انھیں اپنے بیوی بچوں کی یاد ستانے لگی۔جنھیں وہ آتے ہوئے اپنے قریبی عزیزوں کے ہاں چھوڑ آئے تھے۔یہ ان کے وہ عزیز تھے جو سکھ حکام کو کسی طرح یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے تھے،کہ انہوں نے سرکار کے خلاف بغاوت کا علم بلند نہیں کیا تھا۔

دونوں نے آپس میں صلاح مشورے کے بعد طے کیا کہ گھر کی طرف سفر قمری مہینے کی دسویں کے بعد کیا جائے تا کہ چاندنی میں راستہ آسانی سے سجھائی دے سکے۔پھر ایک رات جب چاند خوب روشن تھا،وہ اپنے آبائی گھر کی طرف نکل پڑے۔پو پھٹے وہ اپنے آبائی گاؤں کے سامنے ایک پہاڑی کی چوٹی پر تھے۔اگر وہ سفر جاری رکھتے تو دن کے پہلے پہر اپنے گاؤں پہنچ سکتے تھے۔لیکن آگے کئی چھوٹے بڑے گاؤں تھے اور ہر گاؤں میں حکام نے کوئی نہ کوئی مخبر رکھا ہوا تھا؛ اوران کا نام تو اب مشہور باغیوں میں شامل تھا،اس لیے انھوں نے دن اسی پہاڑی جنگل میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔جہاں انھیں ہر لحہ خوف کے سائے میں گزارنا پڑا،کہ یہ علاقہ ان کے آبائی گاؤں کے بہت قریب تھا اور اردگرد کے تمام دیہاتوں کے لوگ انھیں پہچانتے تھے۔گرفتار ہو جانے کا خطرہ سارا دن ان کے سر پر منڈلاتا رہا۔جب بھی کوئی چرواہا بھیڑ بکریاں ہانکتا ہوا ان کے قریب سے گزرتا انھیں اس پر مخبر کا شائبہ ہوتا۔خدا خدا کر کے سورج ڈوبا اور چاند طلوع ہونا شروع ہوا۔رات کا دوسرا پہر شروع ہونے سے پہلے وہ اپنے عزیزوں کے گھروں میں تھے۔جہاں ان کے بیوی،بچے اور دوسرے عزیز دیر تک ان سے لپٹ کر روتے رہے۔

تیسرے ہی دن اس خدشے کے پیشِ نظر کہ اگر ان کے یہاں قیام کی اطلاع حکام تک پہنچ گئی تو نہ صرف انھیں گرفتار کر لیا جائے گا، بل کہ ان کے عزیزوں پر بھی آفت ٹوٹ پڑے گی، وہ دوبارہ میدانی بستی کی طرف چل پڑے۔ حسبِ سابق دن اسی غار میں گزارا اور اگلی شام دوبارہ سفر آغاز کر کے رات کے دوسرے پہر اسی مزار کے احاطے میں جا گھسے۔ چند ہی دنوں میں انھوں نے ایک اور ٹھکانہ تلاش کر لیا اور محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے لگے۔ مہینے بھر بعد، ایک بار پھر، ایک چاندنی رات میں انھوں نے گاؤں کے لیے عزمِ سفر باندھا۔ لیکن اس بار ساری رات سفر کرنے کے بجائے، جاتے ہوئے اسی غار میں قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ رات کے دوسرے پہر جب چاند اپنے پورے جوبن پر تھا، وہ غار میں جا اترے۔ انھوں نے اپنا سامان غار میں رکھا اور اردگرد سے لکڑیاں جمع کر کے غار کے دہانے پر الاؤ روشن کر کے سو گئے۔ اگلا سارا دن بھی انھوں نے وہیں گزارا۔ لیکن بے کار بیٹھنے کے بجائے وہ دن بھر مکڑی کے جالے سے آگے والے حصے کی صفائی ستھرائی اور درانتی اور کلھاڑی سے غار کے دہانے کا جھاڑ جھنکاڑ صاف کرتے رہے۔ انھوں نے کچھ لکڑیاں کاٹ کر غار کے اندر رکھ دیں تاکہ اگر کبھی بارش وغیرہ کے دنوں میں یہاں قیام کرنا پڑے تو آسانی سے آگ جلائی جا سکے۔ حسبِ معمول اندھیرا پھیلتے ہی وہ اپنے گاؤں کی طرف نکل پڑے۔ اب کی بار صبح نے ان کا استقبال ان کے آبائی گاؤں میں کیا۔

اگلے چند ماہ ان کا یہی معمول رہا۔ گاؤں جاتے ہوئے شام کو سفر آغاز کرتے، رات کا دوسرا پہر شروع ہونے تک وہ غار والے مقام پر پہنچ جاتے اور رات کا باقی ماندہ حصہ اور اگلا سارا دن وہیں قیام کرنے کے بعد اگلی شام دوبارہ اپنے گاؤں کی سمت روانہ ہو جاتے اور پو پھٹنے تک گاؤں پہنچ جاتے۔ جہاں اپنے عزیزوں کی موجودگی میں انھیں تحفظ کا احساس رہتا۔ گاؤں سے واپسی پر وہ صبح سویرے غار میں اترتے، دن بھر آرام سے سوئے رہتے اور شام کو میدانی بستی کی طرف نکل جاتے۔ وہ یہ سفر، عموماً قمری مہینے کی بارہویں سے سولھویں تاریخوں کے درمیانی عرصے میں کرتے، جب راتوں کو چاند کی بھرپور چاندنی سارے میں پھیلی ہوتی۔ لیکن اس کا انحصار مطلع صاف ہونے پر بھی ہوتا۔ اگر بدقسمتی سے ان راتوں میں بارش ہوتی رہتی یا مطلع ابر آلود ہوتا تو انھیں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ کیوں کہ جوں جوں چاند گھٹنا شروع ہوتا، اس کے نمودار ہونے کا وقت بھی دیر سے شروع ہوتا خاص کر سردیوں کی راتوں میں انھیں ایک پورا پہر اندھیرے میں سفر کرنا پڑتا۔ دوسرے پہر جب چاند طلوع ہوتا تو اس کی چاندنی بھی کچھ مدھم ہوتی۔ بہرحال انھیں کسی نہ کسی طرح غار تک پہنچنا ہوتا۔ یوں غار سے ان کی انسیت بڑھتی چلی گئی اور اب وہ اسے اپنا تیسرا گھر تصور کرنے لگے۔

دسمبر کی ایک برفانی رات، جب چودھویں کا چاند پورے جوبن پر تھا، پانچویں بار اپنے گاؤں جاتے ہوئے، وہ نصف رات کے قریب غار میں اترے اور رگوں میں خون جما دینے والی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے، انھوں نے اردگرد پڑی ہوئی لکڑیاں جمع کر کے الاؤ روشن کیا تو ان کا سامنا ایک بہت بڑے اژدھے سے ہوا۔ انھوں نے جلتی ہوئی لکڑیوں سے اس کا بھرپور مقابلہ کیا اور بالآخر اس کا کام تمام بھی کر دیا، لیکن باقی ماندہ رات انھوں نے اس پتھریلی غار کی چھت پر جاگ کر گزاری۔

پو پھٹتے ہی وہ غار کے چبوترے سے اترے اور جھاڑیوں میں راستہ بناتے ہوئے نشیب میں اتر آئے۔ جہاں جنگلی اناروں کا ایک گھنا جنگل تھا اور اس کے درمیان ایک چشمہ بہہ رہا تھا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ چشمے کے آگے ایک وسیع میدان تھا اور میدان کے آخری سرے پر ایک دیوقامت چٹان۔ چشمے کا پانی میدان کے جنوبی کنارے پر موجود ایک نالے سے ہوتا ہوا چٹان کے قریب سے ایک آبشار کی صورت نیچے گر رہا تھا۔ میدان سے آگے کی نشیبی زمین اگرچہ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر مشتمل تھی لیکن زیادہ ڈھلوانی نہیں تھی، ٹیلے کسی حد تک پتھریلے مگر ان کے ساتھ کی زمین خاصی زرخیز تھی۔ جہاں جنگلی اناروں کے ساتھ ساتھ کالے املوک، توت، بٹنگ، ناخ اور دوسرے پھل دار پیڑ تھے، جن میں سے بیشتر کے ساتھ داکھوں (جنگلی انگور) کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ جن میں سے صرف اناروں اور املوکوں کے ساتھ اکا دکا پھل لٹک رہے تھے باقی تمام کے نیچے ان کے پک کر گرے ہوئے پھلوں کی باقیات تھیں۔ وہ تمام دن وہاں آگ جلا کر تاپتے رہے اور اناروں اور املوکوں سے لطف اندوز ہوتے رہے اور شام ہوتے ہی اپنے گاؤں کی طرف چل پڑے۔

چوتھے دن گاؤں سے واپسی پر بھی انھوں نے غار کے بجائے یہیں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بار وہ اپنے ساتھ بوریے بستر، کدال، کلہاڑی، آری اور ضرورت کا کچھ دیگر سامان ایک گدھے پر لاد کر لے آئے۔ تین دن کی مسلسل دھوپ نے، بیشتر جگہوں، خاص کر اونچے ٹکڑوں پر سے برف پگھلا دی تھی۔ انھوں نے ایک ٹیے کے نیچے جہاں زمین کا کچھ حصہ مکمل طور پر ہموار تھا، اپنا سامان رکھا اور اردگرد سے پتھر اور سوکھی لکڑیاں اٹھا کر وہاں جمع کرنے لگے۔ خلافِ معمول اس مرتبہ، انھوں نے رات کو سفر کرنے کے بجائے یہیں قیام کا ارادہ کیا۔ شام کے سائے پھیلتے ہی الاؤ روشن کیا اور اس کے قریب بوریے بستر بچھا کر سو گئے۔

صبح سویرے اٹھ کر انھوں نے زمین کے ایک مخصوص قطعے کو نشان زد کر کے ناہموار حصوں کو ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ چوں کہ زیادہ تر جگہ پہلے ہی ہموار تھی اس لیے اس کام میں انھیں زیادہ

دیر نہیں لگی،سورج طلوع ہونے کے بعد اگلے دو گھنٹوں میں انھوں نے یہ کام مکمل کر لیا تھا۔قریباً بیس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا یہ ٹکڑا ،ایک ٹیلے کے نیچے واقع تھا۔جس کے ہموار سمت والے حصے میں ایک بالکل عمودی چٹان تھی ۔ٹیلا قریباً بارہ تیرہ فٹ اونچا تھا لیکن چٹان پورے آٹھ فٹ ۔چٹان کے اوپر لس مٹی تھی جس میں پھگواڑی کی جھاڑیاں اپنی جڑیں پیوست کیے ہوئے تھیں ۔ان کے پیچھے چیڑ کا ایک دیو قامت درخت ۔جگہ ہموار کرنے کے بعد وہ ادھر اُدھر سے پتھر ڈھونڈ ڈھونڈ کر نشان زد کیے ہوئے قطعے کے اندر جمع کرتے رہے۔کھانے پینے اور حاجاتِ ضروریہ کے علاوہ وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر شام تک اس کام میں لگے رہے۔اندھیرا پھیلتے ہی انھوں نے الاؤ روشن کیا اور اپنا کام جاری رکھا۔جب رات کی سیاہ چادر میں،صبح ؛سفید دھاریاں کاڑھنا شروع ہوئی تب بھی وہ اپنے کام میں جُتے ہوئے تھے۔پھر عقبی پہاڑ سے بلند ہوتے سورج نے دیکھا کہ جہاں کل وہ پتھروں کا ایک بہت بڑا ڈھیر چھوڑ کر غروب ہوا تھا وہ جگہ بالکل خالی ہے۔وہاں صرف ان کے تھکے ہوئے جسم پڑے ہوئے ہیں اور ان کے تینوں طرف بلند و بالا دیواریں اُسر چکی ہیں۔چوتھی طرف قدرتی دیوار پہلے ہی ان کے سروں سے بہت بلند تھی۔

دن بھر وہ آرام سے سوئے رہے۔شام کے وقت وہ جاگے اور گدھے کو ساتھ لے کر میدانی علاقے کی طرف نکلنے کی تیاری کرنے لگے۔جانے سے پہلے انھوں نے اپنا تمام سامان چار دیواری کے اندر ایک کونے میں رکھا اور دروازے والی جگہ کانٹے دار جھاڑیوں کا ایک بڑا سا گٹھڑا پھنسا دیا تا کہ سامان جنگلی جانوروں کی دست برد سے بچا رہے۔

اگلے ماہ جب وہ ایک روشن رات میں یہاں اترے تو ان کی پوٹلی میں باسی روٹیوں کے بجائے ایک گدھے پر آٹا ،دالیں اور دیگر اشیائے خورونوش، جب کہ ایک خچر پر برتن اور ضرورت کا دوسرا سامان تھا۔انھوں نے آتے ہی جھاڑیوں کا گٹھڑا ہٹایا اور سامان اتار کر اندر رکھا۔ایک کونے میں لکڑی کے دو مضبوط کِلّے ٹھونکے، دونوں جانوروں کو ان کے ساتھ باندھا اور گٹھڑا دوبارہ دروازے میں پھنسا کر سو گئے۔

صبح اٹھ کر انھوں نے چار دیواری کے پچھلے ٹیلے پر کھڑے چیڑ کے دیو قامت درخت کو کاٹ گرایا اور پھر آری اور کلھاڑے سے اس کے موٹے موٹے ڈالوں کو اس کے تنے سے الگ کرنے لگے۔شام تک بہ مشکل انھوں نے یہ کام مکمل کیا۔اگلے تین دنوں میں چیڑ کا یہ دیو قامت تنا کئی چھوٹے بڑے حصوں میں تقسیم ہو کر عقبی ٹیلے پر بکھرا پڑا تھا اور قریب ہی اس کے ڈالے اور ان کی چھانٹ۔

رات کو انھوں نے اپنے آبائی گاؤں کے لیے عزمِ سفر باندھ لیا البتہ زادِ سفر کو یہیں رہنے دیا۔

دو دن بعد جب وہ واپس لوٹے تو مضبوط جسم کے مالک دو اور آدمی بھی ان کے ساتھ تھے۔ ایک سفید ریش علی احمد جب کہ دوسرا بالکل جوان شیر محمد۔ صبح سویرے سب سے پہلے انھوں نے عقبی سمت میں موجود قدرتی دیوار پر سے جھاڑ جھنکاڑ صاف کی، کدالوں سے کھود کرا سے باقی تینوں دیواروں کے برابر کیا۔ اس قدرتی دیوار کی چوڑائی باقی دیواروں سے دوگنی تھی۔ انھوں نے چار دیواری کے عین وسط میں فٹ بھر سے کچھ زیادہ چوڑے، چکور پتھر پر ستون کھڑا کیا جو دور سے دیکھنے پر انگریزی حرف I کی شکل کا نظر آتا تھا۔ ستون کو چاروں طرف سے لکڑیوں کا سہارا دے کر اس کے اوپر ایک چار فٹ لمبی اور فٹ بھر چوڑی سری کی چول مضبوطی سے جمائی۔ جس کے بعد اس I نے T کی شکل اختیار کر لی۔ پھر عقبی دیوار کے پچھلے ٹیلے پر دس دس فٹ لمبی اور فٹ بھر چوڑی اور اتنی ہی موٹی کڑی کو دیوار پر اتارا۔ اس بھاری کڑی کو نیچے دیوار تک لانے میں انھیں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن اب اسے درمیان میں کھڑے ستون تک پہنچانے کا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ کچھ دیر ستون اور عقبی دیوار کے درمیانی فاصلے کا جائزہ لینے کے بعد وہ دو شہتیر اٹھا لائے، جو زیادہ بھاری نہیں تھے، ایک آدمی ایک شہتیر آسانی سے اٹھا سکتا تھا۔ شہتیر بالکل سیدھے اور لمبائی میں برابر تھے۔ ان کی موٹائی ایک سرے سے شروع ہو کر دوسرے سرے تک بدستور کم ہوتی چلی گئی تھی۔ موٹائی والے سرے پر عین درمیان میں اگر کسی پن سے ایک باریک نکتہ بنایا جائے تو وہاں سے ہر طرف ان کے بیرونی حصے کا فاصلہ تین تین انچ بنتا تھا۔ جب کہ دوسری سمت پر موٹائی بدستور کم ہوتی ہوئی اڑھائی اڑھائی انچ کے قریب رہ جاتی تھی۔ شہتیر عقبی دیوار پر رکھ کر عبداللہ خان نے شیر محمد کو چار دیواری کے اندر اترنے کا اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی پھرتیلا شیر محمد پھرتی سے نیچے اتر گیا اور ستون کو سہارا دینے والی لکڑیوں پر جا کھڑا ہوا۔ اس کے کاندھے ستون پر مضبوطی سے جمائی گئی سـری کو چھو رہے تھے جب کہ اس کی گردن اور سر اوپر فضا میں تھے۔ نور خان پـچھیـالی دیوار پر کھڑا جائزہ لے رہا تھا۔ جوں ہی اس نے دیکھا کہ شیر محمد اپنے پاؤں مضبوطی سے جما چکا ہے اس نے ایک شہتیر اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا۔ شیر محمد نے اپنے ہاتھ ہوا میں بلند کیے اور شہتیر کا پتلا سرا تھام لیا۔ اس نے شہتیر کے پتلے سرے کو T نما ستون کے اوپر رکھی سری پر جمایا۔ پھر نور خان نے اسے دوسرا شہتیر تھمایا اسے بھی اس نے پہلے شہتیر کے بالکل متوازی فٹ بھر کے فاصلے پر جما دیا اور پھر اپنی کمر کے گرد لپٹی ہوئی رسی کھول کر دونوں شہتیروں کو سری کے ساتھ باندھنے لگا۔ ادھر عبداللہ خان نے دونوں شہتیروں کے موٹے سروں کو عقبی دیوار پر جما کر اس کے گرد، پتھروں کے ردے جما دیے تا کہ وزن پڑنے پر وہ ادھر ادھر کھسک نہ پائیں۔ پھر سامنے والی دیوار اور ستون کے درمیان بھی اسی طرح کا

ٹِل باندھا گیا۔ پھر چاروں اپنی آستینوں کے کف پیچھے کہنیوں کی طرف لپیٹتے ہوئے، بھاری بھرکم کڑی کی طرف بڑھے۔عبداللہ خان اور نور خان کڑی کے ایک سرے پر جب کہ علی احمد اور شیر محمد دوسرے سرے پر جا کھڑے ہوئے۔چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا؛ بیک وقت نیچے جھکے اور اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے کڑی کو یک بارگی اٹھا کر پچھیالی دیوار پر اس طرح جمادیا کہ اس کا ایک سرا شہتیروں کے اوپر جب کہ دوسرا شمالی سمت میں وہاں تھا، جہاں پچھیالی دیوار ختم ہوتی اور بائیں طرف والی دیوار آ کر اس میں پیوست ہوتی تھی۔عبداللہ خان اور نور خان نے اپنے قدم ستون کو پچھیالی دیوار سے ملانے والے شہتیروں پر جب کہ علی احمد اور شیر محمد نے شمالی سمت والی دیوار پر مضبوطی سے جمائے۔لحہ بھر ستانے کے بعد، انھوں نے ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور بھاری کڑی کو آہستہ آہستہ آگے سرکانے لگے۔یہاں تک کہ اس کا ایک سرا شمالی دیوار کے عین وسط میں جب کہ دوسرا T کے نصف شمالی پر جا ٹکا۔چاروں کافی دیر تک اسے الٹا پلٹا کر ٹھیک طریقے سے جماتے رہے۔پھر انھوں نے دوسری کڑی کو بھی بالکل اسی طریقے سے ستون اور جنوبی سمت والی دیوار پر نصب کیا۔سورج اس وقت عین ان کے سروں کے اوپر آ چکا تھا اور فروری کے سرد ترین دن ہونے کے باوجود، ان چاروں کے کپڑے پسینے سے تر تھے۔البتہ ان کے چہروں پر اطمینان کا غازہ تھا۔

پھر ایک ایک کر کے وہ شہتیر اٹھاتے گئے اور ان کے پتلے سرے کڑیوں پر جب کہ موٹے دیواروں پر رکھتے گئے۔سورج ڈھلنے تک چاردیواری کے اوپر ایک جالا سا تن چکا تھا۔اگر چہ اس علاقے سے برف مکمل طور پر پگھل چکی تھی۔لیکن شام کی سرد ہواؤں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔انھوں نے سوکھی لکڑیاں مکان کے اندر ایک کونے میں جمع کیں اور الاؤ روشن کر کے سو گئے۔

اگلی صبح انھوں نے ان شہتیروں کے اوپر جھاڑ جھنکاڑ ڈال کر اس کے اوپر چیڑ کے باریک اور نوکیلے پتے بچھائے اور مٹی ڈالنا شروع کر دی۔شام تک وہ اس پر کئی من مٹی ڈال چکے تھے۔

اگلے دن انھوں نے مکان سے چشمے تک کا سروے کیا۔چشمہ مکان والے ٹیلے کی مشرقی سمت کچھ بلندی پر واقع ایک میدان کے سرے سے پھوٹتا تھا۔مکان والے ٹیلے اور میدان کے درمیان ایک؛ پندرہ سولہ فٹ چوڑی گسی (چھوٹا نالہ) تھی۔چشمے کا پانی میدان کے مغربی سرے سے، ایک آبشار کی صورت، گسی میں گر رہا تھا۔وہ کافی دیر، آبشار کے بالکل سامنے، گسی کے کنارے بیٹھے مایوسی سے پانی نیچے گسی میں گرتا دیکھتے رہے۔

''اگر یہ گسی درمیان میں نہ ہوتی تو پانی آسانی سے مکان تک پہنچایا جا سکتا تھا''۔عبداللہ

خان نے کہا۔

''ہاں۔لیکن پانی تو ہم بہر حال لے جا کر ہی چھوڑیں گے'' ۔نور خان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''تجھے کسی باولے کتے نے تو نہیں کاٹ لیا۔پانی بھی کبھی نشیب سے بلندی کی طرف چڑھا ہے؟''علی احمد طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔

''نہیں بھی چڑھا تو چڑھالیں گے'' نور خان نے کسی کے کنارے کھڑے ایک بڑے درخت کے تنے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیسی باتیں کر رہا ہے، پاگل تو نہیں ہوگیا تو؟'' عبداللہ خان کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

''یہ۔یہ مکان تک پانی لے کر جائے گا۔جاؤ۔کلھاڑی اور آرا اُٹھا کر لاؤ'' ۔نور خان نے کسی کے کنارے ایستادہ ایک درخت کی طرف ان تینوں کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔جس کے تنے پر مڈھ سے چوٹی تک ایک نالی سی بنی ہوئی تھی۔یہ نالی نما گھاؤ، مڈھ والے حصے میں، خاصا گہرا تھا، جو چوٹی کی سمت بدستور اتھلا ہوتا چلا گیا تھا۔بجلی اتنی تیز گری ہوئی تھی کہ گھاؤ والی سمت کے ڈال بھی اُڑ گئے تھے۔چاروں کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔

انھوں نے درخت کو کاٹتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا کہ جب وہ گرے تو اس کا چوٹی والا سرا کسی کے پار جا نکلے۔دوپہر تک کسی کے اوپر ایک پل سا بن چکا تھا، جس پر سے گزر کر وہ چشمے کے آگے نالی کھودنے میں مصروف تھے۔

تین دن بعد پانی درخت کے نالی نما گھاؤ سے گزر کر، مکان کے آگے کی ہموار زمین کو سیراب کرتا ہوا، دور نیچے کہیں بڑے کسی میں گر رہا تھا اور وہ چاروں لس مٹی کے گارے سے مکان کی لپائی میں مصروف تھے۔

اگلے سال انھی دنوں میں وہاں دس بارہ مکان ؛ اور ان کے ارد گرد اٹھارہ بیس کھیت تھے، جن میں گندم، جو اور سرسوں لہرا رہی تھی۔کوہ مَل کی پہاڑی سے دیکھنے پر ایسا لگتا تھا جیسے دور ایک پہاڑ کے دامن میں کسی نے اٹھارہ بیس زینے بنا رکھے ہیں، جن پر سبز مخملیں قالین بچھا ہوا ہے۔جس میں کہیں کہیں زرد رنگ نمایاں ہے۔

(۲)

فقیر محمد نے اپنی چادر، کوٹ اور رسہ، غار کے پتھریلے چبوترے پر رکھے اور کلھاڑی لے کر وہاں سے غائب ہوگیا۔ کچھ دیر تک اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی رہی، جس میں بھاری بوٹوں کے نیچے سوکھی لکڑیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں نمایاں تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ آوازیں کم ہوتے ہوتے سناٹے میں غائب ہوگئیں۔ پھر اچانک ساری وادی ٹھک۔ ٹھک۔ ٹھک کی زوردار آوازوں سے گونجنے لگی۔ یہ آوازیں غار کے آگے واقع گھنے جھنڈ میں سے آرہی تھیں۔ پھر ان آوازوں کے ساتھ ہا ہہ۔ ہاا ہہ۔ ہا اا ہہ کی آوازیں بھی شامل ہوگئیں۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں آوازیں؛ ٹھک ٹھک۔ ہاا ہہ۔ ٹھک ٹھک ہاا ہہ۔ ٹھک ٹھک ہاا ہہ۔ کے ایک مخصوص ردھم میں ڈھلتی گئیں اور لحہ بہ لحہ بلند ہوتی چلی گئیں۔ بلند ہوتے ہوتے، ایک وقت ایسا آیا، جہاں یہ دونوں آوازیں بالکل ایک ہوگئیں؛ ٹھک ہا۔ ٹھک ہا۔ ٹھک ہا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہارمونیم کی آواز گائیک کی اونچی لے کا پوری طرح ساتھ دے رہی ہے۔ پھر اچانک ان کے زور میں کچھ کمی واقع ہونا شروع ہوگئی اور یہ آوازیں دوبارہ بے ترتیب ہوتی گئیں۔ آہستہ آہستہ ان میں تھکاوٹ کے آثار پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ پھر یک دم یہ دونوں آوازیں بند ہوگئیں جن کا خلا تیز سانسوں کی آوازوں نے پُر کرنا شروع کردیا۔ پھر ایک سکوت سا چھا گیا۔

کچھ دیر بعد ان آوازوں سے ایک مرتبہ پھر وادی گونجنے لگی، جو دیر تک جاری رہیں۔ ان آوازوں کے عین عروج کے وقت ؛تڑ تڑ تڑ، کی ایک اور زوردار آواز پیدا ہوئی جس میں گڑگڑاہٹ بھی شامل تھی، اور پھر کان پھاڑ دینے والے ایک دھماکے کے ساتھ ایک بہت بڑا ' کاہو' کا درخت دھڑم سے زمین پر آگرا۔ جس نے ہزاروں سال پرانے اس غار پر تین ساڑھے تین سو سال مسلسل سایہ کیے رکھا تھا۔

سہ پہر کے وقت جب سورج ڈھلنا شروع ہوتا۔ اس کاہو کا سایہ بلند ہوتے پہاڑ کے ساتھ بتدریج بلند ہونا شروع ہو جاتا اور غروب کے وقت، غار کے چبوترے سے ہوتا ہوا پیچھے چیڑوں کے سائے سے جاملتا تھا۔

آج صبح سویرے، نورآباد میں، جسے آباد ہوئے دس سال ہونے کو آئے تھے، پہلی موت واقع ہوئی تھی۔

علی احمد جو اس بستی کے چار بنیادگزاروں میں سے ایک تھا، چل بسا تھا۔

وہ گزشتہ کئی دنوں سے بیمار تھا، اور اس دوران میں اسے ہر روز، تمبر، جل ککڑ، اور سنبل وغیرہ کے کاڑھے؛ اور بنفشے اور کالے پودینے کے قہوے دیئے جاتے رہے، لیکن افاقے کے بجائے اس کی طبیعت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔

کل جب اس کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو نورخان نے اپنے بیٹے فقیر محمد کو بلایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ باپ کا حکم سنتے ہی فرماں بردار بیٹے نے کاہو کے گھنے جنگل کی راہ لی۔ اس نے پورے جنگل کا سروے کرنے کے بعد تین قدیم ترین درختوں کو نشان زد کیا اور پھر ایک بڑے ٹیلے پر کھڑے ہو کر، جہاں سے نشیب میں پچاس گھروں پر مشتمل بستی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ ''اووو و۔ لالہ۔ لالہ اووئے۔ اووو و لالہ۔'' کا آوازہ بلند کیا۔ جو سامنے والے ٹیلوں اور عقب میں واقع پہاڑ کی چٹانوں سے ٹکرا کر، کافی دیر تک وادی میں گونجتا رہا۔ گونج کے ختم ہونے کے بعد سکوت کا ایک ہلکا سا وقفہ ہوا اور پھر نورخان کی طرف سے ''جی اوئے'' کا گونج دار آوازہ بلند ہوا۔ اس فضائی صوتی رابطے کے بعد فقیر محمد نے اسے اوپر وادی میں آنے کی دعوت دی تھی۔

آدھ پون گھنٹے بعد نورخان بستی کے دو اور آدمیوں کے ساتھ باری باری تینوں درختوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ تینوں درخت وادی کے مختلف حصوں میں تھے۔ معائنے کے بعد وہ ایک دوسرے سے مشورہ کرنے لگے۔ ایک رائے یہ تھی کہ نشان زد درختوں میں سے بستی کے قریب ترین والے درخت کو کاٹ لیا جائے تا کہ اسے بستی تک لے جانے میں آسانی رہے۔ لیکن نورخان نے اس رائے کو رد کرتے ہوئے حکمیہ انداز میں کہا:

''علی احمد اس بستی کا بزرگ ترین آدمی ہے۔ وہ میرے باپ کی جگہ ہے۔ خدا کرے اس کا سایہ تا دیر ہمارے سروں پر رہے۔ لیکن اس کی موت کی صورت میں، اس کی قبر کے تختے اس وادی کے بزرگ ترین کاہو کے تنے ہی سے نکالے جائیں گے۔ یہی ہماری صدیوں سے روایت رہی ہے۔ اور میرے جیتے جی یہ روایت نہیں ٹوٹ سکتی۔ ویسے بھی علی احمد کے بعد، عمر کے لحاظ سے، میں تم سب سے بڑا ہوں۔ لہٰذا میرا حکم ماننا تم پر فرض ہے۔'' یہ سنتے ہی تینوں نے تعظیماً سر جھکا لیے۔

درخت گرنے کی آواز کی گونج جب بستی میں پہنچی تو میت کے اردگرد بیٹھی خواتین، جو بین کر

رہی تھیں، یک دم چپ ہوگئیں۔ پھر لمحہ بھر کے وقفے کے بعد ایک دوسرے سے لپٹ کر زور زور سے رونے اور چلانے لگیں۔ جیسے علی احمد کی موت کے دکھ میں انھوں نے بستی کے ایک اور بزرگ کی موت کا دکھ بھی شامل کر لیا ہو۔

نور خان کی بیوی نے بین کرتے ہوئے کہا۔

''بہن! میں تو پرسوں شام کو ہی سمجھ گئی تھی کہ لالہ جی اب نہیں بچیں گے۔ جیسے ہی مغرب کی اذان بلند ہوئی تھی۔ گیدڑیوں نے منحوس آواز میں چلانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسی وقت فقیرے کے کاکا سے کہا کہ یہ گیدڑیاں ہیں۔ لیکن انھوں نے الٹا غصہ کیا اور کہنے لگے کہ تُو ان کی دائی لگی ہوئی ہے۔ گیدڑ بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

''ہاں بہن۔ میں نے بھی اُن کی منحوس آواز اپنے کانوں سے سنی تھی''۔ دو تین خواتین نے بیک وقت کہا۔

''میں نے تو کل دو بلیوں کو بھی سر جوڑ کر روتے ہوئے دیکھا۔ خدا خیر کرے''۔ ایک خاتون نے، اپنا پستان، اپنے شیر خوار بچے کے منہ میں دیتے ہوئے کہا۔

''ابھی صبح سویرے جب میں ادھر کو آ رہی تھی۔ میرا کتا آسمان کی طرف منہ کر کے بھونک رہا تھا۔ خدا خیر کرے کوئی اور مصیبت نازل نہ ہو''ایک خاتون نے، جس کا گھر بستی سے تھوڑا ہٹ کر تھا، سر سے کھسکی ہوئی چادر کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''خدا خیر کرے۔ خدا خیر کرے۔'' بیک وقت کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

''میں نے بڑوں سے سنا ہے کہ اکیلی قبر اچھی نہیں ہوتی۔ میں نے تو فقیرے کے ابا کو کہا بھی تھا کہ یہاں اکیلی قبر نہ بنائی جائے۔ ان کا جنازہ مارہ لے جائیں۔ لیکن وہ نہ مانے۔''نور خان کی بیوی نے رائے دی۔

''میں نے بھی شمیم کے کاکا کو یہی کہا تھا۔ کہنے لگے۔ کیسی باتیں کر رہی ہے۔ جہاں بستی، بستی ہے قبرستان بھی وہیں بستا ہے۔ آخر اس کی بنیاد بھی تو کسی نے رکھنی ہی ہوتی ہے۔''ایک اور عورت بولی۔

''ہاں بہن یہ بات تو ہے۔ آخر بستی کی بنیاد رکھنے والا ہی قبرستان کی بنیاد بھی رکھ رہا ہے۔'' خانی زمان کی بیوی بولی۔

مکانوں کے پچھواڑے، قبر کھودنے میں مصروف لوگوں میں سے چار جوانوں نے درخت گرنے کی آواز سنتے ہی؛ چادریں، رسے اور آرے اٹھا لیے اور نور خان کے اشارے کا انتظار کرنے

لگے۔نور خان؛ عبداللہ خان کو کنارے لے جا کر اس سے کچھ صلاح مشورہ کرنے لگا۔اس دوران میں دونوں کی نظریں بار بار آسمان کے مغربی افق کی جانب اُٹھ رہی تھیں؛اور ہر بار کے دیکھنے سے،ان کے چہرے پر تشویش کی لکیریں مزید گہری ہوتی جاتی تھیں۔

قبر کھودی جا چکی تھی۔نور خان نے قبر کے سرھانے والی سمت کھڑے ہو کر اس کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا۔کھرپی لے کر اس کے اندرونی کنارے میں گھونپی،جیسے ہی اس نے کھرپی کو واپس کھینچا مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا قبر کے اندر لڑھک گیا اور وہاں ایک سوراخ سا ہو گیا۔

"زمین کے اندرونی حصے کی مٹی بھربھری اور کچی ہے،جب قبر پر تختے رکھ کر مٹی ڈالی جائے گی تو زمین ان کا بوجھ نہیں سہہ پائے گی اور بیٹھ جائے گی۔لہٰذا قبر کو مزید چوڑا کر کے اس کے اندر چاروں طرف پتھروں کے ردے جمائے جائیں۔"نور خان نے حکم دیتے ہوئے کہا۔اس کا حکم سنتے ہی،وہاں کھڑے لوگوں میں سے کچھ نے اپنی چادروں کے منڈاسے بنائے اور ادھر ادھر سے پتھر اُٹھا کر قبر کے پاس جمع کرنے لگے۔جب کہ نور خان،تینوں جوانوں کو ساتھ لے کر اوپر جنگل کی سمت روانہ ہو گیا،جو پہلے ہی سے تیار کھڑے تھے۔

یہ ساون کے دن تھے،آسمان پر ہر طرف گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔باوجود اس کے کہ دن کا پہلا پہر گزر رچکا تھا سورج کا کہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔مغربی افق سے سیاہ بادلوں کا ایک پہاڑ شرقی افق کی جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا،جو سورج کے لواخ (مدھم روشنی) کو مزید مدھم کر رہا تھا۔

نور خان،باقی تینوں ساتھیوں سمیت وادی میں موجود دو بڑی چٹانوں کے درمیان واقع ایک گڑھے کے قریب پہنچ چکا تھا۔جہاں سے کچھ ہی فاصلے پر،اوپر،ایک بہت بڑا کاہو کئی چھوٹے درختوں کو دبوچے زمین پر پڑا تھا۔نور خان کا سانس پھولا ہوا تھا وہ باقی تینوں کو درخت کی طرف جانے کا اشارہ کر کے خود وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔اشارہ پاتے ہی وہ تینوں پھرتی سے چڑھائی چڑھنے لگے۔کچھ دیر بعد جب نور خان گرے ہوئے درخت کے پاس پہنچا تو وہ سب؛کاہو کے گول تنے کو اس کے بڑے ڈالوں سے الگ کر چکے تھے اور اب اسے درمیان سے دو ٹوٹوں میں تقسیم کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔نور خان نے اپنی نگرانی میں اس کے دو ٹوٹے کروائے۔اب یہ موٹا گول تنا پانچ پانچ فٹ لمبے دو گول پہیوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔نور خان کی ہدایت پر اس کا بیٹا فقیر محمد نشیب میں واقع دو بڑی چٹانوں کی طرف بھاگا اور جنوبی سمت والی چٹان پر کھڑے ہو کر بلند آواز میں پکارا:

"نیچے کوئی ہے ہے ہے۔"

"نیچے کوئی ہے ہے ہے۔"

"نیچے کوئی ہے ہے ہے۔"

دیر تک اس کی آواز نشیبی جنگل میں گونجتی رہی۔

جب جواباً کوئی آواز نہ ابھری تو وہ دوبارہ چڑھائی چڑھنے لگا اور کچھ ہی دیر میں واپس ان کے پاس پہنچ گیا۔

پھر نور خان نے انھیں کوئی اشارہ کیا، اشارہ پاتے ہی انھوں نے اپنی کلھاڑیوں کے دستے تنے کے ایک ٹوٹے کے نیچے لیٹائے اور پھر آہستہ آہستہ انھیں اوپر کو اُٹھانے لگے۔ بھاری ٹوٹا دستوں پر سے پھسلتا ہوا، ایک ایسے پہیے کی صورت، جسے بلندی سے نیچے لڑھکا دیا جائے، رستے میں آتی جھاڑیوں اور درختوں کو روندتا ہوا؛ جب کہ بڑے درختوں سے ٹکراتا اور ان کے بیچ سے رستہ بناتا ہوا، تیزی سے نیچے بستی کی طرف لڑھکنے لگا۔ کچھ دیر بعد اسی بنے ہوئے رستے پر، کاہو کا دوسرا ٹوٹا بھی بھاگ رہا تھا اور وادی میں آگے پیچھے گڑگڑاہٹ کی دو بھاری آوازیں گونج رہیں تھیں۔ ان بھاری آوازوں کے ساتھ کچھ ہلکی آوازیں بھی تھیں۔ جو لڑھکتے ہوئے پتھروں کی تھیں۔

دونوں تنے کچھ ہی دیر میں بستی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک میدان میں بالکل عریاں حالت میں پڑے تھے۔ ان کی چھال کا سیاہ لباس، دور پیچھے کہیں پتھروں کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔

نیچے بستی میں کھڑے لوگوں نے دیکھا کہ غار کے دہانے سے نیچے میدان تک جنگل میں ایک راستہ سا بنا ہوا ہے، جس پر چار یا پانچ لوگ نیچے بستی کی طرف چلے آرہے ہیں۔

ابھی وہ دونوں چٹانوں کے درمیان واقع گڑھے کے قریب پہنچے تھے کہ انھیں بارش اور آندھی نے آلیا۔ بارش اتنی شدید تھی کہ میدان میں اترنے تک کسی کو پار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ کسی پر پڑے ہوئے چیڑ کے اس دیوقامت درخت پر سے گزر کر بستی میں داخل ہوئے، جس میں بنی ہوئی نالی، بستی کو پانی سپلائی کر رہی تھی۔

"علی احمد بہت نیک آدمی تھا۔" شلوار کے پائنچے اُڑسے، سروں پر بوریوں کے منڈاسے رکھے، ایک مکان کے پرنالے کے نیچے سے گزرتے ہوئے، دو آدمیوں میں سے، ایک نے، دوسرے سے کہا۔

"ہاں خان محمد۔ تبھی تو رحمت برس رہی ہے۔ پچھلے سال تو بادل اللہ نے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ حالاں کہ میں نے اپنے بیٹے کے رخساروں پر، کالک مَل کر، اسے پوری بستی میں گھمایا

تھا۔'' پہلے آدمی نے کہا۔

''وہ تو خدا بھلا کرنے نور خان کا، جس نے بری امام جا کر ایک پوری دیگ چڑھائی تھی۔ تب جا کر تھوڑی بہت بارش ہوئی اور ہم نے بوائی کی۔ ورنہ تو ہم بھوکے مر رہے ہوتے۔'' دوسرا گویا ہوا۔ وہ اس گھر کی طرف جا رہے تھے، جہاں علی احمد کی میت پڑی تھی۔

تیز بارش کے باعث قبر کی چنائی اور درخت کی چیرائی کا کام وقتی طور پر روک دیا گیا۔ تمام لوگ میت والے گھر جمع ہو کر بارش رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر بارش تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''خدا خیر کرے۔ اتنی تیز بارش اچھی نہیں ہوتی۔ ہلکی بارش مہینہ بھر بھی لگی رہے تو مائی زمین اسے اپنے اندر اتار لیتی ہے۔ لیکن تیز بارش میں پانی زمین کے اندر نہیں جاتا۔ الٹا فصلیں بھی بہا کر لے جاتا ہے۔''عبداللہ خان نے تشویش کے انداز میں کہا۔

''ہاں۔ اور زمین کی زرخیزی کو بھی۔'' نور خان نے سامنے ٹیلے پر نظریں گاڑھتے ہوئے کہا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے نالوں کا پانی جمع ہو کر ایک بڑی چٹان کے اوپر سے ایک آبشار کی صورت نیچے گر رہا تھا۔

''عصر ہو چکی ہے۔ اگر اب بارش نہ رکی تو آج تدفین نہیں ہو سکے گی۔ ابھی تو قبر کا بھی خاصا کام رہتا ہے اور تختوں کی چیرائی تو ابھی شروع بھی نہیں ہوئی۔''عبداللہ خان نے بات آگے بڑھائی۔

''خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ وہ جو کرتا ہے اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔'' نور خان نے کہا۔

اتنے میں فقیر محمد نے اپنی قمیص اتار کر الٹی پہنی اور باہر بارش میں نکل گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی کئی دوسرے لوگ بھی اپنی قمیصیں الٹی پہن کر تیز بارش میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ وہ گھنٹہ بھر بارش میں ٹہلتے رہے، اور بارش بدستور جاری رہی۔

''بوستان! جاؤ وہاں سے مٹی کی کھاری بھر کر لاؤ۔'' ایک سفید ریش بزرگ نے ایک نوجوان کو حکم دیتے ہوئے کہا۔

''اچھا کاکا جی۔'' یہ کہہ کر وہ توت کی پتلی شاخوں سے بنی ٹوکری اٹھا کر مکان کے پچھواڑے کی طرف چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں مٹی کی ٹوکری بھر کر لے آیا، جو بارش کے باعث گارا بنی ہوئی تھی۔ اس

نے ٹوکری بزرگ کے آگے رکھی اور مکان کے پرنالے کے نیچے ہاتھ دھونے چلا گیا۔

"بزرگ نے مٹی کو مٹھی میں بھینچ کر چھوٹے چھوٹے پتلے بنائے اور فقیر محمد کو بلا کر کہا:

"جاؤ انھیں چھت پر رکھ آؤ۔ دھیان رکھنا ٹوٹ نہ جائیں۔ اور ہاں سنو۔ انھیں پانی میں نہ رکھنا۔ بنیرے پر رکھنا تا کہ آہستہ آہستہ گھلیں۔"

فقیر محمد نے ایک دو اور لڑکوں کو اشارہ کیا؛ اور وہ سب پتلے اٹھا کر مکان کے پچھواڑے کی سمت چل پڑے، جہاں سے مکان کی چھت زمین کے برابر تھی۔ دونوں مکانوں کے بیچ میں راستہ ہلکا سا ڈھلوانی ہو کر چھت پر جا نکلتا تھا۔ اچانک ایک لڑکے کا پاؤں پھسلا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پانچ پتلوں میں سے دو ٹوٹ گئے۔ فقیر محمد نے اس کی طرف دیکھا اور غصے سے کہا: "اندھا ہو گیا ہے۔ دیکھ کر نہیں چلتا؟ توڑ دیئے نا آخر!" یہ سن کر لڑکا کچھ سہم سا گیا اور ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا چھت پر آ گیا۔

بارش یک دم تیز ہو گئی۔ مگر فقیر محمد نے کسی قسم کی جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ اس نے انتہائی احتیاط سے پہلے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتلوں کو بنیرے پر رکھا۔ پھر باری باری دوسرے لڑکوں کے ہاتھ سے پتلے لے کر انھیں بنیرے پر سجاتا گیا۔ ان نے یہ کام پورے انہماک اور تن دہی سے کیا۔

"میرا خیال ہے مغرب کی نماز پڑھ لی جائے۔ وقت ہو گیا ہوگا۔" نور خان نے کہا۔

"ہاں۔" کئی لوگوں نے بیک وقت کہا۔

بڑے برآمدے میں پڑی چارپائیاں ایک طرف کھڑی کر کے پھوہڑیاں بچھائی گئیں اور پتلے بنانے والے بزرگ کی امامت میں نماز ادا کی جانے لگی۔

نماز کے بعد خدا کے حضور گڑگڑا کر بارش رکنے کی دعا مانگی گئی۔ دوسرے کمرے میں، میت کے پاس بیٹھی ہوئی خواتین نے بھی، اس دعا پر، بلند آواز میں آمین کہی۔

نماز کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ اب اگر بارش رک بھی گئی تو تدفین کل ہی کی جائے گی۔ کیوں کہ کیچڑ اور اندھیرے کی وجہ سے اب قبر تیار کرنا مشکل ہے۔

"بابا! میری ماں کہہ رہی ہے کہ اس پر سات گنجے لوگوں کے نام لکھ کر دو، تا کہ انھیں بارش میں بہایا جائے۔" ایک نوجوان لڑکی نے کاغذ کا ٹکڑا اور ایک دوات، جس میں مور کا پنکھ رکھا ہوا تھا، نور خان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

نور خان نے کاغذ اور پنکھ والی دوات لڑکی کے ہاتھ سے لی اور پنکھ سیاہی میں ڈبو کر لکھنے لگا:

''جمیل خان ۔رسول بخش ۔ڈھمی خان ۔غزنی خان ۔جان محمد ۔عبداللہ خان ۔نور خان ۔''

نام لکھ کر وہ تھوڑی دیر ان پر پھونکیں مارتا اور کچھ پڑھتا رہا ۔پھر کاغذ اور دوات لڑکی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا :''ماں سے کہنا کہ انھیں بارش میں ڈالنے سے پہلے اچھی طرح سے سکھا لے؛ اور دیکھنا، احتیاط سے لے کر جانا، ایسا نہ ہو سیاہی پھیل جائے ۔''

''اچھا بابا ۔'' کہہ کر لڑکی نے کاغذ اور دوات نور خان کے ہاتھ سے لے لی اور کمرے سے نکل گئی ۔

عشا کے وقت انھوں نے میت کمرے سے نکال کر باہر رکھ دی تا کہ جس کی وجہ سے لاش خراب نہ ہو ۔

لوگ آہستہ آہستہ اُٹھ کر اپنے گھروں کو جانے لگے ۔رات کا دوسرا پہر شروع ہونے تک بیشتر لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے ۔بارش بدستور جاری رہی ۔

اکثر لوگ، خاص کر احمد علی کے قریبی عزیز گزشتہ رات سے مسلسل جاگ رہے تھے ۔نصف رات کے قریب تمام لوگ سو گئے ۔صرف فقیر محمد اور خان محمد جاگ رہے تھے، جو باہر رکھی میت کی رکھوالی کر رہے تھے، تا کہ کوئی کتا یا جنگلی جانور اس کے پاس نہ پھٹکنے پائے ۔

رات کے پچھلے پہر بھاری لکڑیوں کے ٹوٹنے کی آواز پوری بستی میں گونجی اور ساتھ ہی دھڑم کا زوردار دھماکا ہوا؛ اور ایک ساتھ تمام لوگ مارے خوف کے اُٹھ بیٹھے اور کلمے کا ورد کرتے ہوئے دھماکے کی سمت کا تعین کرنے لگے ۔

بستی کے عین وسط میں نور خان کا مکان جو اس بستی کا سب سے پہلا مکان تھا اور جس کی تعمیر میں علی احمد نے بھی بنیادی کردار ادا کیا تھا، زمین بوس ہو چکا تھا ۔علی احمد مرحوم کا گھر اگر چہ کچھ فاصلے پر تھا ۔لیکن اس کے گرنے کا اندازہ سب سے پہلے فقیر محمد ہی کو ہوا، جو دھماکے سے پہلے میت کے پاس بیٹھا اونگھ رہا تھا ۔دھماکے کی آواز سنتے ہی، فقیر محمد اپنے گھر کی طرف بھاگا ۔خان محمد اس کے پیچھے پیچھے تھا ۔

فقیر محمد جس کی شادی کو ابھی چار پانچ ہی سال ہوئے تھے ۔اپنی بیوی اور تقریباً دو سال کے بچے کو، ابھی ایک پہر پہلے خود گھر چھوڑ کر آیا تھا، اس کی ماں اور چھوٹی بہن، جس کی حال ہی میں منگنی ہوئی تھی، پہلے ہی گھر چلی گئی تھیں ۔

گھر پہنچنے تک فقیر محمد کے حواس اپنا کام چھوڑ چکے تھے، مکان زمین پر ڈھیر ہوا پڑا تھا ۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے ۔وہ لاشعوری طور پر مکان کے اس کونے کی طرف بھاگا، جہاں اس کی بیوی کی چارپائی تھی ۔

''جلدی آؤووو۔ بابے کے مکان کی طرف آؤووو۔ بابا نور خان کا مکان گر گیا ہے۔'' خان محمد گرے ہوئے مکان پر کھڑے ہو کر چلایا۔

خان محمد کا آوازہ ٹیلوں اور عقبی پہاڑ کی چٹانوں سے ٹکرا کر بستی میں گونجا تو ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دینے والے اندھیرے اور نہ تھمنے والی بارش میں بھی ہر آدمی کے قدم تیزی سے نور خان کے مکان کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ گرتے، اٹھتے، سنبھلتے کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ گئے۔

نور خان نے، جو اس وقت میت والے گھر کے صحن میں تھا، جب آوازہ سنا تو لمحہ بھر کے لیے سکتے میں آ گیا۔

''خدا خیر کرے گا۔'' عبداللہ خان نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

''خدا خیر کرے گا۔ جو اس کی مرضی۔'' نور خان نے ڈبڈبائی ہوئی آواز میں کہا، جس میں اندر کو گرتے آنسوؤں کی نمکینی بخوبی محسوس کی جا سکتی تھی۔

جب نور خان اور عبداللہ خان وہاں پہنچے تو بستی کے تقریباً تمام لوگ حتیٰ کہ بیشتر خواتین بھی وہاں پہنچ چکی تھیں۔ خواتین نے رونا اور چلانا شروع کر دیا جب کہ مرد حواس باختہ ہو کر گرے ہوئے مکان کو دیکھ رہے تھے۔ انھیں یہ سب خواب سا لگ رہا تھا۔

''یہاں کھڑے منہ دیکھتے رہو گے۔ جاؤووو۔ اپنے اپنے گھروں سے گینتیاں بیلچے اور لالٹینیں اٹھا کر لاؤ'' عبداللہ خان دھاڑا۔

سب لوگ اپنے گھروں کی طرف بھاگے۔ تھوڑی ہی دیر میں روشنیاں مکانوں کے دروازوں سے نکل کر بستی کے کھیتوں، اونچے نیچے ٹیلوں اور گلیوں میں بھاگنے لگیں۔ تمام روشنیوں کا رخ بستی کے مرکز کی طرف تھا۔ اگر فضا سے کوئی اس منظر کا نظارا کرتا تو اسے محسوس ہوتا، جیسے کسی کہکشاں کو کوئی بلیک ہول نگل رہا ہے اور اس کے تمام ستارے، جو اس کے مرکز کی طرف بھاگ رہے ہیں، اگلے چند ہی لمحوں میں ایک جگہ ڈھیر ہو کر اندھیرے کا حصہ بن جائیں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام روشنیاں، اندھیرے میں ڈوبی ہوئی بستی کے عین وسط میں جمع ہو گئیں اور ٹھک ٹھک کی ویسی ہی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں جیسی سات پہر پہلے اوپر بڑے پہاڑ کے دامن میں واقع غار کے آگے سے بلند ہو رہی تھیں۔ البتہ ان آوازوں کی کوئی خاص ترتیب نہیں تھی، نہ ہی ان میں تھکن کے کوئی آثار تھے۔ چیخنے چلانے اور دوسری انسانی آوازوں کا شور وغل بھی انھیں اُن آوازوں سے ممیز کر رہا تھا۔

(۳)

بارش بستی والوں پر عذاب بن کر نازل ہوئی تھی۔

ابھی تک وہ لمحہ بھر کے لیے بھی نہیں رکی تھی۔جس کی وجہ سے گرے ہوئے اس مکان کی مٹی اور ملبا ہٹانے میں انھیں بہت دشواریوں کا سامنا کر پڑ رہا تھا۔مگر وہ گزشتہ تین، چار گھنٹوں سے مسلسل اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ابھی وہ گرے ہوئے مکان کی چھت کے ایک سرے سے بھی پوری طرح مٹی نہیں ہٹا پائے تھے کہ صبح کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے اور لالٹینوں کی روشنیاں مدھم ہوتی چلی گئیں۔

شمالی کونے میں مٹی کے نیچے ایک شہتیر کا سرا نظر آیا تو بہت سے لوگوں نے مل کر یا اللہ مدد کا نعرہ بلند کیا اور شہتیر کے نیچے ہاتھ ڈال کر اکٹھا زور لگایا۔جیسے ہی وہ کچھ اوپر اٹھا۔چار پانچ لوگوں نے بیٹھ کر اپنے کاندھے اس کے نیچے گھسا دیے اور پھر آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔جوں جوں وہ اٹھتے گئے مٹی اوپر سے پھسلتی گئی اور ملبا بھی پیچھے ہٹتا چلا گیا۔

''ٹھہرو۔ٹھہرو۔''غزنی خان چلایا۔سب اپنی اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔

''وہ زندہ ہیں۔ابھی مجھے رونے کی آواز آئی ہے۔''غزنی خان نے کہا۔

اتنے میں مکان کے اندر سے دوبارہ آواز ابھری۔سب نے شہتیر اٹھنے سے بننے والے چھوٹے سے شگاف کی طرف کان لگا دیے۔اندر سے بچے کے رونے کی آواز آنے لگی۔یہ آواز فقیر محمد کے کانوں تک بھی پہنچی۔جو پچھلے چار گھنٹوں سے گم سم کھڑا تھا اور ابھی تک نہ تو اس نے کسی سے کوئی بات کی تھی اور نہ ہی کسی کام کو ہاتھ لگایا تھا۔اگر کسی نے گلے لگا کر اس سے ہمدردی کا اظہار بھی کیا تو جواباً نہ تو اس کے منہ سے کوئی لفظ نکلا تھا اور نہ ہی آنکھوں سے آنسو۔اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے خالی اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کا خالی پن تھا۔وہ بس ٹک ٹکی باندھے لوگوں کو مٹی اور ملبا ہٹاتے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔

بچے کے رونے کی آواز جیسے ہی اس کے کانوں میں پڑی۔پہلے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا؛ اور پھر بھاگ کر آیا اور شگاف والے کونے سے جلدی جلدی مٹی ہٹانے لگا۔کئی لوگوں نے اسے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی ،لیکن اس نے انھیں پیچھے دھکیل دیا اور گرے ہوئے مکان کے جنوبی کونے پر قبضہ جما

لیا۔باقی لوگ دوسری طرف سے ملبا ہٹانے لگے۔

بچے کے رونے کی آواز آنے کے بعد ملبا ہٹانے کے کام میں یک دم تیزی آ گئی۔ایسی تیزی جس میں ایک خاص طرح کی احتیاط بھی شامل تھی۔ جوں جوں ملبا ہٹ رہا تھا بچے کے رونے کی آواز واضح ہو رہی تھی۔گینتیوں اور بیلچوں کی آوازوں کے ساتھ:''ذرا دیکھ کے۔ذرا احتیاط سے۔دیکھنا دیکھنا۔مٹی نیچے نہ گرے۔'' جیسی آوازیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔

البتہ فقیر محمد ان سب سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھا اور اس کے کام کی رفتار دوسروں سے کئی گنا تیز تھی۔جوں ہی شگاف چوڑا ہوا فقیر محمد لیٹ کر ملبے کے نیچے گھس گیا۔اگلے چند لمحوں میں لوگوں نے دیکھا کہ وہ بچے کو سینے سے لگائے،اپنا سر شگاف سے باہر نکال رہا ہے۔بارش پھر تیز ہو گئی تھی۔ایک بزرگ نے اپنا پٹوا تار کر فقیر محمد کی طرف بڑھایا،جس میں اس نے بچے کو لپیٹا اور تیزی سے ساتھ والے مکان کی طرف بھاگ نکلا۔بچہ جو پہلے رو رہا تھا اس کے بازوؤں میں آتے ہی خاموش ہو گیا۔جیسے اسے گہری نیند نے آلیا ہو۔کئی اور لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔

بچے کے زندہ سلامت برآمد ہونے کے بعد کام میں مزید تیزی آ گئی؛اور اگلے چند منٹوں میں وہ سب مل کر نور خان کی بیوی،بیٹی اور بہو کی لاشیں باہر نکال لائے۔بچہ اپنی ماں کی چارپائی کے نیچے چادر کے جھولے میں تھا،جو کاہو کی لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔مکان گرا تو اس کے کچھ شہتیر فقیر محمد کی بیوی کے جسم کو کچلتے ہوئے۔چارپائی کے اوپر اٹک گئے جس سے وہ معجزانہ طور پر بچ گیا تھا۔

دن نکل چکا تھا مگر سورج کا کہیں نام و نشان نہیں۔

بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی اور ادھر بستی والوں کے سر پر تین مزید قبروں کا ملبا آن گرا۔دوپہر تک وہ بارش رکنے کا انتظار کرتے رہے۔

''لاش پھول گئی ہے؛اور اس کے منہ اور ناک سے خون آ رہا ہے''۔خان محمد نے نور خان کے گھر میں داخل ہوتے ہی گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔وہ علی احمد کے گھر سے بھاگ کر ابھی یہاں پہنچا تھا۔جب سے یہ سانحہ ہوا تھا۔سب بستی والے نور خان کے گھر میں گرے ہوئے مکان کے ساتھ والے بڑے کمرے اور برآمدے میں جمگھٹا کیے ہوئے تھے۔صرف خان محمد، غزنی خان اور گھر کی کچھ خواتین علی احمد کی لاش کے پاس تھیں۔ملبے سے تین لاشوں کی برآمدگی کے بعد علی احمد کے کفن دفن کا کسی کو ہوش ہی نہیں رہا تھا۔

سب نے فیصلہ کیا کہ بارش رکنے کا انتظار کرنے کے بجائے فوری طور پر کسی نہ کسی طرح علی

احمد کی لاش کو آج ہی دفنانے کا بندوبست کیا جائے۔ سوائے نور خان اور اس کے قریبی عزیزوں کے، سب لوگ مکانوں کے پیچھے گزشتہ روز کھودی گئی قبر کی طرف چل دیے۔ جو ایک جبڑ (چھوٹا تالاب) کا منظر پیش کر رہی تھی۔ پہلے چاروں طرف نالیاں کھودی گئیں تاکہ مزید پانی اس جبڑ نما قبر میں نہ گرے۔ پھر گھڑوں اور کٹوروں کے ذریعے قبر سے پانی نکالنے کا کام شروع کر دیا گیا۔ لیکن تیز بارش کی وجہ سے جلد ہی اس میں دوبارہ پانی بھرنا شروع ہو گیا۔ پہلے قبر کی اندر سے چنائی نہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا پھر باہمی مشاورت سے طے پایا کہ کاہو کی چیرائی کی صورت میں شام تک تدفین ممکن نہیں ہو سکے گی لہٰذا قبر پر کاہو کے تختے ڈالنے کے بجائے گرے ہوئے مکان کے شہتیر کاٹ کر ڈال دیے جائیں۔ دو جڑے ہوئے مکانوں کے برآمدے میں جنازہ پڑھا گیا اور قبر کے اندر خشک گھاس بچھا کر علی احمد کی لاش فوراً قبر میں اتار دی گئی۔ تدفین کے بعد سب لوگ نور خان کے گھر میں جمع ہو گئے اور رات گزرنے اور بارش رکنے کا انتظار کرنے لگے۔

رات تو گزر گئی مگر بارش برقرار رہی۔

دوپہر کے وقت میتوں والے کمرے سے مختلف آوازیں بلند ہونے لگیں۔

"یہ تو جمعرات کی جھڑی ہے، جمعرات ہی کو رکے گی۔ جنازے اتنے دن نہیں رکھے جا سکتے۔ کچھ کرنا ہو گا۔"

"اتنی تیز بارش میں قبریں کیسے تیار ہوں گی۔"

"مائی زمین کے اندر اب ایک قطرے کی بھی گنجائش نہیں۔ جو قطرہ گرتا ہے، تیر جاتا ہے۔"

"گینتی کا پھل زمین میں گھونپو تو واپس نکالنے سے پہلے سوراخ پانی سے بھر جاتا ہے۔"

"لیکن کوئی صورت تو نکالنی ہو گی۔"

"صورت کہاں سے نکلے گی بھائی ایک قبر کھودنی بھی مشکل ہے اور ادھر تین جنازے پڑے ہیں۔"

"ہمت کریں کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔"

"اب جنازوں کو سڑتا ہوا تو نہیں دیکھ سکتے۔"

"چلو اٹھو"

"چلو"۔

سب نے گینتیاں، کدالیں، بیلچے اور پھاوڑے اٹھا لیے اور مکانوں کے پیچھے ایک بڑے کھیت کے مغربی سرے پر واقع علی احمد کی قبر کی طرف چل پڑے۔ قبر کے اردگرد تالاب سا بن چکا تھا۔

سب سے پہلے پانی کی نکاسی کا انتظام کیا گیا۔ پھر مرلہ بھر جگہ کے چاروں طرف نالیاں کھودی گئیں تاکہ اس قطعے کے اندر پانی داخل نہ ہو سکے۔ گرے ہوئے مکان کے شہتیر اٹھا کر لائے گئے جنھیں منتخب جگہ کے چاروں کونوں میں عمودی طور پر نصب کیا گیا اور ان کے اوپر موٹے ترپال ڈال کر تین قبروں کی کھدائی شروع کر دی گئی۔

شام کے وقت، علی احمد وہاں اکیلا نہیں تھا۔ نور خان کی بیوی، بیٹی اور بہو بھی ان کے پہلو میں سو رہی تھیں؛ اور بستی کے مکینوں کو یوں لگا جیسے ایک بہت بڑا بوجھ ان کے سر سے اتر گیا۔

اگلے پانچ چھ دنوں میں بہت سی بھیڑ بکریوں اور مال مویشوں کے علاوہ بہت سا اسباب بھی بارش اور سیلاب کی نذر ہو گیا۔ مگر بستی والوں کو جنازے دفنانے ہی سے فرصت نہیں تھی۔ بارش کے اختتام تک مکانوں کے پیچھے بڑے کھیت میں تیرہ قبروں کا مزید اضافہ ہو چکا تھا اور نور خان کے گرے ہوئے مکان کے شہتیر بھی ختم ہو چکے تھے۔ اسی کھیت کے شرقی سرے پر صدیوں پرانے کاہو کے دو موٹے اور بھاری ٹوٹے، جن کی چھال اتری ہوئی تھی، بارش میں نہا رہے تھے۔

بستی پر نظر نہ آنے والی موت کے سائے چھائے ہوئے تھے کہ نویں روز عصر کے وقت مغربی سمت سے بادل کے بڑے پہاڑ میں ایک شگاف پڑنا شروع ہوا۔ آسمان پر نیلاہٹ بکھرنے لگی اور زمین پر آفتابی کرنوں کی پیلاہٹ۔ جوں جوں بادل چھٹتے گئے توں توں موت کے خوفناک سائے بستی پر سے ہٹتے گئے۔

بارش کا عذاب ٹلنے کے چوتھے روز؛ ناڑہ نیلاں سے ایک آدمی یہاں کے سوگوار لوگوں کے لیے ایک خوش خبری لایا۔ اس نے بستی والوں کو بتایا:

''پہاڑوں کے اس پار ہزارہ کے میدان میں زبردست سیلاب آیا۔ جس سے سکھ افواج کا بھاری جانی و مالی نقصان ہوا۔ سکھ افواج، جو مسلمانوں کا قتل عام کر رہی تھیں، اس کی بندوقیں، نیزے، بھالے، تلواریں، گھوڑے، اونٹ حتیٰ کہ ہاتھی اور توپیں بھی بارش بہا کر لے گئی۔ بیسیوں فوجی بھی ڈوب مرے۔ جو بچ گئے انھیں طرح طرح کی بیماریوں نے آ لیا ہے۔''

یہ خبر سنتے ہی بستی والوں کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے۔

''میں نہیں کہتا تھا۔ خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔'' نور خان نے دور آسمان کی نیلاہٹوں میں گھورتے ہوئے کہا۔ اور بستی والوں کو یقین ہو گیا کہ گزشتہ نو روز، بارش نہیں رحمت برستی رہی تھی۔

(۴)

''۱۲ جون ۱۸۴۹ء۔ آج میں ناڑہ نیلاں میں آیا ہوں۔ یہ میاں جانی کی چوکی کے سرے پر واقع ہے۔ پہلے میں یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ بلندی پانچ ہزار فٹ ہے، لیکن اس کے مناظر معمولی، غیر دلچسپ، مثلِ شیروان، ڈنہ، سری کوٹ، سری بنگ، ماڑی، جموں اور مچ ہیں۔''☆

جیمز ایبٹ نے اپنی ڈائری میں اتنا ہی لکھا تھا کہ بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ وہ کافی لمبا اور کٹھن سفر کر کے یہاں پہنچا تھا اور اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے۔

ہزارہ میں وہ پہلی بار آج سے تین سال پہلے، سرحد کھڑ، گندگر، خان پور اور جموں کی سرحدات کی حد بندی کے سلسلے میں آیا تھا۔ دوسری بار وہ دو سال پہلے، ریاست جموں اور ملکِ لاہور کے درمیان حد بندی کے لیے یہاں آیا تھا۔ یہ کام اس نے چند ہی مہینوں میں مکمل کر لیا۔ جس کے فوراً بعد اسے حاکمِ ہزارہ سردار چتر سنگھ کا مشیر مقرر کر دیا گیا۔ بظاہر وہ اس کا مشیر تھا، لیکن عملاً وہی حکمران تھا، ہزارہ میں افواج کی نقل و حرکت، ان کی تنخواہ کی ادائیگی، مالیہ اور دیگر واجبات کی وصولی اور خزانے کا انتظام اسی کے حکم سے چلتا تھا، عدالت کا نظام بھی براہِ راست اسی کے ماتحت تھا۔ یہاں تک کہ پشاور میں متعین انگریز افسروں کا بھی وہی مشیر تھا۔ اس دوران میں اس نے ہزارہ کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ قلعے مرمت کروائے، اور ملک کی کتب ہائے مالیہ مقرر کیں۔ انھی دنوں میں مولراج حاکم ملتان نے بغاوت کر دی۔ جیسے ہی اس کی خبر ہزارہ میں پہنچی، یہاں کی فوج نے بھی سردار چتر سنگھ کے ایما پر بغاوت کر دی۔ جس کے نتیجے میں ان دونوں میں آویزش شروع ہو گئی۔

ایبٹ عام لوگوں میں بہت جلد گھل مل جاتا تھا، وہ ہر آدمی کی شکایات پوری توجہ سے سنتا؛ اور اس کے ازالے کی پوری کوشش کرتا تھا اس لیے دو سالوں کے انتہائی مختصر عرصے میں اس نے سکھوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کے دل جیت لیے۔ مختلف قبیلوں کے سرداروں سے لے کر عام آدمی تک، لوگوں کی اکثریت اس پر؛ اور وہ لوگوں پر اعتبار کرنے لگا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ آویزش شروع

☆ ایبٹ کی ڈائری بحوالہ تاریخ ہزارہ از شیر بہادر پنی

ہوئی اور ریذیڈنٹ نے اسے محتاط رہنے کا حکم دیا تو اس نے لکھا:

''اس ملک میں میری طاقت کا اندازہ فوج کی تعداد سے نہیں۔ بل کہ لوگوں کے اس اعتماد سے لگایا جائے، جو وہ مجھ پر بطور اپنے ایک خیر خواہ دوست کے رکھتے ہیں۔''☆

اسی اعتماد کے نتیجے میں ابھی دو ماہ پہلے اس نے سکھوں کو شکست دے کر ہزارہ پر انگریزی تسلط قائم کر دیا، اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ہزارہ کا پہلا ڈپٹی کمشنر مقرر ہوا تھا۔

وہ ایک انتہائی منظم شخص تھا۔ خاص کر اس کے گزشتہ دو ماہ انتہائی مصروفیت میں گزرے تھے لیکن اس نے اپنے روزمرہ کے معاملات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ وہ صبح سویرے اٹھتا اور معمول کی سیر کو نکل کھڑا ہوتا۔ واپس آ کر ناشتہ کرتا اور ٹھیک دس بجے دفتر پہنچ جاتا۔ انتظامی امور کے سلسلے میں ملازمین کو ہدایت دیتا؛ اور خود فائلیں کھول کر بیٹھ جاتا۔ سرکاری خطوط کے جوابات لکھتا اور دوپہر کا کھانا؛ تمام امور نمٹا کر کھاتا۔ کھانے کے بعد غروب آفتاب تک کچہری لگاتا؛ لوگوں کے مسائل سنتا، ان پر احکام صادر کرتا۔ وہ خود مقدمات کی سماعت کرتا اور فوری فیصلے سناتا۔ مقدمات کو بلا تاخیر روزانہ سننے اور بروقت فیصلہ کرنے کو وہ بہت اہمیت دیتا۔ رات کو کچھ دیر کے لیے وہ ایک کمرے میں بند ہو جاتا اور کچھ وقت اپنے ساتھ گزارتا۔ جس میں وہ پہلے دن بھر میں کیے ہوئے کاموں کے بارے میں سوچتا، پھر کچھ دیر کے لیے یا تو مطالعے میں مصروف ہو جاتا یا پھر شاعری کرتا اور سب سے آخر میں دن بھر کے معمولات کی ڈائری لکھتا اور اگر ضروری سمجھتا تو اس کی ایک کاپی صبح بذریعہ ڈاک حکام کو بھجوا دیتا۔ ہفتے میں ایک آدھ بار وہ کسی نہ کسی علاقے کا دورہ کرتا، وہاں کے معاملات کا خود جائزہ لیتا اور حالات کے مطابق فیصلے کرتا۔

اس کے ان فیصلوں کی وجہ سے ضلع بھر سے شورشوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ مگر ضلع کے جنوب مشرقی حصے میں ابھی شورشیں جاری تھیں۔ ان تمام شورشوں کے پیچھے ایک ہی قبیلہ تھا۔ اس کے ماتحتوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اس علاقے میں بغاوت فوج ہی کے ذریعے ختم کی جا سکتی ہے۔ لیکن وہ فوجی کارروائی کے حق میں نہیں تھا۔ وہ یہ معاملہ گفت و شنید کے ذریعے حل کرنا چاہتا تھا۔ اس شورش زدہ علاقے میں اس کے کئی ایک خیر خواہ بھی تھے، جو اس سے وقتاً فوقتاً آ کر ملتے رہتے تھے اور اسے یہاں کے حالات سے بھی آگاہ کرتے رہتے تھے۔ آج وہ اسی مقصد کے لیے یہاں آیا تھا اور اپنے ایک خیر خواہ جمعہ خان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ جس نے اسے پچھلے ہفتے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ اسے یہاں آئے ہوئے سات گھنٹے ہو چلے تھے۔ اس دوران میں اس نے یہاں اپنے کئی خیر خواہوں سے ملاقات کی تھی اور ان سے

☆ یکم جون ۱۸۴۸ کو شیروان سے ریذیڈنٹ پشاور کو لکھے گئے ایبٹ کے خط سے اقتباس بحوالہ تاریخ ہزارہ)۔

مشورے کیے تھے۔ لیکن ابھی تک کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔ مگر وہ مایوس بالکل نہیں تھا۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے اس نے اپنے میزبان سے درخواست کی کہ وہ کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہے۔ دو گھنٹے بعد کھانے پر دوبارہ ملاقات کریں گے۔ چوں کہ مطالعے کے لیے کتابیں ساتھ نہیں تھیں اس لیے اس نے آج کی ڈائری لکھنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن چند جملے ہی لکھے تھے کہ تھکاوٹ کی وجہ سے نیند نے اس پر غلبہ پالیا۔

اچانک دروازے پر ہونے والی دستک سے اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا سا گیا اور اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم نیچے گر گیا۔ اس نے جھک کر قلم اُٹھایا، اسے میز پر رکھا اور اپنا لباس درست کر کے دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازہ کھلتے ہی اس کا ذاتی ملازم آداب بجالایا اور بتایا کہ جمعہ خان صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ اتنے میں جمعہ خان نے اسے سلام کیا۔ اس کے ساتھ ایک اجنبی کھڑا تھا، جس کی عمر پچاس سے کچھ اوپر، بدن گٹھا ہوا اور اعصاب انتہائی مضبوط لگ رہے تھے۔

''آیئے آیئے۔'' ایبٹ نے اجنبی کے چہرے اور جسم کو بغور دیکھتے اور ان دونوں کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ملازم واپس پلٹ گیا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔

''ایبٹ صاحب یہ نورخان صاحب ہیں۔ وہی جن کے بارے میں آپ نے، اپنے ہاں ہونے والی ملاقات میں پوچھا تھا۔'' میزبان نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

ایبٹ، جو اپنی کرسی پر بیٹھ ہی رہا تھا، اور اس کی سرینیں ابھی کرسی سے بہ مشکل مس ہو پائی تھیں، نورخان کا نام سنتے ہی دوبارہ اُٹھ کھڑا ہوا؛ اور نورخان کی طرف دوبارہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اچھا تو آپ ہیں نورخان۔ آپ کا بہت ذکر سنا تھا۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' یہ کہہ کر اس نے نورخان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''آپ بہادر آدمی ہیں اور ہماری سرکار بہادروں کی بہت قدر کرتی ہے۔'' ایبٹ نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

نورخان نے نوٹ کیا کہ جب تک وہ کرسی پر بیٹھ نہیں چکا، ایبٹ کھڑا رہا تھا۔ وہ اس کے اس رکھ رکھاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بہت سے لوگوں کی زبانی سن رکھا تھا کہ نیا حکمران بہت اچھا اور شریف آدمی ہے۔ لیکن وہ اس سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جب وہ یہاں پہنچا تو جمعہ خان نے اس سے ملتے ہی ایبٹ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے تھے؛ اور وہ ہی اصرار

کر کے اسے یہاں لایا تھا۔

''شکریہ۔''نور خان، نے آہستگی سے کہا۔

''آپ کا بڑا پن ہے آپ نے ہماری درخواست قبول کر لی اور یہاں تشریف لے آئے۔جمعہ خان کا بھی شکریہ کہ اس نے مجھے آپ جیسے آدمی سے ملوایا۔میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا تھا۔انھوں نے بتایا تھا کہ آپ کو شاید میرے آفس تشریف لانے میں تردد ہو۔لہذا میں یہاں چلا آیا۔''ایبٹ نے تمہید باندھی۔

''ہاں جمعہ خان میرا عزیز ہے۔اس کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔جب سکھوں نے میرا گھر بار جلا دیا تھا،اور میں نے علاقہ چھوڑ دیا تھا تو اس نے میرے بال بچوں کا بہت خیال رکھا۔میں جب چھپ چھپا کر یہاں آتا تو یہ ساری ساری رات جاگ کر پہرہ دیتا،کہ کہیں سکھڑے کسی مخبر کے ذریعے چھاپا مار کر مجھے گرفتار نہ کر لیں۔کل جب اس نے مجھے یہاں آنے کا پیغام بھجوایا تو میں فوراً یہاں چلا آیا کہ کوئی نہ کوئی ضروری کام ہو گا۔میں سیدھا سادہ آدمی ہوں۔کوئی بات دل میں نہیں رکھتا۔مجھے حاکموں شاکموں سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔لیکن اس کے اصرار پر یہاں آ گیا ہوں''نور خان نے روکھے انداز میں کہا۔

''بس جی یہ جمعہ خان صاحب کی مہربانی ہے۔اگرچہ انھوں نے مجھے یقین دلایا تھا لیکن سچی بات ہے کہ مجھے پوری طرح سے یقین نہیں تھا کہ آپ تشریف لے آئیں گے؛اور جب آپ آئے تو بھی مجھے شک تک نہیں گزرا کہ یہ آپ ہو سکتے ہیں۔میں تو سمجھا ان کا کوئی اور عزیز ہے جسے یہ ملانے لائے ہیں۔''ایبٹ نے عاجزی سے کہا۔پھر نور خان کو خاموش دیکھ کر خود ہی دوبارہ بول اٹھا۔

''اگر آپ یہاں تشریف نہ لاتے تو میں خود نور آباد آپ سے ملنے آتا۔سنا ہے آپ نے بہت خوبصورت بستی بسائی ہے۔میں نور آباد تو نہیں گیا مگر اس کے کہیں آس پاس ہی سے گزر کر مارگلہ کی پہاڑیوں پر گیا تھا؛سکھ افواج کے پنڈی میں ہتھیار ڈالنے کا منظر دیکھنے کے لیے۔سکھوں نے آپ لوگوں پر بہت ظلم ڈھائے۔اس وقت اگر ہماری کمپنی کی حکومت ہوتی تو یقیناً ایسے حالات پیدا نہ ہوتے؛اور ہم خلیفہ صاحب کو بھی بخوشی کشمیر جانے دیتے۔بل کہ ہم ان کی حفاظت کے لیے فوج کا ایک دستہ بھی ساتھ بھیجتے۔ہم نے آج تک شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر کا احترام ملحوظ رکھا ہے۔وہ بھی ہمارا احترام کرتے ہیں۔''ایبٹ بغیر کوئی وقفہ دیے بولتا چلا گیا۔

نور خان بدستور خاموش تھا تاہم ایبٹ نے محسوس کیا کہ خلیفہ سید احمد بریلوی اور بہادر شاہ ظفر کا نام سنتے ہوئے نور خان کے چہرے کے تاثرات میں واضح تبدیلی ہوئی ہے۔اس نے بات جاری رکھی:

''ہم خود مذہبی لوگ ہیں اور مذہبی رواداری کے قائل ہیں۔ میں خود مذہب کا پابند ہوں۔ اتوار کو میں جہاں کہیں بھی ہوں۔صبح کے وقت عبادت ضرور کرتا ہوں۔اس سے مجھے دلی طمانیت ہوتی ہے۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی مذہب ہو،اس کی تعلیمات نیکی کی طرف لاتی ہیں اورانسان کو برائی سے بچاتی ہیں۔ کمپنی کی حکومت کسی کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔ہم تو چاہتے ہیں کہ لوگ آپس میں لڑنے جھگڑنے کے بجائے امن سے رہیں۔اگر کسی کو کسی سے کوئی شکایت ہےتو ہم اس کےازالے کے لیے ہروقت حاضر ہیں۔'' ایبٹ نے آخری جملہ عاجزی سے سر جھکاتے ہوئے ادا کیا۔

''اٹھارہ سال ہو گئے ہیں مجھےلڑائی جھگڑے کو چھوڑے ہوئے۔ میں تو اس علاقے ہی سے کنارہ کش ہو چکا ہوں۔اور اپنی الگ بستی بسائے بیٹھا ہوں۔آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟'' نور خان نے طویل خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔اس کے لہجے میں خاصی جھنجھلاہٹ تھی۔

''خان صاحب!۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس علاقے میں امن بحال رکھنے کے سلسلے میں میری مدد کریں۔'' ایبٹ نے عاجزی سے کہا۔

نور خان نے کوئی فوری جواب نہیں دیا اور سامنے دیوار پر نظریں جمائے کچھ سوچتا رہا۔اس دوران میں ایبٹ ٹکٹکی باندھے نور خان کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

''یہ خاصا میچور آدمی ہے۔بولتا کم اور سنتا زیادہ ہے۔کوئی بات عجلت میں نہیں کرتا۔اپنا ہر فیصلہ سوچ سمجھ کر کرتا ہے۔اس نے زندگی میں جتنی بھی لڑائیاں لڑی ہوں گی۔پوری منصوبہ بندی سے لڑی ہوں گی۔امر سنگھ جیسے بہادر اور چالاک آدمی کو،اس کے حفاظتی دستے کی موجودگی میں مارنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جو اس نے محض دو اور لوگوں کی مدد سے سر انجام دے دیا۔اگر یہ شخص کسی باقاعدہ فوج کا سربراہ ہوتا تو ہر معرکے میں اس کی کامیابی یقینی تھی۔'' ایبٹ نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔جس پر ہلکی ہلکی سی جھریاں نمودار ہو چکی تھیں۔

اچانک نور خان نے اپنی نظریں دیوار سے ہٹا کر ایبٹ کے چہرے پر مرکوز لیں۔جس سے ایبٹ کچھ سٹ پٹا سا گیا،اسے لگا جیسے نور خان نے اس کی چوری پکڑ لی ہے۔

''یہ محض ایک درخواست ہے۔آپ چاہیں تو اسے رد بھی کر سکتے ہیں۔'' ایبٹ نے نور خان کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوتے ہی کہا۔ یک دم اسے احساس ہوا کہ اس نے یہ جملہ لاشعوری طور پر عجلت میں کہہ دیا ہے۔اس سے پہلے کہ نور خان اس سے کوئی اور مطلب اخذ کرتا اس نے فوراً کہا۔

''لیکن یاد رکھیں۔اس میں آپ کے قبیلے کی بھی بہتری ہے اور ہماری بھی۔اس سلسلے میں،

میرے لائق جو بھی خدمت ہو۔ میں ہر وقت حاضر ہوں۔"

"میں اس سلسلے میں سردست کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔" نور خان نے مختصر سا جواب دیا۔

"میں نے ایک درخواست کی ہے۔ جسے رد کرنے کا آپ کو اختیار ہے۔ میں بس اتنا جاننا ہوں کہ آپ اگر چاہیں تو یہ کام کر سکتے ہیں؟" ایبٹ نے عاجزی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں۔ حالاں کہ آپ جانتے ہیں کہ قبیلے کے بیشتر لوگوں سے میرا رابطہ نہیں۔ میں اٹھارہ سال سے الگ تھلگ رہ رہا ہوں۔ اس دوران میں وہ بچے جنھیں میں یہاں دودھ پیتا چھوڑ گیا تھا۔ جوان ہو چکے ہیں۔ انھوں نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔۔۔"

"بے شک آپ نے انھیں نہیں دیکھا۔ لیکن وہ سب آپ کو جانتے ہیں۔ وہ تمام لوگ جنھوں نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھائے ہیں۔ وہ سب آپ کے نام سے واقف ہیں۔ واقف کیا وہ آپ کا دل سے احترام کرتے ہیں۔" ایبٹ، نور خان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھا۔ اگلے ہی لمحے اسے احساس ہو گیا کہ اس نے ایسا کر کے غلطی کی ہے۔ نور خان اس کا برا بھی مان سکتا ہے۔

"میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یوں درمیان میں نہیں بولنا چاہیے تھا۔ جی آپ کچھ کہہ رہے تھے۔" ایبٹ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

"میں سوچوں گا۔" نور خان نے انتہائی مختصر جواب دیا۔

نور خان نے اگرچہ کوئی مثبت جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن ایبٹ اب تک ہونے والی گفتگو سے مطمئن تھا۔ نہ جانے کیوں اسے یقین سا ہو چلا تھا کہ نور خان بہت جلد اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائے گا اور وہ اس کے ذریعے اس سرکش قبیلے پر قابو پا لے گا۔

"چلیں کھانے کی میز پر چلیں۔ باقی باتیں وہیں کرتے ہیں۔" ایبٹ نے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ کھانا، میں اپنے ایک عزیز کے ہاں کھاؤں گا۔" نور خان نے کہا۔

"بے شک آپ اس کام میں ہمارا ساتھ نہ دیں۔ لیکن کھانا تو ہمارے ساتھ کھا لیں۔ تا کہ کل ہم بھی اپنے بچوں سے کہہ سکیں کہ ہم نے نور خان جیسے بہادر آدمی کے ساتھ کھانا کھایا تھا"۔ ایبٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کافی عرصے بعد یہاں آیا ہوں۔ میرے ایک عزیز نے آتے ہی اصرار کیا کہ آج کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے گا۔ اگر میں وہاں نہ گیا تو وہ ناراض ہو جائے گا۔" نور خان نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"خان صاحب ہمیں بھی آپ اپنا عزیز ہی سمجھیں۔ اگر آپ وہاں گئے تو میں آپ سے

ناراض ہونے کا خطرہ تو مول نہیں لوں گا۔مگر مجھے افسوس رہے گا کہ آپ نے میری دعوت قبول نہیں کی۔"
ایبٹ نے مسکراتے ہوئے کہا جس میں ایک خاص طرح کی اپنائیت بھی تھی۔اس اپنائیت کو نور خان نے بھی محسوس کیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ کھانے کی میز کی طرف چل دیا۔
"کاش آپ سے میری ملاقات میرے اپنے گھر ہوتی۔اور میں آپ کی کوئی بہتر تواضع کر سکتا۔بہر حال، یہاں جو ممکن تھا حاضر ہے۔" ایبٹ نے نور خان کو کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔
جمعہ خان کے روکنے کے باوجود، ایبٹ نے اپنے ہاتھ سے سالن پلیٹوں میں ڈالا اور تینوں کھانا کھانے لگے۔
"خان صاحب۔میں اپنی ملازمت کے سلسلے میں تقریباً پورا ہندوستان گھوما ہوں۔روس بھی گیا ہوں۔لیکن یہاں کے لوگوں سے میرا ایک دلی تعلق قائم ہو گیا ہے۔میری خواہش ہے کہ میں عمر کا باقی حصہ یہیں گزاروں۔اگر آپ جیسے بہادر لوگ میرا ساتھ دیں تو میری یہ خواہش پوری ہوسکتی ہے۔"
ایبٹ نے تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔
"باقی فرنگیوں کا تو مجھے پتا نہیں لیکن یہ خاندانی آدمی لگتا ہے"۔نور خان نے ایبٹ کی طرف سے بڑھائے ہوئے تولیے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سوچا۔
"یہ لوگ سکھڑوں سے مختلف ہیں۔اُن کی تو ہر بات سے رعونت ٹپکتی تھی۔یہ وضع دار لوگ لگتے ہیں۔"اس نے مزید سوچا۔ایبٹ اس دوران میں نور خان کی نظروں سے نظریں بچا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔
"گہرا آدمی ہے۔بہت گہرا۔دانا بھی ہے۔بہت کم بولتا ہے۔مگر ہے شاندار آدمی۔" ایبٹ نے سوچا۔
"میں چلتا ہوں۔آپ کی تواضع اور مہمان نوازی کا شکریہ"۔نور خان نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"کیسی باتیں کرتے ہیں جناب شکریہ تو آپ کا۔آپ نے میری عزت افزائی کی۔" ایبٹ نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔
"مجھے آپ کے فیصلے کا انتظار رہے گا۔مجھے یقین ہے آپ کا فیصلہ بہتر نتائج لائے گا۔میں بہت جلد نور آباد میں آپ کے دولت کدے پر حاضری دوں گا۔" ایبٹ نے نور خان کو گرم جوشی سے رخصت کرتے ہوئے کہا۔
"ابھی ابھی میں نے نور خان کو رخصت کیا ہے۔میں نے اس کے ایک عزیز جمعہ خان کی وساطت سے،اس سے ملاقات کی ہے۔وہ مجھے ایک گہرا، خاموش اور معقول آدمی لگا ہے۔وہ بہت بہادر

شخص ہے۔اس نے محض دو آدمیوں کی مدد سے سابق حاکم ہزارہ امر سنگھ مجیٹھہ اور اس کے بھائی کو یہاں ایک ندی کے کنارے حفاظتی دستے کی موجودگی میں قتل کر دیا تھا۔اس کا رعب اور دبدبہ اتنا تھا کہ امر سنگھ اور اس کے بھائی کی لاشیں ایک ماہ تک ندی کنارے پڑی رہیں۔لیکن کسی کو اٹھانے کی جرات نہیں ہوئی۔ بعد میں وہ خلیفہ سید احمد کے ساتھ بالاکوٹ کی جنگ میں شریک ہوا۔اس جنگ کا واحد حملہ جس میں سکھوں کا بھاری جانی نقصان ہوا،اسی کی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا۔ جنگ میں مسلمانوں کی شکست کے بعد وہ روپوش ہو گیا اور پھر اس نے ضلع کے جنوب میں ایک نئی بستی بسائی۔اس کے بہت سے عزیز یہاں سے نقل مکانی کر کے وہاں چلے گئے۔یہ بستی اسی کے نام کی مناسبت سے نور آباد کہلاتی ہے۔اس نے اگرچہ ہزارہ کے جنوب مشرقی حصے میں شورش ختم کرانے کی ابھی ہامی نہیں بھری۔لیکن مجھے یقین ہے کہ اگلی ملاقات میں، میں اسے قائل کر لوں گا۔نور خان اپنے قبیلے میں بہت اثر رسوخ رکھتا ہے۔میری تحقیق کے مطابق۔وہ واحد شخص ہے،جس کا احترام اس قبیلے کا ہر فرد کرتا ہے۔بلکہ علاقے کے دوسرے قبیلوں کے لوگ بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔اس احترام اور عزت کی وجہ امر سنگھ اور اس کے بھائی کا قتل اور بالاکوٹ کی جنگ میں اس کی کلیدی حیثیت ہے۔میں کچھ ہی دنوں میں اسے ملنے خود نور آباد جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اسے کمپنی کا ساتھ دینے پر آمادہ کر لوں گا۔"☆

ایبٹ نے اپنی آج کی ڈائری مکمل کی۔اٹھ کر ستون کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین بجھائی اور لیٹ گیا۔کچھ ہی دیر میں وہ خوابوں کی دنیا میں تھا۔جہاں نور خان اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو چکا تھا اور اس کے کہنے پر سرکش قبیلے کے تمام مسلح افراد نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔اب اس کی حاکمیت میں ہر طرف امن اور سکون کا دور دورہ تھا اور وہ نواں شہر اور دھمتوڑ کے بچوں میں ٹافیاں بانٹ رہا تھا۔جو اسے "کاکا ایبٹ۔کاکا ایبٹ" کہہ کر پکار رہے تھے۔

اگلے سال ریذیڈنٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا:

"لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں۔گزشتہ سال میں جتنے بھی لوگ ہزارہ سے میرے پاس آئے،انھوں نے اس کی بے حد تعریف کی۔وہ اس قوم سے ہر کام حسب خواہش لے سکتا ہے۔جس قوم کو سکھ اپنے پورے عہد حکومت میں فوج کے ذریعے بھی رام نہ کر سکے اور جس کو ہوشیار و چالاک راجہ گلاب سنگھ نے بھی ہر شرط پر واپس دربار کے حوالے کرنا منظور کیا۔اس قوم کو میجر ایبٹ نے اپنی خوئے دل نوازی سے رام کر لیا۔"☆

☆ایبٹ کی ممکنہ ڈائری ☆ریذیڈنٹ پشاور کی رپورٹ بحوالہ تاریخ ہزارہ از شیر بہادر پنی

تیسرا باب

خواب کا پیش منظر

(۱)

چھوٹے سردار جی: ظفر علی خان نے اپنے منشی کے ساتھ نشان زدہ، دیودار کے دیو قامت درختوں کا معائنہ کیا، اسے درختوں کی کٹائی کے حوالے سے ہدایات دیں اور گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ ان کے ذاتی محافظوں نے جیسے ہی اپنے گھوڑوں کو ایڑھ لگائی، انھوں نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے وہیں کھڑے رہنے کا حکم دیا اور خود روانہ ہو گئے۔

تقریباً بیس منٹ کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ ایک چھوٹی سی ندی میں جا اترے، جو اگر چہ تنگ تھی مگر ان کی رگوں میں دوڑتے ہوئے گرم خون کی طرح انتہائی جوش سے بہ رہی تھی۔ پانی اوپر ڈھلان کی طرف سے ایک، فٹ بھر چوڑے اور تقریباً اتنے ہی گہرے کٹھے میں انتہائی تیزی سے بہ رہا تھا، وہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کچھ آگے جا کر پانی؛ چار، ساڑھے چار گز کی بلندی سے نیچے ایک چھوٹی سی جھیل میں گر رہا تھا۔ جہاں آ کر اس کی سطح برابر اور بہاؤ سست ہو جاتا۔ لیکن یہ ہموار سطح اس چھوٹی سی جھیل کے دوسرے کنارے پر پھر ناہموار ہو جاتی اور پانی ایک مرتبہ پھر تیزی سے بہنا شروع ہو جاتا۔

ندی کے دونوں اطراف خوبانی، ناشپاتی، سیب، آلوچے، آڑو اور املوک کے درخت بے ترتیبی سے لگے ہوئے تھے۔ جن میں سے زیادہ تر کی ٹہنیاں پھلوں کے بوجھ سے ندی پر جھکی ہوئی تھیں۔ املوک ابھی بالکل کچے تھے۔ جب کہ باقی تمام درختوں کے بیشتر پھل تقریباً پک چکے تھے۔

اس چھوٹی سی جھیل کے مغربی کنارے پر ڈیڑھ دو فٹ اونچا ایک تھلا سا بنا ہوا تھا، جو اگر چہ مستطیل نما تھا لیکن مغربی سمت میں عین درمیان میں سے آگے کو بڑھا ہوا تھا۔ جس پر پتھر کی نو بڑی بڑی سلیں رکھی ہوئی تھیں۔ پہلے چار چار سلوں کی دو قطاریں تھیں، جو شمالاً جنوباً ایک خوبصورت ترتیب سے رکھی گئیں تھی۔ جب کہ نویں سل، تھلے کی مغربی سمت میں آگے کو بڑھے ہوئے حصے پر بچھی تھی۔ تھلے کی جنوبی سمت میں ایک سات آٹھ فٹ اونچی چٹان تھی جس کے آگے دو دیواریں کھڑی کر کے تیسری سمت

بوری کا ایک بھاری پردہ لٹکا دیا گیا تھا۔ جس میں ندی سے ایک چھوٹی سی کٹھی نکال کر پانی، چٹان کے اوپر نصب لکڑی کے ایک پرنالے کے ذریعے ٹین دیواری کے اندر گرایا گیا تھا۔ یہ مسافروں کے لیے استنجا خانہ تھا۔

پانی استنجا خانے میں اتنے زور سے گر رہا تھا کہ اس کی آواز جھیل کے شمالی کنارے پر کھڑے ہو کر بھی بہ آسانی سنی جا سکتی تھی۔

چھوٹے سردار جی نے گھوڑے کو ٹھلے کے شمالی کونے میں واقع ایک آلو بخارے کے درخت سے باندھا اور اپنے جوتے اتار کر بڑی بڑی سلوں والے ٹھلے پر اس طرح لیٹ گئے کہ شفاف پانی کا بڑا جھرنا ان کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ سوائے ان چند سالوں کے جب انھیں تعلیم کے لیے شہر جانا پڑا تھا ان کی باقی ساری زندگی پہاڑوں ہی میں گزری تھی۔ کوہ پیمائی کرنا اور جنگلوں میں گھومنا ان کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ جس کی آبیاری کے لیے انھوں نے اردگرد کے تمام علاقے چھان مارے تھے۔ اس دوران میں انھوں نے کئی جھرنے، چشمے، آبشاریں، ندیاں اور دریا دیکھ رکھے تھے مگر انھوں نے اپنی زندگی میں اتنا شفاف پانی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پانی ایک گز بھر چوڑی آبشار کی صورت میں نیچے جھیل میں گر رہا تھا۔ انھوں نے اپنے دونوں بازوؤں کا تکیہ بنا کر اپنی نظریں؛ تیزی سے بہتے ہوئے پانی پر مرکوز کر لیں۔ نہ جانے وہ کتنی دیر آبشار کو ٹک ٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ رفتہ رفتہ انھیں محسوس ہوا جیسے پانی ساکت ہے اور زمین چل رہی ہے۔ پھر انھیں لگا جیسے یہ پتھریلا ٹھلا فضا میں بلند ہو رہا ہے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک طلسمی قالین کی صورت اڑنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اس اڑان میں ان کے ساتھ ایک پری بھی شامل ہو گئی۔ نہ جانے وہ کتنی دیر فضا میں یوں ہی اڑتے رہے۔ اڑتے اڑتے وہ کسی اور جہان میں پہنچ گئے، جہاں ایک بالکل مختلف دنیا آباد تھی۔ ایک ایسی دنیا جس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ان کا چہرہ روشنی سے جگمگانے لگا اور لحہ بہ لحہ اس کی چکا چوند بڑھتی گئی یہاں تک کہ اس کی تاب لانا ناممکن سا ہو گیا۔ انھوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں مگر روشنی بند پپوٹوں کے غلافوں سے بھی چھن کر اندر آتی رہی۔ اچانک انھوں نے اپنا منہ دوسری طرف کر کے آنکھیں کھول دیں۔ انھیں ایک دھچکا سا لگا، انھوں نے دیکھا کہ وہ پتھریلے ٹھلے پر بیٹھے ہوئے ہیں اور سورج ایک ایسے زاویے پر آ چکا ہے کہ اس کی کرنوں کی روشنی جھیل کے پانی سے منعکس ہو کر ان کے چہرے پر پڑ رہی ہے۔ جب انھوں نے دوبارہ آبشار کی طرف نظر اٹھائی تو دیکھا کہ عین اس جگہ پر، جہاں پانی آبشار کی صورت نیچے گرنا شروع ہوتا ہے، ایک خوبرو لڑکی کھڑی ہے۔ جو مسکراتے ہوئے انھیں دیکھ رہی ہے۔ وہ اتنی حسین ہے کہ سچ مچ کی پری لگ

رہی ہے ۔جیسے ہی چھوٹے سردار جی کی نظر اس پر پڑی وہ کچھ لجلجا سی گئی اور یک دم ندی کو پھلانگ کر گھنے جنگل میں ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سردار صاحب نے اٹھ کر ٹیلے کے شمالی کونے میں بندھے گھوڑے پر چھلانگ لگائی اور سوار ہوکر گھوڑے کا رخ اسی طرف کر لیا، جس طرف انھوں نے لڑکی کو بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کافی دیر تک جنگل میں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہے، مگر وہ لڑکی کسی پرچھائیں کی طرح گھنے جنگل میں گم ہوگئی تھی۔ وہ اس خوبرو لڑکی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے واپس اسی جگہ پہنچ گئے۔ جہاں سے انھوں نے سفر آغاز کیا تھا۔ اب وہاں کئی دیو قامت درخت، جنھیں وہ کھڑا آسمان سے باتیں کرتا چھوڑ کر گئے تھے، زمیں پر لیٹے ہوئے تھے۔

منشی نے جب چھوٹے سردار جی کو دیکھا تو اسے لگا جیسے ان کے ساتھ کوئی ان ہونی ہوئی ہے۔ اس نے دیکھا کہ ان کا سانس پھولا ہوا ہے۔ اس نے بھاگ کر گھوڑے کی لگام تھامی؛ اور ان کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر وہ خود کچھ گھبرا سا گیا۔ اس نے انھیں سہارا دے کر گھوڑے سے اتارا، جو حیرت کی تصویر بنے، اسے دیکھ رہے تھے۔ اس نے ان کے ذاتی محافظوں کو بلایا، وہ دونوں بھاگتے ہوئے فوراً حاضر ہوئے۔ ان کی دیکھا دیکھی درخت کاٹنے والے تمام مزدور بھی بھاگتے ہوئے آ گئے۔

آناً فاناً سب لوگ چھوٹے سردار کے گرد جمع ہو گئے انھیں فوراً اندازہ ہو گیا کہ ضرور ان کے ساتھ کوئی ان ہونی ہوئی ہے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ چھوٹے سردار کی عمر بہت زیادہ نہ سہی لیکن وہ بہت بہادر آدمی ہیں اور کسی چھوٹے موٹے واقعے سے گھبرانے والے نہیں۔

ظفر علی خان کا سانس ابھی تک پھولا ہوا تھا۔ منشی نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا:

"سردار جی آپ گھبرائیں نہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

ظفر خان پھٹی ہوئی آنکھوں سے منشی کی طرف دیکھتے رہے اور خاموش رہے۔

منشی کچھ اور گھبرا سا گیا۔ اس نے ان کے محافظوں کو ساتھ لیا۔ چھوٹے سردار جی کے گھوڑے کو اپنے گھوڑے کے پیچھے باندھا اور خود اپنے گھوڑے پر انھیں آگے بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

جب وہ گاؤں پہنچے تو گلیوں میں اندھیرا سرسرا رہا تھا؛ اور چھوٹے سردار جی گھوڑے پر بے ہوش پڑے تھے۔

بڑے سردار صاحب نے جب اپنے اکلوتے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو بہت پریشان ہوئے۔

فوری طور پر کچھ آدمیوں کو ڈاکٹر بلانے کے لیے شہر روانہ کیا، جو دوسرے دن گاؤں پہنچا اور تفصیلی چیک اپ کے بعد گویا ہوا۔

''چھوٹے سردار جی کو کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔انھیں فوری طور پر اسپتال لے جانا ضروری ہے۔''

جب اس واقعہ کی اطلاع ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو پہنچی تو وہ خود بھی بہ نفسِ نفیس تشریف لائے؛ اور ڈاکٹروں کو ضروری ہدایات دیں۔ چھوٹے سردار جی کئی روز تک اسپتال میں زیرِ علاج رہے۔

رفتہ رفتہ چھوٹے سردار جی کی طبیعت سنبھلنا شروع ہوئی اور بڑے سردار جی نے اطمینان کا سانس لیا۔اس دوران میں حویلی کی تعمیر کا کام، جسے روک دیا گیا تھا، دوبارہ شروع کرا دیا گیا۔

بڑے سردار جی ایک درویش منش آدمی تھے ۔وہ اس حویلی کی تعمیر کے حق میں نہیں تھے لیکن؛ ایبٹ آباد کے نام سے حال ہی میں تعمیر ہونے والے شہر میں، رہائش پذیر ان کے کچھ دوستوں نے گاؤں میں انھیں ایک شاندار حویلی بنا کر دینے کا پروگرام بنایا۔جس میں ڈپٹی کمشنر صاحب نے بھی خصوصی دل چسپی لی اور اس کی تعمیر کے لیے اس پہاڑی علاقے میں سڑک بنوائی تا کہ پتھر، لکڑی اور دیگر سامان یہاں آسانی سے پہنچایا جا سکے ۔اگر چہ یہ علاقہ پتھریلا تھا اور قریب ہی چیڑ کا گھنا جنگل بھی ،لیکن نہ تو یہاں کا پتھر اس حویلی کے شایانِ شان سمجھا گیا اور نہ ہی چیڑ کی لکڑی کو۔ جو چاہے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو دیار کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی چہ جائے کہ دیودار کا۔ دیودار کا بلند وبالا درخت؛ بلندترین پہاڑوں میں پلتا بڑھتا ہے ۔ایسے پہاڑوں پر جو سطحِ سمندر سے کم از کم ساڑھے سات ہزار فٹ بلند ہوں ۔ان کے گاؤں کے اردگرد کے پہاڑوں کی تو بلندترین چوٹی بھی پانچ ہزار فٹ سے بلند نہیں تھی ۔ جب زیرِ تعمیر حویلی میں دیودار کی لکڑی استعمال کرنے کا فیصلہ ہوا تو گاؤں کے لوگوں کو یقین ہی نہیں آیا۔ان کا ذہن یہ بات تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہیں تھا کہ اتنے دوردراز علاقے سے دیودار کی لکڑی یہاں لائی جا سکتی ہے۔

ادھر اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ڈپٹی کمشنر صاحب کے دفتر میں ایک باقاعدہ اجلاس ہوا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ سامان بہم پہنچانے کے لیے پہلے دریائے ہرو سے نورآباد تک ایک طویل سڑک تعمیر کی جائے گی۔

جب سڑک کی تعمیر مکمل ہو گئی تو گلیات کے بلند وبالا پہاڑوں سے، دیودار کے درخت کاٹ کر، ان کے موٹے تنوں کو، وہاں کے ایک بڑے برساتی نالے میں لڑھکانے کا فیصلہ کیا گیا۔جس کی نگرانی کا کام چھوٹے سردار جی نے خود اپنے ذمے لیا۔ پہلے تو بڑے سردار جی نہ مانے لیکن پھر چھوٹے سردار جی کی ضد کے آگے انھیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑے ۔انھوں نے منشی کو خصوصی طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ

چھوٹے سردار جی کا ہر طرح سے خیال رکھے۔ان کا خیمہ ایسی جگہ لگوائے جو ہر طرح سے محفوظ ہو۔ان کے محافظوں میں سے ایک دن کو سویا رہا کرے اور پوری رات جاگتا رہے نیز یہ کہ بندوق ہر وقت روندوں سے بھری رکھے۔

اس روز جب چھوٹے سردار جی اکیلے آگے گھنے جنگل کی طرف بڑھنے لگے تھے تو منشی کے دل میں لحظہ بھر کے لیے خیال ابھرا تھا کہ وہ انھیں روکے۔لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ برا نہ مان جائیں،انھیں روکتے روکتے رک گیا تھا۔پھر اس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ چھوٹے سردار جی اب بچے تھوڑے ہی ہیں۔ماشا اللہ جوان ہیں۔لیکن جب یہ واقعہ ہوا تو وہ بہت گھبرا گیا تھا اور اپنے آپ کو کوسنے لگا تھا کہ اس نے انھیں جانے سے روکا کیوں نہیں۔

جب تک چھوٹے سردار جی کی طبیعت پوری طرح نہیں سنبھلی، درختوں کی کٹائی کا کام رکا رہا۔جسے ان کے اسپتال سے گھر منتقلی کے بعد ہی دوبارہ شروع کیا گیا۔تاہم اس میں تیزی لا کر منصوبے کے مطابق مئی کے مہینے کے آخر میں مکمل کر لیا گیا۔تاکہ جون کی تپتی دوپہریں لکڑی کو کچھ سکھا کر ہلکا کر دیں۔

جب جولائی کی بارشیں شروع ہوئیں تو تمام لکڑی کو نیچے بڑے برساتی نالے میں پہنچایا جا چکا تھا۔ایک دن جب زور کی بارش ہوئی اور برساتی نالہ اپنے آپے سے باہر ہونے لگا تمام لکڑی اس کے سپرد کر دی گئی۔جو کچھ فاصلہ طے کر کے دریائے ہرو میں پہنچ گئی اور وہاں سے برق رفتاری کے ساتھ اپنی میلوں دور منزل کی طرف بہنے لگی۔گاؤں کو دریائے ہرو سے ملانے والی سڑک پر لکڑی کو پانی کی تند لہروں سے نکالنے کے لیے خصوصی انتظامات پہلے ہی سے کر دیے گئے تھے۔جہاں سے اسے خچروں اور اونٹوں کے ذریعے نور آباد لے آیا گیا۔یہ پورے علاقے میں واحد حویلی تھی جو دو منزلہ تھی اور جس کے صحن میں مقامی پودوں کے بجائے کیکٹس کے پودے لگائے گئے تھے،جنھیں ان کے شہری دوستوں نے باہر سے منگوا کر انھیں بطور تحفہ پیش کیا تھا۔

جب حویلی تیار ہوئی تو اس کے افتتاح کے لیے بڑے سردار جی کے دوستوں نے اپنے اور سردار جی کے مشترکہ دوست اور ضلع کے ڈپٹی کمشنر میجر آر۔ایڈمز☆ کو دعوت دی، جو اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ تشریف لائے، جیسے وہ کوئی سرکاری فرض ادا کرنے آئے ہوں۔ڈپٹی کمشنر کے آنے کی خبر سنتے ہی اردگرد کے دوسرے دیہات کے لوگ صبح سویرے حویلی میں جمع ہونا شروع ہوئے گئے۔

☆ہزارہ کا دوسرا ڈپٹی کمشنر

جب ڈپٹی کمشنر کی سواری گاؤں میں داخل ہوئی تو ان کا شایانِ شان استقبال کیا گیا۔
خان بہادر بڑے سردار جی نے خود آگے بڑھ کر انھیں سواری سے اترنے میں مدد دی اور انھیں حویلی کے بڑے دروازے پر لے کر آئے جہاں انھوں نے فیتہ کاٹ کر حویلی کا افتتاح کیا اور وہاں جمع ہوئے لوگوں سے خطاب کیا۔انھوں نے کہا:
''میں خان بہادر سردار فقیر محمد خان صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نور آباد میں آنے اور اس عظیم الشان حویلی کا افتتاح کرنے کا موقع فراہم کیا۔انگریز سرکار سردار جی کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ہمارے لیے یہ بات قابلِ فخر ہے کہ خان بہادر سردار فقیر محمد خان صاحب نے ڈپٹی کمشنر میجر جیمز ایبٹ کے ساتھ مل کر اس خطے میں امن قائم کیا۔ان کے قبیلے نے، جو پہلے انگریز سرکار کے خلاف صف آرا تھا، ان کے کہنے پر ہتھیار ڈالے اور انگریز سرکار کا وفادار رہا۔پھر انھوں نے کیپٹن جے۔آر۔بیچر کے ساتھ مل کر حکومتِ انگلشیہ کے لیے بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔غدر کے موقع پر جب ڈھونڈوں اور کرڑالوں نے مری پر حملہ کر کے وہاں لوٹ مار مچانے کا منصوبہ تیار کیا تو سردار صاحب نے اپنے دوست جے۔آر۔بیچر کو اس منصوبے سے بروقت آگاہ کر دیا۔جس کے بعد بیچر صاحب نے نہ صرف مری کے حکام کو اس کی بروقت اطلاع دی بل کہ اس کی حفاظت کے لیے تین کمپنیاں ایبٹ آباد سے روانہ کیں۔جن کی وجہ سے اس حملے کو روکنے کے لیے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور غدار اپنے انجام کو پہنچے۔میں بہت جلد وائسرائے ہند سے ان کی خدمات کے صلے میں سر کے خطاب کی سفارش کروں گا۔یہ سفارش میں اس لیے نہیں کروں گا کہ خان بہادر میرے دوست ہیں۔بل کہ میں انتہائی ایمان داری سے سمجھتا ہوں کہ وہ اس کے بجا طور پر مستحق ہیں۔''سر کے خطاب کی سفارش کا سنتے ہی سردار جی کے شہر سے آئے ہوئے دوستوں نے خوب تالیاں بجائیں، جن کی دیکھا دیکھی دیہاتیوں نے بھی تالیاں پیٹنا شروع کر دیں اور پھر دیر تک حویلی تالیوں سے گونجتی رہی۔
ڈی سی صاحب کے خطاب کے بعد خان بہادر سردار فقیر محمد خان کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی۔سردار صاحب کے اٹھتے ہی ایک بار پھر حویلی تالیوں کے شور سے گونجنے لگی۔خان بہادر صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ، اپنی پیتل کی شام لگی کھونڈی پر ٹیکے اور کہا:
''سب سے پہلے تو میں اپنے دوست میجر آر۔ایڈمز کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میری عزت افزائی کی۔اس کے ساتھ ساتھ میں انھیں آپ سب کی طرف سے یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ ہم انگریز سرکار کی حمایت جاری رکھیں گے۔یہ انگریز سرکار ہی تھی جس نے ہمیں سکھوں کے مظالم سے نجات دلائی۔آپ سب جانتے ہیں کہ میرے ابا حضور، حضرت سردار نور خان، خدا ان کی مغفرت کرے،

ساری زندگی سکھوں کے خلاف لڑتے رہے۔ وہ اس خطے کے لوگوں کے سب سے بڑے محسن میجر جیمز ایبٹ کی دعوت پر ان سے ملنے اپنے آبائی گاؤں ناڑہ گئے تھے۔ جہاں وہ جمعہ خان کے گھر ان سے ملنے آئے تھے۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں میجر ایبٹ صاحب کے حسنِ سلوک سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسی وقت ان سے ہر قسم کے تعاون کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن زندگی نے انھیں یہ وعدہ وفا کرنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ وہ ان سے رخصت ہو کر اپنے چچا زاد سردار حسن علی خان کے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ اندھیرے میں ان کا پاؤں پھسل گیا اور وہ ایک گہری کھائی میں جا گرے۔ جہاں سے ان کی میت اٹھا کر لائی گئی۔ میجر ایبٹ اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر میت کے ساتھ یہاں آئے اور ابا حضور کی تدفین تک یہیں رہے۔ جمعہ خان صاحب نے، جو آج ہمارے درمیان موجود ہیں، مجھے ابا حضور کے، میجر جیمز ایبٹ سے کیے گئے وعدے کے بارے میں بتایا تو میں ابا حضور کے ساتویں کے درود کے فوراً بعد ایبٹ صاحب سے ان کے دفتر میں، جمعہ خان کی معیت میں ملا اور انھیں یقین دلایا کہ میں ابا کے وعدے کو ایک فرض سمجھ کر پورا کروں گا۔ پھر میں اگلے دن ہی ان کے ساتھ نکل کھڑا ہوا اور ابا حضور کے چالیسویں سے پہلے ہی قبیلے والوں کو ہتھیار پھینکنے پر رضامند کر چکا تھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ابا حضور کے وعدے کا پاس رکھا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انگریز سرکار نے علاقے میں سڑک بچھا دی ہے۔ حالاں کہ اس پہاڑی علاقے میں یہ ایک ناممکن سی بات تھی۔ اب اس سڑک کو ہری پور سے ایبٹ آباد جانے والی بڑی سڑک سے ملانے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ جب یہ کام مکمل ہو گا تو اس علاقے میں انقلاب آ جائے گا۔ نور آباد میں سکول کے لیے زمین منتخب کی جا چکی ہے۔ اس پر بہت جلد عمارت کھڑی کی جا رہی ہے۔ جہاں ہمارے بچے پڑھ لکھ کر سرکار کے افسر بنیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک دن نور آباد کے نوجوان میجر آر۔ ایڈمز صاحب کی کرسی پر بیٹھے ہوں گے۔"

سردار جی نے آخری جملہ ڈی سی صاحب کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انتہائی جذباتی انداز میں ادا کیا۔ جس پر سب سے پہلے ڈی سی صاحب ہی نے تالی بجائی اور پھر دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔

ڈی سی صاحب نے رخصت ہونے سے قبل نور آباد سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ایک پورا گاؤں، موہڑہ، چھوٹے سردار جی کے نام لکھ دیا اور اس کے کاغذات چھوٹے سردار کو پاس بلا کر خود ان کے حوالے کیے اور کہا کہ "یہ آپ کی شادی کا تحفہ ہے، ممکن ہے اس وقت میرا تبادلہ ہو چکا ہو۔ اس لیے میں آپ کو پیشگی یہ تحفہ دے رہا ہوں۔" چھوٹے خان نے کاغذات لے کر شکریہ تو ادا کیا لیکن ان کے چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ تاہم بڑے سردار جی نے نہ صرف انتہائی خوشی کا اظہار کیا بل کہ اس وسیع القلبی پر ڈی سی صاحب کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔

(۲)

سردار صاحب کو حویلی میں منتقل ہوئے تین سال ہو چکے تھے۔ یہاں انھیں زندگی کی ہر آسائش میسر تھی۔ اگر چہ ان کے ذاتی ملازم صرف تین تھے لیکن پورا گاؤں ان کا ہر کام بلا معاوضہ کرنے پر تیار رہتا۔ گاؤں کے کئی لوگ ہر وقت ان کے آگے پیچھے پھرتے رہتے اور ان کے اشارے کے منتظر رہتے۔ لیکن اب وہ اپنے آپ کو کچھ تنہا تنہا سا محسوس کرنے لگے تھے۔

بیوی کی ناگہانی موت کے بعد انھوں نے دوسری شادی نہیں کی۔ انھوں نے صرف پانچ سال اس کے ساتھ گزارے۔ جب تک وہ زندہ رہی۔ انھیں اس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں رہا تھا لیکن اس کی ناگہانی موت کے بعد انھیں اچانک اس سے محبت ہو گئی تھی۔ جب ان کی بیوی، ماں اور بہن کی لاشیں مکان کے ملبے سے نکال کر چارپائیوں پر رکھی گئیں تھیں تو انھوں نے اپنی ماں اور بہن کا کفن سرکا کر ان کا منہ کئی بار دیکھا تھا، لیکن بیوی کا آخری دیدار کرنے کی ہمت انھیں ایک بار بھی نہیں ہو سکی تھی۔ کچھ عرصے بعد جب وہ اس صدمے سے باہر آئے تو انھیں ماں اور بہن کی موت کا تو یقین ہو گیا۔ لیکن بیوی کی موت کا انھیں کبھی یقین نہیں آیا۔ وہ جب بھی رات کو آنکھیں بند کرتے، ماں اور بہن کے مردہ چہرے سامنے آجاتے۔ لیکن بیوی کا مردہ چہرہ کبھی ان کے سامنے نہیں آیا۔ ان کی نگاہوں میں ہمیشہ اس کا زندہ چہرہ ہی رہتا۔ یہاں تک کہ کبھی خواب میں بھی انھوں نے اسے مرا ہوا نہیں دیکھا۔ حالاں کہ ماں اور بہن کی لاشیں انھوں نے کئی بار خواب میں بھی دیکھیں اور کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مارے خوف کے ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ آج تک نہیں سمجھ پائے تھے کہ ایسا کیوں ہے۔

ابا حضور نے اپنی زندگی میں کئی بار انھیں دوسری شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ جیسے ہی شادی کا نام آتا، ان کی آنکھوں کے سامنے اپنی مری ہوئی بیوی کا ہنستا مسکراتا چہرہ آجاتا اور وہ ٹال دیتے۔ ایک دو بار ابا حضور نے انھیں تحکمانہ انداز میں بھی دوسری شادی کرنے کو کہا۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر کہ میں ظفر علی کو سوتیلی ماں کا دکھ نہیں دینا چاہتا، ان کا حکم بھی ٹال دیا۔ حالاں کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے والد کے ہر فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کیا اور ان کا ہر حکم بجا لایا۔ یہاں تک کہ میجر جیمز ایبٹ سے کیے

ہوئے ان کے آخری وعدے کو نبھانے کے لیے سردھڑ کی بازی بھی لگادی۔ایک بار جب وہ اپنے قبیلے کے ایک دھڑے سے مذاکرات کرنے گئے تو اس نے انھیں غدار کہہ کر جان سے مارنے کی بھی دھمکی دی۔لیکن وہ باز نہیں آئے۔الٹا یہ کہہ کر انھیں اس دھمکی کا جواب دیا کہ اگر آپ لوگ باز نہ آئے تو مجھے اپنے باپ کی قسم، میں آپ لوگوں کا وہ حشر کروں گا، جو میرے باپ نے امر سنگھ اور اس کے بھائی کا کیا تھا۔

پھر ایک دن سب نے یہ منظر دیکھا کہ انھوں نے تمام لوگوں کو ہتھیار پھینکنے پر رضامند کر ہی لیا۔اگر چہ اس کے صلے میں انگریز سرکار نے ایک خاصا بڑا علاقہ انعام کے طور پر ان کی ملکیت میں دے دیا تھا لیکن آج تک انھوں نے نہ تو وہاں کے لوگوں کو، ان کی زمینوں سے، جو سرکار نے ان کی ملکیت میں دے دی تھیں، بے دخل کیا اور نہ ہی ذاتی طور پر ان سے کوئی لگان وغیرہ لیا۔البتہ سرکاری مالیے کے سلسلے میں انھوں نے سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ہر حال میں بحقِ سرکار جمع کرایا جائے۔وہ پوری ایمان داری سے سمجھتے تھے کہ سرکار اس آمدن کو لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ کرتی ہے۔

انھیں عطا کی گئی جاگیر کے تمام کاشتکار جانتے تھے کہ اگر وہ چاہیں تو ہمیں اسی وقت یہاں سے بے دخل کر سکتے ہیں لیکن یہ ان کی غریب نوازی اور غریب پروری تھی کہ انھوں نے جاگیر ملتے ہی یہ اعلان کر دیا:

''جو آدمی زمین کے جس قطعے کو کاشت کر رہا ہے وہ اسی کا ہے۔البتہ جس زمین پر کوئی ہل نہیں چلا سکتا۔اسے میں خود کاشت کروں گا اور جو ناقابلِ کاشت ہے وہاں میں پھل دار درخت لگاؤں گا۔''
اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔یہی وجہ ہے کہ علاقے کے تمام لوگ اب بھی دل سے ان کا احترام کرتے ہیں اور ان کا ہر حکم بجالانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔غدر کے موقع پر مری پر کیے جانے والے حملے کے سلسلے میں اردگرد کے کچھ لوگوں نے ان کی زمینیں کاشت کرنے والے لوگوں کو بھی اکسایا۔ابتدا میں کچھ لوگ تیار بھی ہو گئے،لیکن جب انھوں نے انھیں باز رہنے کو کہا تو سب نے ان کے فیصلے کو، نہ صرف یہ کہ تسلیم کیا بلکہ انھیں ممکنہ حملے کی تاریخ بھی بتا دی۔جس کی اطلاع انھوں نے فوراً ڈی سی ہزارہ کو کر دی۔یوں اس بغاوت کو بروقت کچل دیا گیا۔

جب اس بات کی خبر ضلعی حکام تک پہنچی کہ سردار فقیر محمد خان نے سرکار کی طرف سے عطا کی گئیں زمینوں سے نہ تو لوگوں کو بے دخل کیا اور نہ ہی کوئی آمدنی اپنے لیے لینے کا فیصلہ کیا ہے تو انھیں بہت حیرانی ہوئی اور وہ بھی ان کے دل سے قائل ہو گئے۔انھیں سرکار کی طرف سے جاگیر عطا ہوئے سولہ سترہ

سال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تین سال پہلے تک وہ اسی مکان میں رہ رہے تھے، جو انھوں نے تیز بارشوں والے سال کے بعد خود بنایا تھا۔ وہ تو ان کے شہر میں رہائش پذیر دوستوں اور ڈی سی صاحب نے انھیں یہ شاندار حویلی بنا کر دینے کا منصوبہ بنایا تھا ورنہ وہ آج بھی اسی مکان میں رہ رہے ہوتے۔ جب ڈی سی صاحب نے اپنے دفتر میں ان کے بعض خیر خواہوں کی موجودگی میں اس حویلی کی تعمیر کا منصوبہ ان کے سامنے رکھا تو انھوں نے اسے بھی ایک سرکاری حکم سمجھ کر اس سے فوراً اتفاق کر لیا۔

ابھی تین سال پہلے حویلی کے افتتاح کے موقع پر جب ڈی سی صاحب نے چھوٹے سردار کی شادی کے پیشگی تحفے کے طور پر ایک پورا گاؤں ان کے نام کیا تو متعلقہ گاؤں کے باشندوں کو بے حد خوشی ہوئی اور وہ خود مبارک باد دینے آئے کیوں کہ اب وہ خود کو پہلے سے بھی زیادہ محفوظ سمجھنے لگے تھے۔

وہ ایک انتہائی قناعت پسند آدمی تھے اور ہر معاملے میں راضی بہ رضا رہتے تھے۔

البتہ اپنے اکلوتے بیٹے ظفر علی خان کے سلسلے میں وہ پچھلے کچھ عرصے سے پریشان سے رہنے لگے تھے۔ جب سے گلیات کے جنگل میں اس کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا اور جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کی اس کیفیت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر، حکیم، پیر فقیر سب آزمائے جا چکے تھے۔ لیکن چھوٹے سردار صاحب کی دماغی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

اور اب کچھ دنوں سے اس پر کبھی کبھی دیوانگی سی طاری ہو جاتی ایسی کیفیت میں وہ حویلی سے کلومیٹر بھر کے فاصلے پر اوپر پہاڑ کے دامن میں واقع غار کی چھت پر جا بیٹھتا اور دن بھر وہاں غار کی پتھریلی چھت پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا۔ البتہ شام ہونے سے پہلے پہلے وہ گھر آ جاتا۔ ایسا اگرچہ کبھی کبھی ہوتا لیکن جب بھی اس پر یہ پراسرار کیفیت طاری ہوتی، اسے وہاں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ جب بھی وہاں جاتا اپنی بنائی ہوئی لکیروں کو دیکھتا رہتا اور انھیں مزید گہرا کرتا رہتا۔ گو وہ ہر بار شام تک خود گھر آ جاتا اور بظاہر اس کی حالت بھی ٹھیک تھی۔ لیکن تھی تو بہر حال یہ تشویش کی بات۔

(۳)

اس نے دونوں گھڑے پانی سے بھرے؛ سر کا دوپٹہ درست کر کے اس پر اِنّو جمایا، دونوں گھڑے اوپر نیچے رکھے، انھیں اُٹھایا، سر پر رکھا اور گھر کی طرف چل پڑی۔

وہ پتلی کمر اور بھاری ٹخنوں والی ایک ایسی لڑکی تھی جس کا سینہ بھرا بھرا، گردن لمبی، آنکھیں گول اور سیاہ، ہونٹ پر ناک کے دائیں نتھنے کے نیچے سیاہ لمبوترا تل، بھویں گھنگریالی اور بال لمبے اور سیاہ تھے۔ اس کا قد پانچ فٹ کے قریب؛ عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ اور نام صابرہ خانم تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنی گردن کو یوں تانا کہ سر میں ذرا سی بھی لچک نہ آنے پائے۔ پہلے اوپر والے گھڑے کو انتہائی احتیاط سے اتارا اور برآمدے کے بائیں کونے میں بنی ہوئی دیوار پر رکھا، پھر دوسرا گھڑا اس کے برابر میں رکھ کر، اِنّو کو برآمدے کے درمیان والے ستون میں لگی لکڑی کی کیل سے لٹکا دیا۔

یہ دو کمروں پر مشتمل ایک مکان تھا۔ دونوں کمرے بالکل متوازی تھے اور ان کے آگے برآمدہ تھا۔

برآمدے سے کمرے میں داخل ہوتے ہی جس چیز پر سب سے پہلے نظر پڑتی تھی وہ لکڑی کا ایک خوبصورت ستون تھا، جو کمرے کے عین وسط میں ایک خوبصورت تراشیدہ پتھر پر ایستادہ تھا، جس کا اوپر والا سرا چھت کے دو بڑے شہتیروں کا مقامِ اتصال تھا۔ ستون پر بنے نقش و نگار بنانے والے کی محنت، مہارت اور ذوق کا پتہ دے رہے تھے۔ شہتیروں کے مقامِ اتصال سے ڈیڑھ فٹ نیچے ستون میں لکڑی کی ایک کیل بھی انتہائی مہارت سے ٹھونکی گئی تھی، جس پر ایک؛ دونالی بندوق لٹک رہی تھی۔ بندوق کی نالیوں کا رخ پچھلی دیوار کی طرف تھا۔ جہاں ستون کی لکڑی سے ملتی جلتی لکڑی کے تختوں کی ایک کارنس بنی ہوئی تھی جو کمرے کی پچھلی دیوار کو محیط تھی۔ کارنس پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک سرخ کپڑا، اس طرح بچھا ہوا تھا کہ کارنس کی چوڑائی برابر نیچے لٹک رہا تھا کپڑے کے لٹکاؤ والے حصے پر سفید رنگ کی کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ جب کہ بچھے ہوئے حصے پر مٹی، پیتل، کانسی اور تانبے کے برتن، انتہائی سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ کارنس کے اوپر دیوار میں لکڑی کی کیلیں ٹھونک کر اس پر چنگیریں اور سجاوٹ کی دیگر چیزیں آویزاں کی گئیں تھیں۔

کمرے کے جنوبی کونے میں مٹی کا ایک بڑا سا بھڑولا بنا ہوا تھا، جس کے سوراخ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا جس سے واضح ہوتا تھا کہ وہ غلے سے بھرا ہوا ہے۔ بھڑولے کے ساتھ لکڑی کا ایک بڑا صندوق تھا، جس میں بستر اور کپڑے وغیرہ ٹھونسے گئے تھے؛ جس کی وجہ سے اس کا اوپر والا پلڑا اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ جب کہ شمالی کونے میں ایک تنگ سا ایک پٹ والا دروازہ تھا جو دوسرے کمرے میں جا کھلتا تھا۔ کمرے کا فرش مٹی کا تھا جس پر گارے سے لپائی کی گئی تھی۔

اگلی دیوار کے عین وسط میں ایک دو پٹوں والا خوبصورت دروازہ تھا، جس کی کنڈی بھی لکڑی کی تھی۔ دروازے کے دائیں بائیں دونوں طرف ایک ایک کھڑکی تھی۔ دروازے اور کھڑکیوں کی چوکھٹوں پر، نقش و نگار بنے ہوئے تھے جو ستون کے نقش و نگاروں سے اتنے ملتے جلتے تھے کہ ایک ہی خالق کے ہونے پر دال تھے۔

باہر برآمدے میں دونوں طرف ایک آدمی کی قامت جتنی بلند اور دو فٹ چوڑی دیواریں تھیں۔ بائیں سمت والی دیوار میں چراغ جلانے کے لیے طاق بنا ہوا تھا اور اس کے عین نیچے مٹی کا چولہا؛ جس پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ دیوار کے اوپر پانی کے گھڑے اور روزمرہ استعمال کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ دونوں کمروں کے، جڑے ہوئے برآمدے کی چھت کو، چار ستون سہارا دیے ہوئے تھے جب کہ آگے گارے سے لپائی کیا ہوا کھلا صحن تھا؛ جو دراصل اس مکان کے عین آگے دس فٹ نیچے بنے ہوئے مکان کی چھت تھی۔

گاؤں کے تمام مکان کم و بیش اسی ترتیب سے بنے ہوئے تھے۔ مکان ڈھلوان ٹیلوں پر یوں بنے تھے کہ سب سے آگے والے مکان کی چھت اپنے سے پچھلے والے مکان کا صحن تھا اور اس کی چھت اس سے پچھلے مکان کا؛ اور یہ سلسلہ کافی اوپر تک پھیلا ہوا تھا۔ دور سے دیکھنے پر یوں دکھائی پڑتا تھا کہ یہ کئی کئی منزلہ ٹلیائی عمارتیں ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ ایسی عمارتوں کے برآمدے نہیں ہوتے۔ لیکن یہاں برآمدہ ہر منزل کا جزو لاینفک تھا۔ تمام مکانوں کی دیواریں پتھر کی جب کہ چھت لکڑی کی تھی جس پر مٹی ڈال کر اوپر سے لپائی کی گئی تھی۔ دیواروں اور فرش کا پلستر بھی لس مٹی کے گارے کا تھا جن کے اوپر نیل کی سفیدی کی گئی تھی۔

صابرہ کی ماں نے، جو اس وقت چولہے میں لکڑیاں جھونک رہی تھی، اسے بڑے گھڑولے سے لسی ڈال کر لانے کو کہا۔ اس نے لسی کا کٹورا ماں کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا:

''اماں آج جمعرات ہے مکھن گرم نہیں کرنا؟ پورے سات دن ہو گئے ہیں کل سے تو وہ کھٹا

ہونا شروع ہو جائے گا۔"

"کروں گی بیٹا میں ذرا کٹوی تو رکھ لوں۔تمھارے ابا آنے والے ہوں گے۔آتے ہی کھانے کے لیے شور ڈالیں گے، آج انھیں بڑے سردار جی نے بڑی حویلی میں سویرے سویرے ہی بلا بھیجا تھا۔ پیغام ملتے ہی وہ ناشتہ کیے بغیر ہی چل دیے۔ میں نے کہا بھی کہ ناشتہ کر کے جائیں لیکن انھوں نے کہا کہ بڑے سردار جی نے یاد فرمایا ہے۔ وہ وہاں میرا انتظار کرتے رہیں اور میں یہاں بیٹھا ناشتہ کرتا رہوں۔ایک دن نہ بھی کیا تو قیامت نہیں آجائے گی"۔اس کی ماں نے بغیر وقفہ دیے تقریر جھاڑی۔

"کہہ بھی تو ٹھیک ہی رہے تھے۔ہمارے سردار جی ہیں بھی تو بہت اچھے آدمی۔کوئی اور ہوتا تو کب کا ہمیں یہاں سے بے دخل کر چکا ہوتا۔لیکن وہ تو ان داتا ہیں۔خدا نے انھیں جتنی زمین دی ہے اس سے بھی بڑا دل؛ اور پھر وہ تمھارے ابا کو تو دوست کہتے ہیں۔حالاں کہ کہاں ہم جیسے غریب اور کہاں وہ۔" صابرہ کی ماں نے خود ہی اپنے شوہر کے ناشتہ نہ کر کے جانے کے فیصلے کو درست قرار دے کر، اس کے حق میں دلائل دینا شروع کر دیے۔

"ہاں اماں۔ابا ٹھیک کہتے ہیں۔ دیکھو نا۔انھوں نے یہاں سڑک بنوائی۔سکول بنوایا۔ جہاں میرا بھائی پڑھ لکھ کر نوکری کرے گا۔کاش یہ سکول پہلے بن جاتا۔تو میں بھی سکول جاتی۔' صابرہ نے حسرت بھرے انداز میں کہا۔

"لڑکیاں کہاں سکول جاتیں ہیں پتر۔اور وہ بھی انگریزی سکول میں۔لڑکیاں تو بس قرآن شریف پڑھتی ہیں۔ جو مولوی صاحب نے تجھے پڑھادیا ہے۔" ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں جاتیں اماں، میں نے سنا ہے کہ شہر میں لڑکیاں بھی سکول جاتیں ہیں۔' صابرہ نے جواب دیا۔

"تو بھی سنی سنائی پر یقین کر لیتی ہے۔بھلا لڑکیاں بھی کبھی سکول گئی ہیں؟ لڑکیوں نے نوکری تھوڑا ہی کرنی ہوتی ہے۔" ماں نے اسے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی۔

"ماں مجھے افسوس ہے میں بڑی ہو گئی ہوں۔ورنہ میں تمھیں منا ہی لیتی سکول جانے کے لیے۔نہیں تو میں سردار جی کو کہتی۔وہ ضرور مجھے اجازت دے دیتے۔پچھلی دفعہ جب وہ ہمارے گھر آئے تھے تو انھوں نے مجھے بہت پیار سے دلاسہ دیا تھا۔چل چھوڑ۔آج مکھن کی کھناس سے حلوہ ضرور بنانا۔ بہت مزے کا ہوتا ہے۔" صابرہ نے لاڈ سے کہا۔

"اچھا بناؤں گی۔شام کو۔تو ذرا بھینس کے آگے پانی تو رکھ آ۔ بے چاری پیاسی ہے صبح

ہے۔'' ماں نے اسے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''اماں آپ کتنی اچھی ہیں۔میری ہر بات مان لیتی ہیں۔سوائے سکول جانے کے۔'' صابرہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی اور بھینس کے ڈھارے کی طرف چل پڑی۔

''اور ہاں دیکھنا۔اس نے چارے والا ٹب الٹا نہ دیا ہو۔'' ماں نے پیچھے سے آواز لگائی۔

''اتنی جلدی چھٹی ہو گئی تجھے؟'' ۔ماں نے منے کو مکان کے پچھواڑے سے صحن میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''آج ماسٹر صاحب نہیں آئے۔چوکیدار بابا نے چھٹی دے دی۔وہ کہتے ہیں ماسٹر بیمار ہے۔'' بچے نے جواب دیا۔

''ابھی پچھلے ہفتے تو وہ بیمار ہوئے تھے۔آج پھر بیمار ہو گئے۔اچھا بستہ رکھ اور جا بکریوں کا پتہ کر کے آ۔کہیں فصلیں نہ اجاڑ رہی ہوں۔'' ماں نے جھنجھلا کر کہا۔

بچے نے تختی اور قاعدہ چارپائی پر پھینکا اور تیزی سے مکان کے پچھواڑے کی طرف نکل گیا۔

''سردار جی نے صابرہ کا رشتہ مانگا ہے اور میں انھیں انکار نہیں کر سکا۔لہٰذا میں تم سے مشورہ کیے بغیر انھیں ہاں کر آیا ہوں۔'' حسن علی نے چادر اتار کر برآمدے کے ستون کے ساتھ لٹکاتے ہوئے، اپنی بیوی سے کہا، جو چولہے میں لکڑیاں جھونک رہی تھی۔

''کیا!!!۔'' صابرہ کی ماں ہکی بکی ہو کر حسن علی کا منہ دیکھنے لگی۔

صابرہ جو اسی لمحے صحن میں داخل ہو رہی تھی، یک بارگی لرز سی گئی اور اس کے ہاتھ میں پکڑا چارے کا ٹب نیچے لڑھک گیا، جس کی آواز پورے گھر میں بھر گئی۔

حسن علی کی بیوی جو ہکی بکی ہو کر اپنے شوہر کا منہ دیکھ رہی تھی، یک دم سنبھل سی گئی۔دونوں میاں بیوی کو اندازہ ہو گیا کہ صابرہ کے کانوں تک بات پہنچ گئی۔دونوں خاموش ہو گئے۔

(۴)

دوسو کے قریب گھروں پر مشتمل، نورآباد میں آج رات نور کا سا سماں تھا۔ آج کی رات کے جشن کی تیاری ٹھیک ایک مہینہ پہلے اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب حسن علی نے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کی ہامی بھری تھی اور سردار جی نے منگنی کے بجائے شادی کی تاریخ طے کر دی تھی۔

اگلے ہی دن اوپر پہاڑ پر موجود چیڑ کے جنگل سے دو بزرگ ترین دیو قامت درخت گرائے گئے۔ کئی درختوں کے تنوں پر کلھاڑیوں سے گہرے گھاؤ بنائے گئے اور ان گھاؤوں کے نیچے لکڑی کے کریٹ اس طرح نصب کیے گئے کہ چیڑ کے تنوں سے رِستے ہوئے جیکن کا کوئی قطرہ زمین پر نہ گرنے پائے۔

گرے ہوئے درختوں کے تنوں کو لڑھکا کر گاؤں کے پیچھے موجود بڑے میدان تک لایا گیا۔ جہاں انھیں اس طرح چیرا گیا کہ تنوں کی باقی لکڑی، ان کے عین درمیان میں موجود سرخی مائل حصے سے بالکل الگ ہو جائے۔ پھر اس سرخ لکڑی کو چیر کر اس کی لاٹھیں بنائی گئیں۔ چیڑ کی لکڑی کے اس سرخ حصے کو، جسے گاؤں والے ''دِلی'' کہتے ہیں، اگر جلتے ہوئے کوئلوں پر رکھ دیا جائے تو فوراً آگ پکڑ لیتا ہے اور پھر جلتا رہتا ہے۔ اس کا شعلہ اتنا بلند ہوتا ہے کہ مشعل کی صورت اس کی روشنی دور دور تک دکھائی دیتی ہے۔

آج دن کے وقت تمام مکانوں کی چھتوں پر ایک ایک موٹا شہتیر کھڑا کر کے اس کے ساتھ ''دِلیوں'' کی لٹھیں اس طرح باندھیں گئیں کہ شہتیر آگ نہ پکڑ سکیں۔ شام کو سورج غروب ہوتے ہی انھیں آگ لگا دی گئی۔

حویلی کے چاروں کونوں پر بھی اسی طرح کے شہتیر نصب کیے گئے اور ان کے ساتھ ''دِلیوں'' کی لٹھیں باندھی گئیں جب کہ حویلی کے بیرے اور صحن کے چاروں طرف مٹی کے پیالوں میں جیکن ڈال کر اسے آگ لگا دی گئی، جس سے حویلی بقعہ نور بن گئی۔ عشاء کی نماز کے بعد سردار جی اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مغرب کی جانب واقع ایک ٹیلے پر سے حویلی کا نظارہ کرنے گئے۔

آج وہ بہت خوش تھے۔ انھیں اتنا مسرور آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ہوتے بھی کیوں

نہ آج ان کی برسوں کی مراد بر آئی تھی ۔ظفر علی خان کی، جوان کی امیدوں کا واحد سہارا تھا، آج مائیوں کی رات تھی ۔کل وہ حسن علی کی بیٹی صابرہ خانم کو اپنی بہو بنا کر گھر لے آئیں گے۔

وہ پچھلے چھ سات سالوں سے اپنے بیٹے کی شادی کا خواب دیکھ رہے تھے ۔وہ بظاہر تو خاصا صحت مند تھا، لیکن گلیات میں اس کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد کچھ عرصہ اس پر متواتر جنون کے دورے پڑتے رہے اور وہ اوپر غار کے پتھریلے چھت پر بیٹھ کر وہاں آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دوروں کا درمیانی وقفہ بڑھتا گیا لیکن وہ مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو سکا۔کچھ عرصہ اسے ایبٹ آباد میں بھی رکھا گیا، کہ شاید آب وہوا کی تبدیلی سے، کچھ افاقہ ہو مگر یہ تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو سکی جب اس پر دورہ پڑتا تو وہ وہاں سے بھی کسی نہ کسی طرح گاؤں بھاگ آتا اور سیدھا غار کی چھت پر جا کر بیٹھ جاتا۔

پھر ایک انگریز ڈاکٹر نے انھیں مشورہ دیا کہ چھوٹے سردار صاحب تنہائی کا شکار ہیں؛ اور ایسی حالت میں تنہائی مرض میں اور بھی اضافہ کرتی ہے ۔لہٰذا فوری طور پر ان کی شادی کر دی جائے ۔اس طرح ان کا دل بھی بہل جائے گا اور گھر بھی آباد ہو جائے گا۔لیکن ساتھ ہی یہ بھی تاکید کی کہ شادی اس کی مرضی اور پسند سے کی جائے ورنہ اس کا الٹا اثر بھی پڑ سکتا ہے اور اگر برادری سے باہر ہو تو اور بھی اچھا ہے۔اس سے بیماری اولاد میں منتقل ہونے کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔

سردار جی کو یہ مشورہ بہت پسند آیا۔لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسے شادی پر تیار کیسے کیا جائے۔کئی مرتبہ جب ظفر علی خان بالکل نارمل حالت میں تھا، انھوں نے شادی کی بات چھیڑی لیکن اس نے انتہائی ادب سے ٹال دی۔

ایک رات جب وہ اپنی معمول کی مہم جوئی سے واپس آیا تو سیدھا ان کے کمرے میں آیا۔وہ بہت کم ان کے کمرے میں آتا تھا۔سردار جی نے مہینوں بعد اسے اپنے کمرے میں دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔وہ کافی دیر باادب کھڑا رہا۔سردار جی نے اسے بیٹھنے کو کہا بھی مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔انھیں شک سا ہوا کہ وہ کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے گلے سے لگا کر کہا۔

''میرا خیال ہے تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔''

''جی جی جی ۔وہ بہ ابا جی۔'' وہ اتنا ہی کہہ پایا۔

''کہو بیٹا ۔ میں تمھاری ہر خواہش پوری کروں گا۔خدا کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس۔'' انھوں نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

''ابا جی ۔۔۔۔'' وہ پھر چپ ہو گیا۔

''کہو نا بیٹا۔ جو بھی دل میں ہے کہہ دو۔ دل میں بات رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ اس سے ذہن پر بوجھ پڑتا ہے۔'' انھوں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نے ایک لڑکی دیکھی ۔۔۔۔''

''کون ہے بیٹا، تجھے اچھی لگی؟'' وہ مارے خوشی کے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑے۔

''جی ہاں۔ مجھے اچھی لگی۔ لیکن وہ ہماری برادری کی نہیں اور ہمارے گاؤں کی بھی نہیں۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوا؟ جو بھی ہے بیٹا تم جلدی بتاؤ۔ میں تو تمھارے سر پر سہرا دیکھنے کو ترس گیا ہوں۔'' انھوں نے بے تابی سے کہا۔

''وہ موہڑے والے حسن علی کی بیٹی ہے۔'' اس نے بات اگل دی۔ اسے لگا جیسے اس کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ انھوں نے مارے خوشی کے اسے اٹھ کر گلے لگا لیا۔

''اگر میری صحت ٹھیک ہوتی تو میں ابھی اور اسی وقت حسن علی کے گھر جاتا۔ پر خیر صبح سویرے اسے پیغام بھجواتا ہوں۔'' انھوں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اسے ایک مرتبہ پھر گلے لگا لیا۔

انھوں نے فوراً منشی کو بلایا اور صبح سویرے حسن علی کو بلانے کی ہدایت دی۔ منشی نے محسوس کیا کہ آج سردار جی کی طبیعت خاصی سنبھلی ہوئی ہے اور ان کے چہرے پر ایک ایسی رونق ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ حتیٰ کہ حویلی کے افتتاح کے موقع پر بھی نہیں اور اس وقت بھی نہیں جب ڈی سی صاحب نے موہڑے کا پورا گاؤں چھوٹے سردار جی کے نام لکھ دیا تھا۔

ساری رات سردار جی کے کانوں میں شہنائیاں بجتی رہیں۔

حسن علی سورج نکلنے سے پہلے حویلی میں سردار جی کے کمرے میں تھا۔

''حسن علی۔! میں نے تم سے ایک بہت اہم بات کرنی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں یہ بات کرنے تمھارے گھر آتا لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے تمھیں یہاں بلانا پڑا۔'' سردار جی گویا ہوئے۔

''سردار جی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ہم آپ کے خادم ہیں۔ آپ سو مرتبہ ہمارے گھر آئیں لیکن کسی کام کے لیے کیوں آئیں۔ جب کام ہو تو ہم حاضر۔ آپ اگر رات کے پچھلے پہر بھی بلاتے تو میں سر کے بل حاضر ہوتا۔'' حسن علی نے عاجزی سے کہا۔

''نہیں یہ بات ہی ایسی ہے کہ مجھے آنا چاہیے تھا۔اس لیے مجھے معاف کرنا اور انکار نہ کرنا۔''سردار جی نے کہا۔

''حضور! آپ حکم کریں۔میری جان بھی حاضر ہے۔''حسن علی کے لہجے میں تجسس تھا۔

''میں تمھاری بیٹی کا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں''۔سردار جی نے مدعا بیان کیا۔

''کیا!!!''حسن علی کچھ ٹپٹا سا گیا۔اسے اپنے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''وہ میرا بیٹا ہے نا!ظفر۔اس کی خواہش ہے کہ اس کی شادی تمھاری بیٹی سے ہو اور تم تو جانتے ہو کہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اس کی ہر خواہش پوری ہو۔۔۔۔۔''سردار جی نے پوری بات اس کے گوش گزار کی۔

ظفر کا نام سن کر اس کی جان میں جان آئی۔ورنہ وہ پہلے کچھ اور سمجھا تھا۔سنبھل کر فوراً ہی گویا ہوا:

''حضور یہ تو آپ کی عنایت ہے کہ آپ نے مجھے اور میری بیٹی کو اس قابل سمجھا۔ورنہ کہاں حضور؟اور کہاں ہم غریب لوگ۔''

''اس وقت تم امیر ہو اور میں غریب۔میں مانگنے والا ہوں اور تم دینے والے۔بہر حال یہ میری اور میرے بیٹے کی خواہش ہے۔کوئی حکم نہیں۔اس لیے تم پر کوئی دباؤ نہیں۔تم گھر جا کر بیوی سے مشورہ کر کے۔۔۔۔''

''حضور! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔بھلا میری بیوی کو اس خوش قسمتی پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''نہیں۔پھر بھی تم جا کر بیوی سے مشورہ کر لو اور کل تک مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دو۔'' سردار جی نے تحمل سے کہا۔

حسن علی خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔اس نے حویلی سے اپنے گھر تک کا راستہ عجیب سرشاری میں طے کیا لیکن گھر کے قریب پہنچ کر اس نے کچھ سوچا اور سنجیدہ سا ہو گیا۔

گھر پہنچ کر جب اس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ بڑے سردار جی نے صابرہ خانم کا رشتہ مانگا ہے تو وہ بھی پہلے یہی سمجھی کہ انھوں نے اپنے لیے رشتہ مانگا ہے۔وہ اس خیال ہی سے پریشان ہو گئی۔یہ بات اسی وقت صابرہ کے کان میں بھی پڑ گئی تھی۔اس کا سارا وجود سن ہو گیا اور اس کا جی متلانے لگا۔پہلے اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹب گرا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ خود بھی ٹب کے اوپر اوندھی پڑی ہوئی تھی۔

دونوں میاں بیوی نے اسے اٹھا کر چارپائی پر ڈالا۔ماں اس کے تلوے ملنے لگی اور باپ گھبرائے انداز میں اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔جب اسے ہوش آیا تو حسن علی نے اپنی

بیوی کو اندر کمرے میں لے جا کر فوراً اصل بات بتائی۔اس کی بیوی کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک ابھری اور مارے خوشی کے اس سے لپٹ گئی،اور کافی دیر تک لپٹی رہی۔پھر یک دم اسے کوئی خیال آیا اور وہ بھاگتی ہوئی صابرہ کے پاس پہنچی جو ابھی تک کسی گہری سوچ میں گم تھی۔اس نے صابرہ کو سینے سے لگایا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔وہ حیرت سے اپنی ماں کا منہ دیکھنے لگی۔اس حیرت میں خوشی کا عنصر بہت نمایاں تھا۔پھر وہ شرما کر ماں کی چھاتی سے لپٹ گئی۔دیر تک ماں بیٹی کے کانوں میں شہنائی کی آواز گونجتی رہی۔

سہاگ رات کو جب ظفر علی خان کمرے میں داخل ہوئے تو وہ شرم سے سمٹنے لگی۔اس کے دل کی دھڑکن تیز اور کانوں کی لویں گرم ہو گئیں۔اسے لگا کہ جیسے چھوٹے سردار جی کے چھوتے ہی اس کا وجود پگھل جائے گا۔

ظفر علی خان کافی دیر پلنگ کے پاس کھڑے اسے دیکھتے رہے۔پھر جیسے ہی پلنگ پر بیٹھے، اس کے پورے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ظفر علی خان نے اس کا گھونگٹ اٹھایا تو اسے لگا جیسے پگھلاؤ کا عمل شروع ہو گیا ہے۔باوجود اس کے کہ یہ دسمبر کے دن تھے اور گلیات کے پہاڑوں پر پڑنے والی برف کی ٹھنڈک حویلی کے درودیوار بھی محسوس کر رہے تھے،اس کا جسم تھل کے ریگستانوں کی طرح تپ رہا تھا۔

جب ظفر علی خان نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس کے دائیں کان کی لووں کے قریب سے پسینے کا ایک بڑا سا قطرہ آہستہ آہستہ نیچے کو سرک رہا ہے۔جب وہ اس کے رخساروں کے قریب سے ہوتا ہوا گلے میں پہنے ہوئے ہار تک پہنچا تو وہیں اٹک گیا۔اسی اثنا میں بائیں کان کی لووں سے چھوٹا ہوا ایک اور بھاری قطرہ بھی تیزی سے نیچے کو سرکا،جیسے ہی وہ پہلے قطرے سے ٹکرایا،دونوں نے مل کر ایک دھار کی شکل اختیار کر لی جو تیزی سے اس کے سینے کی طرف بہنے لگی۔جب وہ اس کے سینے کے ابھاروں کے عین درمیان سے گزر رہی تھی،اسے اس کی سرسراہٹ دور اندر دل کی گہرائیوں تک سنائی دی اور اس کے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔یہاں تک کہ وہ ناف کے پیالے میں جا گری۔جہاں سے یہ گیلا ہٹ اس کے سارے بدن میں پھیل گئی۔

ظفر علی خان،اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے،اس کی ہتھیلی کی لکیروں کو مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔اسے لگا جیسے یہ لکیریں اس نے اس سے پہلے بھی بار ہا دیکھ رکھی ہیں۔لیکن کہاں؟اس نے تو اس سے پہلے کبھی کسی کی ہتھیلی اتنے غور سے دیکھی ہی نہیں تھی۔یہاں تک کہ اپنی بھی نہیں۔

''مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے۔''اس نے سوچا۔

وہ کافی دیر کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔اس نے بے خیالی میں نظر اٹھا کر صابرہ کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے لگا کہ جیسے وہ اس سے بارہا مل چکا ہے۔حالاں کہ اس نے اس سے پہلے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی تھی،اور وہ بھی سرسری سی۔وہ کوہ پیائی کے بعد واپس آرہا تھا کہ اسے آگے سے وہ بکریوں کے پیچھے پیچھے آتی دکھائی دی۔اس کے گھوڑے کو دیکھتے ہی بکریاں بھاگتی ہوئیں نیچے سرسوں کے کھیت میں اتر گئیں تھیں۔اسے دیکھ کر وہ لجاسی گئی۔وہ اسے دیکھنے کے لیے رکا ہی تھا کہ صابرہ بھی رستہ پھلانگ کر بکریوں کے پیچھے کھیت میں اتر گئی تھی۔وہ ٹھیک سے اس کا چہرہ بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔لیکن نہ جانے وہ کیوں اسے اچھی لگی۔

ستواں ناک کے نیچے دائیں طرف،اوپر والے ہونٹ کے پیچھے ایک باریک سا تل تھا،جو عام گول تلوں سے بالکل مختلف تھا۔یہ تل لمبوترا سا تھا۔بغور دیکھنے پر ایسا لگتا تھا جیسے کوئی درویش کہیں کمبل اوڑھے سو رہا ہو۔

''میں نے ایسا تل پہلے کہاں دیکھا ہے؟''اس نے دماغ پر زور ڈالنے کی کوشش کی۔

اس نے جب صابرہ کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کی نگاہوں میں آبشار والی لڑکی گھوم گئی اور وہ اس کے ساتھ اڑنے لگا۔

''تم کہاں گم ہوگئی تھی۔میں تمھیں پورے جنگل میں تلاش کرتا رہا۔''اس نے صابرہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''جی جی ی ی۔میں ں ں ں۔کہیں نہیں۔میں تو کہیں نہیں۔وہ جی۔وہ بکریاں۔۔کھک کھک۔کھیت میں۔چلی گئیں تھیں نا۔جی۔''صابرہ نے گھبرائے ہوئے انداز میں بہ مشکل کہا۔

جوں ہی صابرہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی،اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ خود کو اس کی آنکھوں سے باہر نکالا اور واپس اپنے کمرے میں آگرا اور بستر پر دراز ہوگیا۔

''لگتا ہے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''یہ سوچتے ہوئے صابرہ کچھ پریشان سی ہوگئی۔اس پریشانی نے اس کی شرم کو ہمدردی میں بدل دیا۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''اس نے ظفر کے گال سہلاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔''ظفر نے چھت میں گھورتے ہوئے کہا۔کچھ دیر وہ اسی طرح لیٹا چھت میں گھورتا رہا اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کے دماغ میں برف سی اڑتی رہی۔جس میں کوئی بھی منظر واضح نہیں تھا۔

"میں آپ کے لیے پانی لے آؤں۔" صابرہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی؛ اور اس نے دھند لے سے منظر سے ایک شفاف منظر کی طرف مراجعت کی۔ جس میں اس کی نئی نویلی دلھن اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔ جس کی نگاہوں میں محبت، ہمدردی، حیرت اور پریشانی کے جذبات اس طرح مل گھل گئے تھے کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا، ناممکن سا ہو گیا تھا۔

ظفر؛ صابرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، خود کو سنبھالنے کی کوشش میں اٹھ کر بیٹھ گیا وہ کافی دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جسے دیکھ کر صابرہ کی آنکھوں سے پہلے پریشانی؛ پھر حیرت اور پھر ہمدردی کے جذبات آہستہ آہستہ غائب ہونا شروع ہو گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ان میں ہر طرف محبت ہی محبت تھی۔ ظفر نے محسوس کیا کہ جوں جوں اس کی آنکھوں سے پریشانی، حیرت اور ہمدردی کے جذبات غائب ہوتے گئے، اس کی آنکھیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ اس نے خود کو ان میں ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ صابرہ کا ٹھنڈا وجود ایک مرتبہ پھر تپنے لگا اور اس نے فوراً پلکیں جھکا لیں۔

ظفر نے پلنگ کے ساتھ رکھی ہوئی لالٹین کا شیشہ انتہائی احتیاط سے اوپر اٹھا کر پھونک ماری اور پورا کمرہ اندھیرے کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گیا۔ جس میں وہ دونوں ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ آہستہ آہستہ ان کے سانس پھولنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کے تیز سانسوں کی آواز اندھیرے کے اس اتھاہ سمندر سے باہر جلتے ہوئے دئیوں کو بھی صاف سنائی دینے لگی۔

اتھاہ اندھیرے کے اس سمندر میں ان آوازوں کے عین عروج کے لمحوں میں ظفر علی کے ذہن میں روشنی کا ایک کوندا سا لپکا۔ جس میں بیک وقت کئی مناظر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے:

"گرتی ہوئی آبشار۔

جھلملاتی روشنی۔

فضا میں بلند ہوتا پتھریلا تخت۔ اڑتی ہوئی پری۔

گرتی ہوئی آبشار کے سرے پر کھڑی خوبصورت لڑکی۔

غار کا پتھریلا چبوترا۔

پتھریلے چبوترے پر انسانی ہتھیلی کی لکیروں سے مماثل لکیریں۔

خوبصورت ہونٹ۔

ہونٹوں پر ایک لمبوترا سیاہ تل۔

ایک خوبصورت ہاتھ۔

ہاتھ کی ہتھیلی پر جانی پہچانی لکیریں۔

آبشار۔ہونٹ۔لکیریں۔تل۔غار۔چبوترا۔روشنی۔تخت۔پری۔لڑکی۔ہاتھ

لڑکی۔غار۔ہونٹ۔ہتھیلی۔روشنی۔تخت۔لکیریں۔پری۔چبوترا۔آبشار۔

تخت۔روشنی۔آبشار۔تل۔لکیریں۔لڑکی۔ہتھیلی۔۔۔۔۔۔۔

لکیریں۔لکیریں۔لکیریں۔لکیریں۔ہتھیلی۔ہتھیلی۔

لکیریں۔لکیریں۔لکیریں۔چبوترا۔چبوترا۔چبوترا

ہتھیلی۔چبوترا۔لکیریں۔ہتھیلی۔۔۔۔۔۔۔

پھر یک دم منظر بدل گیا:

ایک ہیولا۔پتھریلا چبوترا۔برف باری۔آسمان۔چودھویں کا چاند۔ستارے۔خرگوش۔برف پر پنجوں کے نشان۔مردانہ ہتھیلی۔لکیریں۔

کالا کمبل۔گرندے کا کانٹا۔زلزلہ۔چبوترے میں دراڑ۔سفید چاندنی میں برف باری۔برف باری۔

برف باری۔برف باری۔۔۔۔۔

چوتھا باب

ایک خواب: جو خواب نہیں تھا

(۱)

عرفان احمد رات دس بجے کے قریب برف سے ڈھکی بستی میں داخل ہوا تو سورج غروب ہوئے پانچ گھنٹے گزر چکے تھے۔ چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے روشن تھا اور چاندنی برف سے منعکس ہو کر ایک ایسا سماں تشکیل دے رہی تھی جو نہ تو دن سے مشابہ تھا اور نہ ہی رات سے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے چاند اپنے مدار سے ہٹ کر زمین کے بہت قریب آ گیا ہے۔ بادلوں کے چھٹ جانے کی وجہ سے برف پر کہرے کی وہ تہہ جمنا شروع ہو چکی تھی جو نہ صرف برف کو سخت کر دیتی ہے بل کہ سردی کی شدت میں اضافہ بھی کر دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے لوگوں نے سرِ شام ہی کمروں میں آگ جلا کر دروازے بند کر لیے تھے اور اب اپنے اپنے گرم بستروں میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ پوری بستی پر سکوتِ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔

آج وہ اڑھائی سال بعد نور آباد آیا تھا۔ پہلے وہ سیدھا حویلی میں گیا تاکہ چھوٹے سردار کو مختلف موضوعات پر حال ہی میں شائع ہونے والی کچھ کتابیں پیش کر سکے اور ساتھ ہی اڑھائی سال قبل بغیر بتائے چلے جانے پر معذرت کر سکے لیکن وہاں تالہ پڑا ہوا تھا۔

''لگتا ہے چھوٹے سردار کو بڑے سردار جی پھر ساتھ لے گئے ہیں۔'' اس نے سوچا اور پھر ظفر علی خان کے مزار سے ملحقہ اسی کچے گھر کی راہ لی، جس میں وہ ایک طویل عرصے تک گل زیب کے ساتھ، جسے ساری بستی والے چچا کے نام سے پکارتے تھے، قیام پذیر رہا تھا۔ پندرہ سال پہلے جب وہ اس بستی میں پہلی مرتبہ آیا تھا تو اس نے کچھ عرصہ مزار کے ساتھ بنے حجرے میں گزارا تھا۔ لیکن بعد میں مزار کے متولین کو جب بعض لوگوں نے اکسایا کہ عرفان ایک مشکوک شخص ہے اور اس کا وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں تو انھوں نے اسے وہاں سے بے دخل کر دیا، اس نے کچھ ماہ قبرستان کے کنارے ایک چھپر ڈال کر بسر کیے۔ لیکن جب گل زیب چچا کی اکلوتی بیٹی بیاہ کر دوسرے گاؤں سدھار گئی اور وہ

اپنے گھر میں اکیلا رہ گیا تو وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا تھا۔ وہ گل زیب چچا ہی تھا جو پہلی مرتبہ اسے اپنے ساتھ سردار جی کی حویلی لے کر گیا تھا اور چھوٹے سردار جی سے اس کا تعارف کرایا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں چھوٹے سردار جی کی متجسس طبیعت کو بھانپ لیا تھا اور سائنس، تاریخ، مذہب، فلسفہ، کیمیا گری، ادب اور نجوم جیسے متنوع علوم کے حوالے سے ایسی ایسی خرد افروز باتیں کیں تھیں کہ چھوٹا سردار پہلی ہی ملاقات میں اس کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ یوں چھوٹے سردار کو ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جس سے وہ اپنے ذہن میں اٹھنے والے ان سوالوں کا جواب بھی پا سکتا تھا جو اسے عموماً پریشان کیے رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی شہر سے آتا سب سے پہلے اسے تلاش کرتا اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے نئے سوالوں پر اس سے تبادلہ خیال کرتا۔ کچھ عرصے بعد جب بستی کے بعض لوگوں نے گل زیب چچا پر دباؤ ڈالا کہ وہ اسے اپنے گھر سے نکالے تو چھوٹے سردار نے ان تمام لوگوں کو حویلی بلا کر آڑے ہاتھوں لیا اور صاف کہہ دیا کہ عرفان صاحب میرے لیے استاد کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھیں گل زیب چچا کے گھر سے نکالنا تو کجا اگر وہ چاہیں تو حسبِ سابق میرے نکڑ دادا کے مزار کے حجرے میں بھی رہ سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس حویلی کے دروازے بھی ان پر ہر وقت کھلے ہیں۔ اس کے بعد کسی شخص نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہیں کی۔ لیکن اڑھائی سال قبل وہ ایک رات اچانک بغیر کسی کو کچھ بتائے یہاں سے چلا گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے دونوں محسن بھی، دوسرے دن اسے ڈھونڈتے رہ گئے تھے۔ ہر سبب کی علت کھوجنے والا، اس کا دماغ، اس کے اپنے یہاں سے جانے کی وجوہات آج تک نہیں جان سکا۔

''گل زیب چچا یقیناً ناراض ہوگا۔ جاتے ہوئے مجھے کم سے کم اسے بتا کر جانا چاہیے تھا۔''

اس نے مکان کے برآمدے میں قدم رکھتے ہوئے سوچا۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں ٹہلتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ گل زیب چچا اندر سے چٹخنی چڑھا کر نہیں سوتا۔ اس نے آہستگی سے دروازے کے پٹوں کو اندر کی طرف دھکیلا لیکن پٹ تھوڑے سے ہل کر وہیں آ رہے۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹول کر دیکھا تو دروازے کو باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔

''یہیں کہیں ہوگا۔'' اس نے سوچا۔

دروازہ کھول کر اس نے لائٹ جلائی تو دیکھا کہ اس کا بستر، جس پر وہ کئی سال سوتا رہا تھا، سلیقے سے بچھا ہوا ہے، یہاں تک کہ اس کا تھیلا بھی جوں کا توں چارپائی کے پائے سے لٹک رہا ہے، جیسے گل زیب چچا کو یقین ہو کہ وہ آج ضرور آئے گا۔ اس نے اپنا سامان ایک طرف رکھا، اوورکوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا اور بستر میں گھس کر چچا کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن تھکاوٹ کی وجہ سے وہ زیادہ

دیر اس کا انتظار نہ کر پایا اور اونگھنے لگا۔اس نے کئی بار نیند کو جھٹکنے کی کوشش کی مگر نیند اس پر غالب آتی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے خراٹوں کی آواز برآمدے تک سنائی دے رہی تھی اور وہ خود چیڑ کے ایک موٹے ڈال سے بندھی پینگ میں ہلارے لے رہا تھا۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ غار کے عین پیچھے، ڈار سے بچھڑے ہوئے پرندے کی طرح تنہا کھڑے چیڑ کے بلند وبالا درخت کے سب سے نچلے ڈال سے بندھی پینگ میں ہلارے لے رہا ہے۔جب وہ زور کا ہلارا لیتا ہے تو اس کا وجود غار کے عین اوپر فضا میں تیر رہا ہوتا ہے۔جب پینگ بلندی کی طرف جا کر واپس نیچے کی طرف آتی ہے تو رسی کی رگڑ سے ڈال کی چھال بھر بھر کر اس پر گرتی ہے جس سے تڑتڑ کی ہلکی آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔اچانک اسے تڑخ کی آواز آتی ہے وہ ہلارا لیتے ہوئے اوپر ڈال کی طرف دیکھتا ہے تو اسے ڈال کی ایک ٹہنی ٹوٹ کر گرتی ہوئی نظر آتی ہے، جو اگلے ہی لمحے زور سے اس کے سر پر آگرتی ہے اور اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پاتا کہ اسے ڈال کے ٹوٹنے کی تڑتڑاہٹ سنائی دیتی ہے وہ گھبراہٹ کے عالم میں اوپر کی طرف دیکھتا ہے پینگ کی رسیوں کا تناؤ ختم ہو چکا ہے اور ڈال اور اس کے درمیان کا فاصلہ کم ہو رہا ہے اس سے پہلے کہ وہ خود زمین پر گرے ڈال اسے ہوا میں ہی آلیتا ہے وہ اپنا سر بچانے کے لیے آگے کی طرف جھکتا ہے اور پھر وہ دونوں دھم کی ایک زوردار آواز کے ساتھ غار کے چبوترے پر آگرتے ہیں۔جس سے چبوترے میں ایک دراڑ سی پڑ جاتی ہے۔ڈال کا سارا بوجھ اس کی ٹانگوں پر ہوتا ہے۔وہ اُٹھنے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کا وجود اس کا ساتھ نہیں دیتا۔اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی ہیں۔

شدتِ کرب سے وہ کراہنے لگتا ہے اور ڈال کے نیچے سے خود کو نکالنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے لیکن کئی من وزنی ڈال اسے بدستور دبوچے رکھتا ہے۔بے بسی کی حالت میں وہ اپنے وجود کو ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے جس سے اسے وقتی طور پر کچھ سکون ملتا ہے اور وہ لمبے لمبے سانس لینے کی کوشش کرتا ہے۔آہستہ آہستہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ آکسیجن کم ہو رہی ہے۔

اسے لگتا ہے جیسے چیڑ کے ڈال نے تنے سے جدا ہوتے ہی آکسیجن کو جذب اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کو خارج کرنے کا عمل شروع کر دیا ہے جس کے نتیجے میں اس کے اردگرد کی فضا کی ساری آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ میں تبدیل ہو رہی ہے اور اس کا سانس گھٹ رہا ہے۔وہ خوف زدہ ہو کر زور سے چیختا ہے جس سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

"شکر ہے یہ سب خواب تھا۔"اس نے اندھیرے میں اپنے چہرے کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

لیکن اگلے ہی لمحے اسے لگا جیسے چیڑ کا بھاری ڈال اب بھی اس کی ٹانگوں کو بدستور دبوچے ہوئے ہے۔ اس نے اپنی بائیں ٹانگ کو، جس پر اسے زیادہ وزن محسوس ہو رہا تھا، سینے کی طرف کھینچنے کی کوشش کی تو اسے شدید درد کا احساس ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کا خواب سے باہر آنا ایک واہمہ ہے اور وہ اب بھی بدستور خواب میں ہے۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ اپنے سینے سے سرکا کر زمین پر پھیرنے کی کوشش کی تو وہ چبوترے کے بجائے بستر پر تھا۔ ''خواب میں تو میں غار کے چبوترے پر گرا تھا۔'' یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ آہستہ آہستہ مخالف سمتوں میں پھیلائے تو وہ چارپائی کے بازوؤں سے ٹکرائے۔ وہ کافی دیر تک انھیں چھو کر محسوس کرتا رہا۔ ''نہیں میں چچا کے کمرے میں ہوں۔'' اس نے چارپائی کے دونوں بازوؤں کو پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کی تو اس کی انگلیاں زمین سے مس ہوئیں۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹولا تو اس پر کھلا کہ چارپائی کے پائے ٹوٹ چکے ہیں اور وہ اپنے بستر سمیت زمین پر پڑا ہوا ہے۔ پھر اس نے اندھیرے میں اپنا ہاتھ، اوپر فضا میں لہرایا جو کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ وہ کافی دیر تک اس سخت چیز کو ہاتھ سے چھو کر محسوس کرنے اور صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ واقعی کوئی چیڑ کا ڈال تھا لیکن سوکھا ہوا؛ اتنا سوکھا کہ اس کی چھال بھی اتر چکی تھی۔ ''چیڑ کے تنے سے ٹوٹنے والا ہرا بھرا ڈال اتنی جلدی کیسے سوکھ سکتا ہے۔'' وہ اپنے اٹھائے ہوئے اس سوال کا جواب تلاش کر رہا تھا کہ اس کا دھیان اصحابِ کہف کے واقعے کی طرف گیا۔ وہ کافی دیر تک ان لوگوں کے بارے میں سوچتا رہا، جو کئی سو برس تک ایک غار میں سوئے پڑے رہے تھے اور جب جاگے تو انھیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا عرصہ حالتِ خواب میں رہے، یہاں تک کہ ان کا دھیان اپنے کتے کی طرف گیا جس کی ہڈیاں بھی گل چکیں تھیں۔

''کہیں میں بھی، برسوں سے۔۔۔؟'' اس نے دفعتاً اس خیال کو جھٹکا؛ تھوڑی دیر پہلے دیکھے ہوئے خواب کو یاد کیا اور اپنے زرخیز تخیل کے ذریعے اس کی تمام جزئیات کو یوں ذہن میں ابھارا جیسے وہ اسے دوبارہ دیکھ رہا ہو۔ اگلے ہی لمحے اسے لگا جیسے وہ بستی کے عقبی پہاڑ پر موجود چیڑ کے ایک ڈال کے نیچے زخمی حالت میں پڑا ہوا اونگھ رہا ہے۔ جوں ہی اس کی آنکھ لگتی ہے وہ ایک خواب دیکھتا ہے جس میں وہ گل زیب چچا کے گھر میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹا ہوا ہے اور اس کے اوپر اسی ڈال سے ملتا جلتا ایک سوکھا ڈال فضا میں معلق ہے اور اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے اور یہ عمل صدیوں سے جاری ہے۔

(۲)

رات بارہ بجے کے قریب پوری بستی لرز اٹھی تھی۔ زمین نے چار پانچ ہچکولے کھائے اور پھر ہر طرف لکڑی کے بھاری شہتیروں کے ٹوٹنے کی تڑتڑاہٹ اور پتھروں کی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ لوگ صرف خوابوں ہی کی دنیا سے نہیں، گھروں سے بھی نکل آئے تھے اور جو کوشش کے باوجود نہیں نکل پائے تھے، انھیں موت نے آلیا تھا۔

نور آباد کی ایک سو تہتر سالہ تاریخ میں تباہی نے دوسری بار اس بستی کا رخ کیا تھا۔ اس سے پہلے آج سے ٹھیک ایک سو چونسٹھ سال قبل ۱۸۴۱ء میں بارشوں نے اس نئی نئی بسی ہوئی بستی پر شب خون مارا تھا اور ڈیڑھ درجن کے قریب لوگ لقمہء اجل بن گئے تھے۔ گزشتہ رات ایک بار پھر موت نے اس بستی کا رخ کیا تھا، جو اب ایک اچھا خاصا بڑا گاؤں بن چکی تھی۔ رات بارہ بجے کے قریب پورا علاقہ زلزلوں کے شدید جھٹکوں سے لرز اٹھا تھا۔ گاؤں کے پختہ مکانوں میں سے بھی کئی زمین بوس ہو گئے تھے؛ اور کچے مکانوں میں سے تو کوئی کوئی ہی اپنی بنیادوں پر کھڑا رہ پایا تھا۔ اس چودھویں کے چاند کی برفانی رات میں، سوائے ان لوگوں کے جو ملبے تلے دب گئے تھے، کوئی بھی اپنے مکان کے اندر موجود نہیں تھا۔

سورج؛ جو کل اس بستی کو بسا بسایا چھوڑ کر غروب ہوا تھا، آج تباہی کے مناظر لے کر طلوع ہوا تھا۔ دو تہائی بستی ملبے کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ہر طرف قیامتِ صغریٰ کا سماں تھا۔

چالیس کے قریب زخمی اور پندرہ سے زائد لاشیں، جن میں سے بیشتر مسخ شدہ تھیں، مکانوں کے ملبے کے نیچے سے نکالی جا چکیں تھیں۔ جب کہ اس سے دوگنی تعداد میں لوگ ابھی مکانوں کے ملبے تلے ہوئے تھے۔

ساری وادی نصف رات کے بعد ٹھک ٹھک۔ ٹھاہ ٹھاہ کی آوازوں سے گونجنا شروع ہو گئی تھی۔ ان آوازوں کے ساتھ چیخنے چلانے اور رونے کی آوازیں بھی بلند ہوتی رہی تھیں۔ دوپہر ہونے کو

آئی تھی مگر یہ آوازیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چیخنے چلانے اور رونے پیٹنے کی آوازیں کم ہوتی چلی گئیں کہ پسماندگان کو اب صبر آ ہی گیا تھا۔ جب کوئی نئی لاش ملبے سے برآمد ہوتی تو عورتوں کے بینوں کی آواز بلند ہوتی، جو کچھ ہی دیر جاری رہتی۔آخر وہ بے چاریاں بھی کتنوں کو روتیں۔

بھوک،شہوتِ جنس اور تحفظِ ذات کی طرح،شاید رونا بھی انسان کی جبلت میں شامل ہے۔وہ پیدا ہوتے ہی جو پہلا کام پوری تن دہی سے سرانجام دیتا ہے؛وہ رونا ہی ہے۔اگر وہ پیدائش کے وقت نہ روئے تو گھر والے پریشان ہو جاتے ہیں۔اسے رلانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے؛اور جب وہ روتا ہے تو اس پر خوشی کے شادیانے بجائے جاتے ہیں۔پھر وہ اسے اپنا وطیرہ بنالیتا ہے اور اپنی جبلی خواہشات کا اظہار بھی رو کر ہی کرتا ہے۔ جب تھوڑا سیانا ہوتا ہے تو اسے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے اور اپنی ہر جائز اور ناجائز ضد اسی کے ذریعے منواتا ہے۔جوانی میں وہ اپنے محبوب یا محبوبہ کو آنسوؤں ہی کے ذریعے رام کرتا ہے اور بڑھاپے میں اپنی جوانی کو یاد کر کے روتا رہتا ہے۔

وہ روتے ہوئے پیدا ہوتا ہے اور روتے روتے جب مرتا ہے تو یہ کام دوسروں کو سونپ کر مرتا ہے۔جس طرح شادی خوشی سے سجتی ہے اسی طرح ماتم رونے سے بجتا ہے۔لیکن اگر دکھ حد سے گزر جائے تو آدمی پتھرا سا جاتا ہے اور رونا بھی اس کے اختیار میں نہیں رہتا۔قدرت جتنا بڑا دکھ دیتی ہے ،صبر بھی اتنا ہی وافر عطا کرتی ہے۔اس روز نور آباد میں صبر کا ایسا صحیفہ نازل ہوا تھا جس کی تلاوت ہر دکھی دل پورے خشوع وخضوع سے کر رہا تھا:

''شمیم بھائی! آپ کے گھر کی کیا صورت حال ہے؟''ایک آدمی، جو گرے ہوئے مکان کا ملبا کھود رہا تھا، نے دوسرے سے پوچھا۔

''بس جی۔والد صاحب اور میں بچ گئے۔میری بیوی کو شدید چوٹیں آئی ہیں۔لیکن خدا کا شکر ہے بچ گئی ہے۔لیکن بیٹا ابھی تک ملبے تلے دبا ہوا ہے۔کدال کا دستہ ٹوٹ گیا ہے، دوسری کدال کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔''دوسرے نے جواب دیا۔

''چلیں جی خدا کا شکر ہے۔باقی تو بچ گئے ناں۔میری بیوی بے چاری مر گئی ہے۔بیٹا زخمی ہے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی پر میری بہو اور میں معجزانہ طور پر بالکل سلامت رہے۔ جب کہ میرا دو سال کا پوتا ابھی تک لاپتہ ہے۔خدا کرے وہ زندہ ہو۔''پہلے نے کہا۔

''بس جی اللہ انھیں سلامت رکھے۔اللہ سب کے بال بچوں کو اپنی امان میں رکھے۔سلیمان

غریب کا تو پورا خاندان ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ بے چارے کا کوئی رونے والا بھی نہیں بچا۔ نو کے نو ملبے تلے دبے ہوئے ہیں۔ ابھی تک صرف چار لاشیں نکالی جا سکی ہیں۔"

آصف بھائی! کوئی اضافی کدال ہو تو۔۔۔"

اتنے میں انھیں ساتھ والے مکان کے ملبے سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ دونوں بے ارادہ بھاگتے ہوئے وہاں پہنچے۔ "لگتا ہے چچا گل زیب زندہ ہے۔" دونوں نے بہ یک آواز کہا۔

"مجھے باہر نکالو۔ میرا سانس گھٹ رہا ہے۔" ملبے سے سسکیوں اور کراہوں میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ انھوں نے ایک نظر ملبے کے ڈھیر پر ڈالی اور پھر ارد گرد کا جائزہ لیا جہاں تمام لوگ ایک دوسرے سے بے خبر اپنے اپنے گھروں کا ملبا کھود رہے تھے، جب کہ گل زیب چچا، سردار جی کی حویلی کے مسمار شدہ حصے کے ملبے پر کھڑا صافے سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ "کوئی ہے! کوئی ہے!" ملبے سے انسانی چیخ سے ملتی جلتی صدا دوبارہ بلند ہوئی۔ انھوں نے حیرت اور خوف سے پہلے گل زیب چچا اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور واپس اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگنے لگے۔

دوپہر کے وقت بیس کے قریب اجنبی نوجوانوں کا ایک گروپ گینتیاں کدالیں اور بیلچے اُٹھائے، بستی میں داخل ہوا۔ انھوں نے اپنا تعلق ایک ایسی فلاحی تنظیم سے بتایا جو خدمتِ خلق کے حوالے سے خاصی معروف تھی۔ بستی والوں نے، جو نیند اور تھکاوٹ سے چور تھے، اسے غیبی مدد سے تعبیر کیا۔ یہ نوجوان آتے ہی پوری بستی میں پھیل گئے اور ڈھیر ہوئے پڑے مکانوں کا ملبا ہٹانے میں بستی والوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کرنے لگے، جس سے بستی والوں کے حوصلے مزید بلند ہو گئے اور کام میں مزید تیزی آ گئی۔

سردار جی کی پرانی حویلی زلزلے کے جھٹکے سہار گئی تھی، تاہم اس کا ایک حصہ منہدم ہو گیا تھا۔ قیامت کی اس گھڑی میں سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی حویلی کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔ دن چڑھے، گل زیب چچا جب اپنی اکلوتی بیٹی کے گھر سے، جو پانچ کلومیٹر دور ایک دوسرے گاؤں میں بیاہی ہوئی تھی، واپس پلٹا تو بجائے اپنے گھر جانے کے، جو ملبے کا ڈھیر بن چکا تھا، سیدھا سردار جی کی حویلی پہنچا اور دیکھا کہ حویلی کے منہدم شدہ حصے میں وہ کمرہ بھی شامل ہے جس میں چھوٹے سردار جی رہائش پذیر تھے۔

"ہو سکتا ہے چھوٹے سردار جی زندہ ہوں۔" اس کے دل میں ایک موہوم سی امید ابھری۔ کچھ دیر منہدم حصے کا جائزہ لینے اور شگافوں میں کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کے بعد اس نے دل ہی دل

میں انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا سر کے صافے سے اپنے آنسو پونچھے اور حویلی کی چھت پر کھڑے ہو کر بستی پر نظر دوڑائی ۔سب لوگ ملبے سے اپنے اپنے عزیزوں کی لاشیں نکالنے یا نکالی ہوئیں لاشوں کو کفنانے دفنانے کا انتظام کرنے میں میں مگن تھے ۔اس نے ایک بار پھر گرے ہوئے حصے کا سرسری جائزہ لیا۔حویلی کی چھت کنکریٹ سے بنی ہوئی تھی ،اس کا ملبا ہٹانا ،اس کے لیے ناممکن تھا۔اس نے اپنی جیب سے موبائل نکالا جو اسے چھوٹے سردار جی نے اس وقت خرید کر دیا تھا جب انھوں نے تمام گاؤں والوں سے کنارہ کشی کر لی تھی ۔وہ کافی دیر بڑے سردار جی کا نمبر ملانے کی کوشش کرتا رہا۔کئی بار نمبر ملانے کے باوجود موبائل بالکل خاموش رہا تو اس نے غصے میں اسے دیوار پر دے مارا اور بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ٹہلتے ٹہلتے وہ لحہ بھر کے لیے رکا ،کچھ سوچا اور بستی سے میل بھر کے فاصلے پر موجود بازار کی طرف دوڑ پڑا ۔باوجود بڑھاپے کے ،خون کو منجمد کر دینے والی سردی میں ،اس کے قدم کسی ماہر اتھلیٹ کی طرح اُٹھ رہے تھے ۔

کچھ ہی دیر میں وہ بازار میں تھا ۔جہاں بہت سی دکانیں ملبے کا ڈھیر بنی ہوئی تھیں ۔کئی دکاندار اپنی دکانوں کے ملبے کی نگرانی کر رہے تھے اور جو دکانیں اپنے مالکان سے تہی تھیں ان میں اردگرد سے آئے ہوئے لوگوں نے لوٹ مار مچا رکھی تھی ۔ بچے ٹافیاں بسکٹ اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں اپنے کوٹوں کی جیبوں میں ٹھونس رہے تھے ۔جب کہ بڑے گھی ،آٹا ،چینی ،دالیں اور اس طرح کا دیگر سامان اُٹھائے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے ۔

''تباہی نہ آئے تو کیا رحمتیں نازل ہوں ۔''اس نے سامان لوٹ کر بھاگنے والوں کو دیکھتے ہوئے سوچا ۔

وہ کافی دیر بازار میں ادھر اُدھر بھاگتا پھرتا رہا ۔پھر ایک شناسا دکان دار سے راولپنڈی جانے والی گاڑی کے بارے میں پوچھا ،جو ملبے کا ڈھیر بنی اپنی دکان کی رکھوالی کر رہا تھا ۔

''نہیں چچا ۔آج تو صبح سے کوئی گاڑی آئی ،نہ ہی گئی ۔سنا ہے دونوں طرف سے سڑک بند ہو گئی ہے ۔کئی جگہوں پر لینڈ سلائیڈنگ ہوئی ہے ۔رستے ہی بند ہیں تو گاڑیاں کہاں؟''دکان دار نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے جواب دیا ۔

دکاندار کا جواب سن کر وہ مایوس سا ہو گیا ۔دکاندار نے اسے اپنی کرسی پیش کی اور خود ایک پتھر پر بیٹھ گیا ۔کچھ دیر دونوں خاموش رہے ۔پھر دکاندار نے خاموشی توڑی:

''میرا اپنا گھر تو خدا کے فضل سے بچ گیا ہے ۔لیکن بڑی تباہی پھری ہے جی ۔ہمارے گاؤں

میں۔آپ کی طرف کیاصورتِ حال ہےاورآپ کااپنا گھرتو بچ گیاناں۔''

''میرے گھر میں تھا ہی کون؟ جس کاافسوس ہو۔ میں رات کو بیٹی کے ہاں گیا ہوا تھا۔خدا کا شکر ہےاس کا گھر سلامت ہے،لیکن نورآباد میں بھی بڑی تباہی آئی ہے۔کچا مکان تو ایک بھی نہیں بچا۔ہمارے بڑے سردار جی کی حویلی بھی آدھی گر گئی ہے۔''اس نے کہا۔

''وہ تو سارے اسلام آباد میں ہوتے ہیں ناں۔ان کاتو یہاں کوئی نہیں تھاناں۔''

''چھوٹے سردار جی یہیں تھے۔وہ تو دس بارہ سال سے یہیں رہ رہے تھے۔بڑے سردار جی کئی بار انھیں ساتھ لے کر گئے۔مگر وہ واپس آجاتے تھے۔ابھی پچھلے ہفتے سردار جی انھیں لے گئے تھے مگر وہ اگلے ہی دن واپس آگئے۔بے چاروں کو موت کھینچ کر لے آئی تھی۔''

''ہیں جی؟اوہ۔بہت افسوس ہوا جی۔بڑے سردار جی آئے ہیں؟''

''نہیں شاید انھیں ابھی اس سانحے کا علم ہی نہیں۔بل کہ ابھی تو گاؤں والوں میں سے بھی شاید کسی کو علم نہیں۔''

''کیوں جی۔وہ تو بہت اچھے آدمی ہیں جی۔''

''جب لوگوں کے اپنے گھروں میں کئی کئی جنازے پڑے ہوں تو دوسرے کا خیال کس طرح آئے۔اور وہ تو ویسے بھی کسی سے ملتے ہی نہیں تھے۔بس ایک عرفان سرکار تھے جن سے ان کا ملنا ملانا تھا،جب سے وہ گئے ہیں چھوٹے سردار کئی کئی دن حویلی سے باہر ہی نہیں نکلتے تھے۔''

''سنا ہے جی۔چھوٹے سردار جی بہت پڑھ لکھ گئے تھےاور زیادہ پڑھائی سے ان کا دماغ تھوڑا سا کھسک سا گیا تھا۔آپ برا نہ مانئے گا میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ان پر جنون کے دورے پڑتے تھے۔''

''لوگ بکواس کرتے ہیں۔''یک دم وہ جذباتی سا ہوگیا۔مگر جلد ہی سنبھل گیااور کہنے لگا:

''بس ان پر کبھی کبھی وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔سنا ہے شہر میں وہ کچھ عرصے عشقِ مجازی میں مبتلا رہے تھے،مجھے تو یقین ہے کہ یہاں وہ عشقِ حقیقی کی منزلیں طے کرنے آئے تھے۔بظاہر وہ مذہب سے دور ہو گئے تھے لیکن تھے اللہ کے ولی۔پچھلے کچھ عرصے سے ان کے چہرے پر ایک ایسا نور اتر آیا تھا جو صرف اللہ کے ولیوں کے چہرے پر ہوتا ہے۔اسی وجہ سے تو انھوں نے دنیا سے ترکِ تعلق کر لیا تھااور نہ ان کے پاس کس چیز کی کمی تھی؟بڑے سردار جی شہر سے ان کے لیے جو سامان بھجواتے دوسرے ہی دن مجھے بلا کر کہتے:''چاچا!اسے غریبوں میں بانٹ دو۔''اور خود مزار کے لنگر پر گزارہ کرتے۔کبھی کبھی دن کے وقت غار پر چلے جاتے تھےاور سارا سارا دن وہاں بیٹھے رہتے تھے۔کہتے تھے مجھے

وہاں جا کر سکون ملتا ہے ۔مجھے تو یقین ہے کہ وہ وہاں چلہ کاٹنے جاتے تھے ۔اپنے پڑدادا حضرت غار والی سرکار کی طرح ۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مجھے کبھی حویلی آنے سے منع نہیں کیا لیکن غار پر ساتھ جانے سے ہمیشہ منع کیا۔"

"مجھے بڑا دکھ ہوا ہے چاچا۔ پتہ نہیں ۔بڑے سردار جی کو جب پتہ چلے گا تو ان پر کیا گزرے گی؟۔"

"بس اللہ کی یہی مرضی تھی ۔موت نے تو پیغمبروں تک کو نہیں چھوڑا۔ جو پیدا ہوا اس نے مرنا ہے ۔بس مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ عام حالات میں اگر چھوٹے سردار کو کانٹا بھی چبھتا تو پورا نور آباد اکٹھا ہو جاتا ۔لیکن اس سانحے میں ان کی لاش ملبے تلے دبی ہوئی ہے اور کسی کو ان کا خیال ہی نہیں ۔"

"ہاں چچا ۔آفتوں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے ۔میرے دادا جی بتاتے تھے کہ ان کے دادا طاعون میں مر گئے تھے تو خوف سے ان کی لاش کو کوئی ہاتھ ہی نہیں لگاتا تھا۔لوگ کہتے تھے کہ طاعون سے مرے ہوئے آدمی کی لاش کو اگر کوئی ہاتھ لگائے یا غسل دے تو اسے بھی طاعون ہو جاتا ہے ۔آخر میرے دادا جی کے ابا جی نے ہمت کر کے اپنے باپ کو غسل دیا۔اور رو دھو اور لوگوں کی مدد سے انھیں مشکل سے دفن کیا تھا ۔"

"یہاں کسی کے پاس فون ہوگا ۔میں بڑے سردار جی کو اطلاع کرنا چاہتا ہوں ۔اگر انھیں خبر ہو جائے تو وہ کسی نہ کسی طرح آ ہی جائیں گے ۔آخر جوان بیٹا تھا ان کا ۔"

"چاچا سارے فون بند پڑے ہیں ۔موبائل بھی کام نہیں کر رہے ۔میرا لڑکا کہہ رہا تھا کہ موبائل کے سارے ٹاور گر گئے ہیں ۔"

"اچھا میں چلتا ہوں ۔جنازوں کا وقت ہونے والا ہے ۔"

"ٹھیک ہے چاچا ۔آپ جائیں ۔میری تو مجبوری ہے ۔مجھے تو رات بھی یہیں گزارنا پڑے گی ۔نہیں تو لوگ میری دکان لوٹ لیں گے ۔آدھی دکانیں تو لوٹ کر لے گئے ہیں ۔"

سہ پہر سوا چار بجے کے قریب گل زیب چچا بستی میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ بستی کی خواتین سردار جی کی حویلی میں جب کہ مرد حضرات اس کے پیچھے موجود قبرستان میں جمع ہو رہے ہیں ۔تاہم رضا کار نوجوان ابھی تک ملبے ہٹانے میں مشغول ہیں ۔پندرہ منٹ پہلے جب ملبا ہٹانے کا کام روک کر اجتماعی نمازِ جنازہ کی تیاریاں شروع ہوئیں تو نوجوانوں کے گروپ نے بستی والوں سے درخواست کی کہ وہ فرضِ کفایہ ادا کریں اور پردہ دار خواتین سے کہیں کہ وہ بڑی حویلی میں چلی جائیں ،ہم سورج غروب ہونے تک کام جاری رکھنا چاہتے ہیں کہ اندھیرا پھیلتے ہی ہم سب ساتھ والے گاؤں کے لوگوں کی مدد کے لیے جانا چاہتے ہیں ۔

مغرب کے بعد بستی والے اپنے اپنے عزیزوں کی تدفین سے پلٹے تو انھوں نے دیکھا کہ نوجوانوں کا گروپ حسبِ وعدہ کسی دوسری بستی والوں کی مدد کے لیے جا چکا ہے۔ ملبے سے برآمد ہونے والے زیورات اور دیگر قیمتی سامان سمیت۔

(۴)

سردار عبدالعزیز خان جب نور آباد پہنچے تو سورج غروب ہوئے گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا اور نور آباد پر تاریکی کا پردہ دبیز ہو چکا تھا۔ اب بھی کچھ لاشیں ملبے تلے موجود تھیں، جنھیں نکالنے کا کام بدستور جاری تھا۔ وہ لوگ جو اپنے تمام عزیزوں کو دفنا چکے تھے۔ انھوں نے سردار جی کی حویلی کا رخ کر لیا تھا۔ ان کی توجہ، اس طرف گل زیب چچا نے، اجتماعی نماز جنازہ کے فوراً بعد، ایک اعلان کی صورت میں مبذول کرائی تھی۔ حویلی کے منہدم حصے کے بارے میں تو سب کو خبر تھی مگر کسی کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ سردار جی کا بڑا بیٹا رات کو حویلی میں موجود تھا۔

سردار جی نے اگرچہ زلزلے کے جھٹکے، اسلام آباد والے گھر میں خود بھی محسوس کیے تھے؛ اور اٹھ کر اگلے دو گھنٹے ٹی وی بھی دیکھتے رہے تھے، لیکن اس سے ہونے والی تباہی کی خبر انھیں صبح آٹھ بجے کے قریب ملی۔ جب مختلف چینلز پر بریکنگ نیوز آنا شروع ہوئیں کہ رات کو آنے والے زلزلے کے باعث کشمیر اور ہزارہ میں بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی ہے اور کئی گاؤں صفحہ ہستی سے مٹ گئے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی انھیں اپنے بیٹے کا خیال آیا۔ انتہائی مضبوط اعصاب کے مالک ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ پائے اور غش کھا کر گر پڑے۔ انھیں فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ ہوش میں آتے ہی انھوں نے نور آباد جانے کی ضد کی۔ ان کے چھوٹے بیٹے فرمان اور دوسرے گھر والوں نے بہت سمجھایا کہ ہم نے کچھ لوگوں کو وہاں روانہ کر دیا ہے وہ جلد ہی اچھی خبر لے کر آئیں گے مگر وہ نہ مانے۔ ناچار فرمان اور ایک دو ملازم انھیں ساتھ لے کر نور آباد روانہ ہو گئے۔

ابھی وہ ہزارہ کے حدود میں داخل ہی ہوئے تھے کہ سامنے سے آتی ہوئی ان کے بیٹے کی طرف سے بھجوائی گئی گاڑی کے ڈرائیور نے گاڑی سے سر باہر نکال کر انھیں رکنے کا اشارہ کیا۔ جوں ہی ان کی گاڑی رکی۔ وہ بھاگتا ہوا ان کے پاس آیا اور بتایا کہ آگے راستہ بند ہے۔ سوگز کے قریب سڑک کا ایک پورا ٹکڑا سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں جا گرا ہے۔ لہٰذا واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ لیکن سردار جی نے حکم دیا کہ سب لوگ چلیں۔ جہاں تک گاڑیاں جا سکتی ہیں انھیں لے جائیں۔ آگے پیدل چلے

جائیں گے۔فرمان نے انھیں بہتیرا سمجھایا کہ آپ واپس چلے جائیں۔میں جا کر پتا کرآتا ہوں۔مگر وہ نہ مانے۔

جب انھوں نے کھائی میں گرے ہوئے سڑک کے ٹکڑے والی پہاڑی پیدل عبور کی تو ان کا ایک جاننے والا بھاگتا ہوا آیا۔جب اسے صورت حال کا علم ہوا تو وہ انھیں اپنی گاڑی میں بٹھا کر نور آباد سے تین کلومیٹر دور ایک مقام تک پہنچا گیا۔وہاں سے آگے لینڈ سلائیڈنگ کی وجہ سے راستہ پھر بند ہو گیا تھا۔باقی رستہ انھوں نے پیدل طے کیا۔

جوں ہی عزیز خان اپنی حویلی میں داخل ہوئے۔کئی لوگ آ کر ان سے لپٹ گئے اور رونے لگے۔وہ لوگ بھی جو حویلی کے گرے ہوئے حصے سے ملبا ہٹا رہے تھے۔انھوں نے بھی کچھ دیر کے لیے کام روک دیا اور باری باری آ کر ان سے لپٹنے لگے۔

''سردار جی ہمیں معاف کر دیں۔ہم آپ کے بیٹے کو نہیں بچا سکے۔'' اکبر خان نے، جو ان کا دور پار کا عزیز تھا اور یونین کونسل کا ناظم بھی رہ چکا تھا، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

عزیز خان کچھ دیر تو ساکت کھڑے رہے۔جیسے ان کا سانس رک گیا ہو۔پھر جیسے ہی انھیں فرمان کے رونے کی آواز آئی اسے گلے لگا کر خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔انھیں حویلی کے دوسرے حصے میں لے جایا گیا۔جسے زلزلہ مسمار تو نہیں کر پایا تھا مگر اس میں جگہ جگہ دراڑیں ڈال گیا تھا۔

عزیز خان صحن میں بیٹھ گئے فوری طور پر ان کے لیے الاؤ روشن کیا گیا، اور ملبا ہٹانے کا کام دوبارہ شروع کر دیا گیا۔اتنے میں کسی نے آ کر انھیں اطلاع دی کہ سلیمان خان کو اس کے مسمار شدہ مکان کے ملبے سے زندہ نکال لیا گیا اور وہ باقاعدہ ہوش میں ہے۔یہ خبر سنتے ہی عزیز خان کی آنکھوں میں اپنے بیٹے کے زندہ بچ جانے کی موہوم سی امید ابھری اور وہ اٹھ کر حویلی کے مسمار شدہ حصے میں چلے گئے ان کے وہاں جانے کے بعد ملبا ہٹانے کے کام میں مزید تیزی آ گئی۔

وہ کافی دیر تک ملبا ہٹانے کے کام کی نگرانی کرتے اور ملبا ہٹانے والوں کو ہدایات دیتے رہے۔لیکن سخت سردی کی وجہ سے ان کے لیے وہاں کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا فرمان اصرار کر کے انھیں حویلی کے دوسرے حصے کے ایک کمرے میں لے آیا۔

گھنٹے بھر بعد ایک آدمی بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''سردار جی۔چھوٹے سردار جی رات کو کمرے میں نہیں تھے۔'' اس کی آواز میں خوشی کی جھلک تھی۔

''کیا!!!؟'' عزیز خان نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات میں پوچھا۔

''جی سردار جی ۔یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔سارا ملبا ہٹایا جا چکا ہے۔وہ کمرے میں نہیں تھے۔شاید وہ کہیں گئے ہوئے تھے اور رات کو واپس نہیں آئے۔'' اکبر خان نے خوشی سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

عزیز خان نے فرمان کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا اور دونوں اٹھ کر حویلی کے مسمار شدہ حصے کی طرف چل دیے۔

''کہاں گیا میرا بیٹا ۔خدا جانے کہاں۔۔۔۔؟''

''سردار جی ۔سردار جی ۔چھوٹے سردار ۔غار میں نہ ہوں ۔ہاں ہاں غار میں نہ ہوں ۔کبھی کبھی تو وہ سارا دن غار پر جا کر بیٹھے رہتے تھے ۔کہتے تھے مجھے وہاں جا کر سکون ملتا ہے۔'' گل زیب چچا ،سردار جی کی بات مکمل کرنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

''ہاں سردار جی ۔وہ تو کبھی کبھی رات کو بھی وہاں جاتے تھے۔میں ایک دفعہ رات کو اپنی گائے ڈھونڈنے گیا تھا۔وہ وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔میں نے چاندنی میں انھیں پہچان لیا تھا۔انھوں نے میرے سلام کا جواب بھی دیا تھا۔'' ایک پکی عمر کے آدمی نے جوش سے کہا۔

غار کا ذکر سن کر عزیز خان کو اپنے پڑدادا ظفر علی خان یاد آگئے ،جن کے بارے میں انھوں نے اپنے دادا،دادی اور نور آباد کے بوڑھوں بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ ان پر کسی پری کا سایہ ہو گیا تھا اور وہ انھیں غار پر لے جاتی تھیں ۔اس کہانی کا ذکر اب بھی نور آباد کے بہت سے لوگ کرتے تھے لیکن عزیز خان ایک منطقی آدمی تھے انھوں نے کبھی اس غیر منطقی کہانی پر یقین نہیں کیا۔مگر آج نہ جانے کیوں انھیں اس کہانی پر ایمان لانے کو جی چاہ رہا تھا۔بلکہ اس کہانی پر بھی ،جو ظفر علی خان کے مرید سناتے تھے کہ وہ وہاں چلہ کشی کرنے جاتے تھے۔

(۴)

جب وہ روشنیاں لیے غار پر پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ غار کی چھت میں ایک بڑا شگاف پڑ چکا ہے اور زمان اس کے اندر بے ہوش پڑا ہوا ہے۔ سخت سردی کی وجہ سے اس کا جسم اکڑا ہوا تھا تاہم اس کی سانس چل رہی تھی۔ اپنے بیٹے کو زندہ پا کر بڑے سردار جی پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اپنے بے ہوش بیٹے سے لپٹ کر دیر تک دیوانوں کی طرح روتے رہے۔

جب اسے اٹھا کر حویلی میں لایا گیا تو وہ بدستور بے ہوش تھا۔ رات کا پچھلا پہر شروع ہونے سے پہلے ہی مقامی اسپتال کا ڈاکٹر حویلی پہنچ چکا تھا۔ تفصیلی چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے اسے شہر کے کسی بڑے اسپتال منتقل کرنے کا مشورہ دیا۔ جگہ جگہ سے راستے بند ہونے کے باوجود، مختلف گاڑیاں بدلتے، سورج طلوع ہونے تک، اسے کسی نہ کسی طرح وفاقی دارالحکومت کے ایک بڑے اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔

چہرے پر معمولی خراشوں کے علاوہ اس کے جسم پر کسی قسم کا کوئی گہرا زخم نہیں تھا جس نے ڈاکٹروں کو اور بھی پریشان کر دیا۔ اگلے دو گھنٹوں میں پہلے اس کا سی ٹی سکین اور بعد میں ایم آئی آر کیا گیا۔

دوسرے روز جب رپوٹس سامنے آئیں تو ڈاکٹروں نے بڑے سردار جی کو بتایا کہ چھوٹے سردار کے دماغ میں دائیں طرف سوجن دکھائی دے رہی ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ کومے میں چلے جائیں، یا اپنی یادداشت کھو بیٹھیں۔

یہ خبر بڑے سردار صاحب پر ایک بجلی بن کر گری۔

''ابا جی۔ مجھے دادا جی کا چہرہ اچھی طرح یاد ہے۔ وہ جب مجھے اٹھاتے تو میں ان کی داڑھی پکڑ لیا کرتا تھا اور وہ امی سے کہا کرتے۔ ''بہو اس کے ہاتھ بہت چلتے ہیں۔ اور دیکھو تو مجھے کتنے غور سے دیکھتا ہے۔ اس کے نین نقش میرے دادا ظفر علی خان پر گئے ہیں۔'' پھر وہ مجھے امی کے حوالے کر کے کمرے سے اپنے دادا کی تصویر اٹھا لاتے اور کہتے، بہو! دیکھو یہ ہو بہو ان پر گیا ہے۔ میرے دادا بھی بچپن میں بالکل اسی طرح ہوئے ہوں گے۔ امی فخریہ انداز میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتیں اور کبھی تصویر کو دیکھتیں اور کبھی مجھے۔''

سردار صاحب کو اپنے بیٹے کے الفاظ یاد آئے۔ جو اس نے بارہا کہے تھے۔ لیکن ہر بار وہ کہتے:
''بیٹا تم نے انھیں دیکھا نہیں ہوگا۔ تم نے صرف ان کی تصویر دیکھی ہے۔ اور ہاں بچپن میں تمھاری ماں نے تمھیں یہ قصہ اتنی بار سنایا ہوگا کہ تجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم نے انھیں دیکھا ہے۔ وہ جب فوت ہوئے تو تمھاری عمر دو سال سے بھی ایک مہینہ کم تھی۔ بھلا تئیس ماہ کے بچے کو بھی کوئی بات یاد رہ سکتی ہے۔''
لیکن وہ اصرار کرتا کہ نہیں میں نے انھیں دیکھا ہے۔ اور ایک بار تو اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ:
''میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ ایک بار جب آپ مجھے اٹھائے ہوئے تھے تو انھوں نے آپ سے کہا تھا کہ اس کا بہت خیال رکھنا یہ بہت حساس طبیعت کا ہوگا۔ میری دادی نے مجھے بتایا تھا کہ تمھارے دادا بہت حساس طبیعت کے تھے۔ اس کی شکل ان سے اتنی ملتی جلتی ہے کہ مجھے لگتا ہے اس کی طبیعت اور مزاج بھی ہو بہو ان کے جیسا ہوگا۔ کہا تھا ناں انھوں نے؟''
اور وہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے تھے۔ انھیں اس کی اس بات کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ کیوں کہ جب ان کے والد نے ان سے یہ بات کہی تھی تو ان دونوں کے علاوہ وہاں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ اگر تھا تو وہی بچہ۔ جس کی عمر اس وقت بمشکل بیس ماہ تھی؛ اور انھوں نے آج تک اس بات کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی بیوی سے بھی نہیں کہ وہ کہیں پریشان نہ ہو۔ کیوں کہ اس نے بھی گاؤں کے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا تھا کہ ظفر علی خان پر جنون کے دورے پڑتے تھے اور وہ جا کر غار کی چھت پر بیٹھ جاتے تھے۔ بعض لوگوں نے تو یہ بھی بتایا تھا کہ ان پر ایک پری عاشق ہو گئی تھی۔ جو چاندنی راتوں میں انھیں آدھی رات کو جگا کر غار میں لے جاتی تھی۔
سردار ظفر علی خان کے بارے میں ایک روایت یہ بھی تھی کہ دراصل وہ وہاں چلہ کاٹنے جاتے تھے۔ انھیں کئی لوگوں نے غار سے تقریباً پانچ کلومیٹر دور نیلاں ندی میں اس چھوٹی سی جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا بھی دیکھا تھا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس کی تہہ میں حضرت بری امام سرکار نے مسلسل بارہ سال چلہ کاٹا تھا۔ یہاں تک کہ مچھلیوں نے ان کے جسم کا سارا ماس نگل لیا تھا۔
کہا جاتا ہے کہ ایک دن نیلاں بھوتو کے ایک گوجر نے اپنی بھینسیں نہلانے کے لیے پانی میں اتاریں تو دیکھا کہ جھیل کی گہرائی میں ایک انسانی ڈھانچا پڑا ہوا ہے۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا چانک اسے اس ڈھانچے میں حرکت کا احساس ہوا۔ اس نے حیرانی کے عالم میں پانی میں چھلانگ لگا دی اور سرکار کے ڈھانچے کو باہر نکال لایا۔ جب اس نے اس ڈھانچا نما انسان کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ ضرور کوئی اللہ کا ولی ہے۔ گھر لے جا کر اس نے انھیں انتہائی احترام سے اپنے بستر

پر لٹایا اور جلدی سے اپنی سب سے خوبصورت بھینس کا دودھ دوہنے لگا۔ دودھ دوہ کر جیسے ہی اس نے دودھ کا پیالہ سرکار کے منہ سے لگایا۔ اسے دھڑم کی زوردار آواز آئی۔ لیکن وہ اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہلا جب تک سرکار دودھ ختم نہیں کر چکے۔ بعد میں باہر جا کر جب اس نے دیکھا تو اس کی وہ بھینس ،جس کا دودھ، دوہ کر اس نے سرکار کو پلایا تھا، مر چکی تھی۔ لیکن اس اللہ کے بندے نے شکوہ تو کجا، اس کا ذکر تک، سرکار سے نہ کیا۔

وہ ہر روز صبح سویرے اٹھ کر اپنی ایک بھینس کا دودھ دوہ کر سرکار کو پلاتا۔ جوں ہی وہ پیالہ ان کے منہ سے لگاتا بھینس اپنی جگہ پر گرتی اور دم توڑ دیتی۔ یہاں تک کہ دو درجن کے قریب اس کی بھینسیں مر گئیں۔ جس دن اس نے اپنی آخری بھینس کو دوہا اور دودھ پیالے میں ڈال کر سرکار کے بستر تک پہنچا ،سخت پریشان تھا۔ جب سرکار نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ سرکار میری تمام بھینسیں مر چکی ہیں۔ ان کے مرنے کا مجھے کوئی افسوس نہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اب میں آپ کی تواضع کیسے کروں گا؟

سرکار نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ لے کر اطمینان سے دودھ پیا اور کہا:

''جو بھینس سب سے پہلے مری تھی اس کا نام بتاؤ''۔

''بھلی۔ سرکار اس کا نام بھلی تھا۔'' گوجر نے بے تابی سے کہا۔

''جاؤ اور اسی جھیل کے دائیں کنارے پشت کر کے کھڑے ہو جاؤ؛ اور اس کا نام پکارو۔ اور ہاں یاد رکھو۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔'' سرکار نے حکمیہ انداز میں کہا۔

وہ بھاگتا ہوا جھیل کنارے پہنچا اور ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کھڑا ہو گیا اور ''بھلی!۔ بھلی!'' پکارنے لگا۔ وہ جیسے ہی منہ سے ایک آواز نکالتا۔ ایک خوبصورت بھینس جھیل سے بھاگتی ہوئی باہر آ جاتی؛ اور اس کو چھوتی ہوئی آگے کو اس کے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی۔ جوں جوں جھیل سے بھینسیں نمودار ہو رہی تھیں۔ اس کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا اور آوازوں میں بھی تیزی آتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ جھیل سے اس کے گھر تک کا سارا رستہ بھینسوں سے بھر گیا۔ اتنے میں نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اس نے انتہائی اشتیاق سے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ جوں ہی اس نے ایسا کیا۔ جھیل سے ایک بھینسا نکل رہا تھا۔ جو اس کے دیکھتے ہی وہیں پتھرا گیا۔ اور باوجود پکارنے کے، جھیل سے بھینسوں کے نکلنے کا سلسلہ یک دم بند ہو گیا۔ پتھرایا ہوا بھینسا آج بھی اس جھیل کے دائیں کنارے پر موجود ہے

اور مرجعِ خلائق ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر گوجر پیچھے مڑ کر نہ دیکھتا تو ''بھلی ۔ بھلی ۔'' پکارنے کی صورت میں جھیل سے بھینسیں نکلنے کا سلسلہ قیامت تک جاری رہتا۔

بزرگانِ نور آباد کے بقول: نور آباد کا ایک آدمی ایک مرتبہ وہاں سے گزر رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ سردار ظفر علی خان اسی پتھریلے بھنیسے پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی نظریں جھیل کے پانی پر مرکوز ہیں اور وہ پانی میں موجود کسی ان دیکھی چیز سے محوِ کلام ہیں۔ وہ آدمی کافی دیر انھیں محویت کے عالم میں دیکھتا رہا۔ پھر ان کے عالمِ استغراق میں مخل نہ ہونے کے ارادے سے انھیں اسی حالت میں چھوڑ کر نور آباد چلا آیا۔ اس دن سے وہ ایک مجذوب کے طور پر مشہور ہو گئے۔ کئی لوگ ان سے دعا کرانے ان کے گھر یا غار کے چبوترے پر بھی جانے لگے تھے۔ وہ بہت کم بولتے تھے لیکن جو بات منہ سے نکالتے پوری ہو کر رہتی۔ ایسی حالت میں ان کی آواز بالکل بدل جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے نور آباد پر ایک بڑی آفت کے نزول کی بھی پیش گوئی کر رکھی تھی۔ پہلے تو لوگ اس کے خوف سے کئی سال تک سہمے سہمے سے رہے۔ لیکن جب ان کی وفات ہو گئی تو لوگ یہ کہہ کر کہ بعض اوقات خدا دعاؤں کے طفیل ہونی کو ٹال دیتا ہے، اس بات کو رفتہ رفتہ بھول گئے۔

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی موت کے دن اور وقت کی پیش گوئی مرنے سے کئی سال پہلے ہی کر دی تھی۔

مرنے کے بعد ان کے کئی چاہنے والوں نے ان کی قبر کی مجاوری کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے بڑے بیٹے سردار کاظم خان نے، جو ولایت سے انگریزی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے، انھیں سختی سے منع کر دیا تھا اور اپنے باپ کو شیزو فرینیا نامی بیماری کا مریض بتایا تھا۔ اس عجیب و غریب بیماری کا نام گاؤں کے لوگوں نے پہلی مرتبہ سنا تھا۔ لیکن کاظم خان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سردار جعفر خان نے نہ صرف یہ کہ اپنے باپ کا مزار بنانے کی اجازت دے دی تھی، بل کہ خود بھی اس میں خاطر خواہ حصہ ڈالا تھا۔ سردار جعفر خان کی اولاد اب بھی مزار کی دیکھ بھال کر رہی ہے اور ہر سال ان کا عرس بھی منعقد کرواتی ہے، جس میں دور دراز سے لوگ ڈالیاں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔

سردار عبدالعزیز خان نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شہر میں بسر کیا تھا۔ اگر چہ وہ ہر سال اپنے نکڑ دادا سردار ظفر علی خان کے عرس میں شرکت کے لیے نور آباد تشریف لاتے لیکن وہ اسے صرف ایک تہذیبی اور ثقافتی روایت کے طور پر زندہ رکھنے کے خواہش مند تھے۔ وہ نہ تو پیری مریدی کے قائل تھے اور نہ اپنے نکڑ دادا کی کرامات پر یقین رکھتے تھے۔ وہ ایک منطقی آدمی تھے۔ ان کے نزدیک دنیا میں علل و سبب کے

بغیر کوئی واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوتا۔انھوں نے تو کبھی اس بات پر بھی یقین نہیں کیا کہ تیئس ماہ کا بچہ اپنے دادا کی شکل اور باتیں یاد رکھ سکتا ہے۔

انھیں آہستہ آہستہ اپنے بیٹے کے بچپن لڑکپن اور جوانی کے کئی اور واقعات اور باتیں یاد آنے لگیں۔سب سے پہلے انھیں ٹھیک پینتیس سال پہلے کی وہ برفانی رات یاد آئی جب تین دن تک مسلسل دردِ زہ میں مبتلا رہنے کے بعد، نئے سال کا سورج طلوع ہونے سے دو گھنٹے قبل ان کی بیوی نے ایک بچے کو جنم دیا۔جوں ہی عابدہ خانم کو زچگی کی دردیں شروع ہوئیں آسمان سے برف کے گالے اترنے لگے، جو تین دن تک مسلسل اترتے رہے۔یوں محسوس ہوتا تھا جیسے برف باری اور عابدہ خانم کے دردِ زہ میں کوئی قریبی تعلق ہے کہ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی یک دم بادل چھٹ گئے اور کوہ مَلل کے پہاڑوں کی چوٹی پر نکلے چاند نے برف کی چادر میں مزید سفیدی کاڑھنا شروع کر دی تھی۔عزیز خان کو، جو حویلی کے مہمان خانے میں کمبل لپیٹے بے چینی سے ٹہل رہے تھے، جب بچے کی پیدائش کی اطلاع دی گئی تو وہ بھاگتے ہوئے اس کمرے میں گئے جہاں ان کی بیوی طرب آمیز کرب میں لپٹی بستر پر دراز تھی جب کہ ان کی اماں بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹے، پریشانی کے عالم میں اسے رلانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن بچہ تھا کہ رونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔عزیز خان ؛دائی اور رشتہ دار خواتین کی موجودگی سے بے خبر عالمِ اضطراب میں بچے کی طرف لپکے اور اسے اپنی اماں کے ہاتھ سے لے لیا۔جوں ہی بچہ ان کے ہاتھ میں آیا اس نے ایک لمبا سانس لیا اور رونا شروع کر دیا۔ان کی اماں نے مارے خوشی کے بچہ ان کے ہاتھ سے واپس لے لیا۔واپس دادی کی گود میں جاتے ہی بچے نے چپ سادھ لے لی۔اس کے بعد اسے مزید رلانے کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔

اسی سال موسمِ بہار کے آخر میں جب وہ آوازوں پر کان دھرنے اور ہاتھ پاؤں چلانے لگا تو ایک دن ان کی بیوی نے انھیں بتایا کہ بچہ آپ کی غیر موجودگی میں بے چین سا رہتا ہے۔لیکن جوں ہی آپ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکراتی ہے خوشی سے کلکاریاں مارنا شروع کر دیتا ہے۔پہلے تو انھیں اس بات کا یقین نہ آیا لیکن دوسرے دن جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے انھوں نے دیکھا کہ بچہ جو ساکت لیٹا ہوا تھا ان کی موجودگی کا احساس پا کر یک دم ہاتھ پاؤں چلانے لگا جوں ہی انھوں نے بچے کی کالی گہری آنکھوں میں جھانکا وہ منہ سے خوشی بھری ناقابلِ فہم آوازیں نکالنے لگا۔اسی سال جون کے آخری عشرے کی ایک رات جب وہ دیر سے گھر لوٹے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی صحن میں پلنگ بچھائے سو رہی ہے اور ان کا چھ ماہ کا بچہ ماں کی موجودگی سے بے خبر اپنی آنکھیں تاروں بھرے آسمان میں

گاڑھے خوشی سے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، جیسے ہر آن ایک دوسرے سے دور جاتے ستاروں کو اپنے پاس بلا رہا ہو۔ وہ کافی دیر تک اس کے سرہانے کھڑے اسے غور سے دیکھتے رہے۔ یک دم وہ چونکے۔ اس رات پہلی بار ان کے مشاہدے میں آیا کہ بچے کے پلک جھپکنے کا دورانیہ عام انسانوں سے زیادہ ہے۔ جتنی دیر میں وہ ایک بار پلک جھپکتا ہے عام آدمی دو سے تین مرتبہ پلک جھپک چکا ہوتا ہے۔

جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ہر وقت ان کی انگلی تھامے رکھتا، جوں ہی وہ کہیں جانے کے لیے اٹھتے وہ بھی ساتھ چلنا شروع کر دیتا۔ اگر وہ اسے ساتھ لے جانے پر تیار نہ ہوتے تو ضد کرتا اور ان کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا کہ وہ اسے ساتھ لے کر جائیں۔ جب انھیں کہیں دور جانا ہوتا تو ماں اسے بہلا پھسلا کر دوسرے کمرے میں لے جاتی اور وہ چپکے سے نکل جاتے۔

انھی دنوں ایک رات جب پچھلے پہر عابدہ خانم کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ اس کا تین سالہ بچہ کمرے سے غائب ہے۔ اس نے پہلے پلنگ کے نیچے اور پھر کمرے میں ادھر اُدھر دیکھا لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا تو وہ خوفزدہ ہوگئی اور اس نے عزیز خان کو جگایا۔ دونوں میاں بیوی نے اسے کمرے میں ہر جگہ تلاش کیا۔ جب ان کی نظر دروازے کے کھلے ہوئے پٹوں پر پڑی تو دونوں حویلی کے صحن کی طرف بھاگے اور اسے چھت پر جانے والی سیڑھی کے زینے پر آرام سے بیٹھا ہوا پایا۔ اگلے ہفتے جب اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ رونما ہوا تو ان پر کھلا کہ بچے کو نیند میں چلنے کا مرض لاحق ہے۔ جس سے ان کی راتوں کی نیندیں اُڑ گئیں۔ تاہم اگلے دو سالوں میں اس کا یہ مرض جاتا رہا۔ لیکن بیماری کی حساسیت کے پیشِ نظر وہ کافی عرصے تک احتیاطی تدابیر کرتے رہے۔

جب اسے سکول میں داخل کرایا گیا تو اس نے ضد کی کہ میں تب اسکول جاؤں گا جب بابا بھی میرے ساتھ سکول جائیں گے۔ اس کی ضد سے مجبور ہو کر عزیز خان کو کئی روز تک پورا پورا دن سکول میں گزارنا پڑا۔ ان کی بیوی کئی بار ان سے لڑی جھگڑی بھی کہ آپ خواہ مخواہ میں اس کی عادتیں خراب کر رہے ہیں۔ لیکن عزیز خان ہر بار ٹال دیتے اور کہتے کہ جوں جوں بڑا ہو گا خود ہی سمجھدار ہوتا چلا جائے گا اور پھر واقعی وہ سمجھدار ہو گیا۔

وہ دوسری کلاس میں تھا کہ ایک دن انھوں نے اسے سات کا پہاڑا سنانے کو کہا تو اس نے سات کے بجائے سترہ کا پہاڑا ایسے فر فر سنا دیا کہ وہ کافی دیر تک اس کا منہ تکتے رہے تھے۔ حیرت تو انھیں اس وقت بھی ہوئی تھی لیکن انھیں یہ بات غیر معمولی آج ہی لگی۔

پھر انھیں وہ واقعہ یاد آیا ،جس نے انھیں اپنے بیٹے کے بہتر مستقبل کے لیے نور آباد چھوڑ کر اسلام آباد منتقل ہونے پر مجبور کر دیا تھا،ان دنوں وہ تیسری جماعت میں پڑھ رہا تھا ۔ایک دن اس کے استاد نے کلاس روم کو بتایا کہ زمین بہت تیزی سے گھوم رہی ہےتو اس نے جھٹ سے سوال کیا کہ اگر زمین گھوم رہی ہےتو اوپر فضا میں اچھالی ہوئی گیندواپس اسی جگہ کیوں آ کر گرتی ہے۔ بے چارے استاد سے کوئی جواب نہ بن پڑا؛اور وہ ہکا بکا ہوکراس کا منہ دیکھنے لگا۔وہ خود تو چھٹی کے بعد یہ بات بھول گیا لیکن اس کا استاد ساری رات اس سوال کا جواب تلاش کرتا رہا ۔دوسرے دن اس نے اپنے ایک سینئر سے اس کا جواب پوچھا۔گو وہ اس جواب سے مطمئن ہوگیا لیکن وہ اس الجھن میں مبتلا ہوگیا کہ ایک بچے کے ذہن میں ابھرنے والا یہ سوال کبھی میرے ذہن میں کیوں نہیں اٹھااور میں نے اس کا جواب؛ پہلے، تلاش کرنے کی کیوں نہیں کوشش کی ۔اگلے دن وہ سید حاسر دار جی کی حویلی جا پہنچااور سارا قصہ انھیں سنایا اور ساتھ ہی درخواست کی کہ آپ کا بیٹا بہت ذہین ہے۔اسے شہر کے کسی اچھے سکول میں داخل کرائیں۔ یہاں ہم جیسے نیم خواندہ استاد اس کی علمی پیاس نہیں بجھا سکیں گئے۔

کچھ ہی دنوں میں سردار صاحب پورے خاندان سمیت مستقل طور پر اسلام آباد منتقل ہو گئے جہاں اسے ایک بہت اچھے سکول میں داخل کرا دیا گیا۔شہر آ کر اگر چہ وہ نصابی سرگرمیوں کے سلسلے میں زیادہ محنتی نہیں رہا لیکن اس کے باوجود ہمیشہ اپنی کلاس میں اول آتا رہا۔عزیز خان کی خواہش تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے لیکن اس نے ضد کی کہ اس کی دل چسپی کا میدان فزکس ہے۔کئی دن تک دونوں باپ بیٹے میں بحث مباحثہ چلتا رہا۔بالآخر طے پایا کہ یہ معاملہ ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی کے سامنے رکھا جائے گا،وہ جو بھی فیصلہ کریں گے فریقین کو قبول ہوگا۔ڈاکٹر فاروقی نے ،جو اس کی ذہانت اور فطانت کے شروع ہی سے قائل تھے،اپنا ووٹ زمان کے حق میں دیا اورعزیز خان کو نا چار یہ فیصلہ قبول کرنا پڑااور زمان کو فزکس میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی گئی ۔تھرڈ ائیر میں اس نے یونیورسٹی بھر میں سب سے زیادہ نمبر لیے لیکن فورتھ ائیر کے پیپر دینے کی نوبت ہی نہیں آئی ،کہ نصف سال تک چلنے والا دوطرفہ عشق یک دم یک طرفہ ہوکر رہ گیا تھا۔زمان کے قریبی دوستوں کے بقول اس کا سبب ایک خواب تھا جو زمان نے دیکھا تھا ۔ایک ایسا خواب جو حقیقت میں بھی موجود تھا۔خواب اور اس کے بعد پیش آنے والے عجیب وغریب واقعات نے ماہ نور کو خوف زدہ کر دیا اسے لگا جیسے وہ کسی آسیب زدہ شخص کی محبت میں گرفتار ہے ۔اس تصور نے اسے ہلا کر رکھ دیااور اس کا دل جو زمان کی محبت سے بھرا ہوا تھا خوف سے بھر گیا ۔نتیجتاً وہ کئی دن تک شدید بیمار رہی ۔ جب کہ ماہ نور کی سہیلیوں کے بقول اس میں عرفان نامی ایک شخص کا ہاتھ تھا

جو کالے علم کا ماہر تھا اور اسی کے ذریعے زمان نے ماہ نور کے دل میں جگہ بنائی تھی۔ پہلے تو اسے یقین نہ آیا لیکن جب اس پر کھلا کہ زمان سے کینٹے ٹیریا پر ہونے والی اس کی پہلی ملاقات، جسے وہ اتفاقی سمجھتی رہی، ایک باقاعدہ منصوبے کا حصہ تھی تو وہ اس سے اسی شدت سے نفرت کرنے لگی جس شدت سے وہ اس کی محبت میں گرفتار رہی تھی۔

زمان اس کی نفرت کی تاب نہ لاسکا اور اس نے یونیورسٹی کو خیر باد کہہ دیا۔ لیکن، وہ یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد بھی اس کا دیدار کرنے چھٹی کے وقت یونیورسٹی کے گیٹ پر موجود ہوتا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے یونیورسٹی کو خیر باد نہیں کہہ چکی۔ جب اسے دیکھنے کی ہر امید دم توڑ گئی تو اس نے اپنے آپ کو گھر تک محدود کر لیا اور اپنا بیشتر وقت مطالعے میں صرف کرنے لگا۔

عزیز خان نے اس کی تنہائی پسندی سے خوف زدہ ہو کر اسے دوبارہ اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں کے درمیان ایک نامعلوم سی دوری پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے کبھی ان کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کی۔ لیکن دونوں کے درمیان ایک حجاب سا قائم ہو گیا۔

عزیز خان جو اس کی پراگندہ طبعی سے پریشان رہنے لگے تھے، ایک دن اس کے کمرے میں گئے اور کہا:

''بیٹا۔ پریشان نہ ہو۔ میں ماہ نور کے گھر اس کے رشتے کا پیغام لے کر جا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے اس کے گھر والے مان جائیں گے۔''

''میں کسی ایسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا، جو مجھ سے نفرت کرتی ہو۔ چاہے مجھے اس سے کتنی ہی محبت کیوں نہ ہو'' اس نے بغیر کچھ سوچے فوراً جواب دیا۔

عزیز خان جو، اس جواب کی توقع نہیں کر رہے تھے، حیرت سے اس کا منہ تکنے لگے۔

''تو بیٹا پھر اس کو بھول جاؤ۔ تمھارے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی ہے؟''

''یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' اس نے کتاب کا صفحہ الٹتے ہوئے کہا۔

''برادری کی ایک سے ایک خوبصورت لڑکی تم پر مرتی ہے۔ تمھاری ہر کزن کی خواہش ہے کہ اس کی شادی تم سے ہو۔ تم کسی کا نام لو، میں ابھی تمھارے رشتے کی بات پکی کرانے جاتا ہوں۔'' عزیز خان نے اس کے ہاتھ سے کتاب لیتے ہوئے پدرانہ شفقت سے کہا۔

''لیکن میں ان میں سے کسی سے محبت نہیں کرتا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''بیٹا شادی کے بعد خود بخود محبت ہو جاتی ہے۔'' عزیز خان نے اسے سمجھانے کی کوشش

کی ۔وہ خاموش رہا اور لیٹ کر چھت میں گھورنے لگا۔

عزیز خان نے اس کی خاموشی کو نیم رضامندی سمجھا اور اگلے دن اس سے مشورہ کیے بغیر اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی ماریہ کا رشتہ طے کر آئے ۔اس نے بھی ان کے فیصلے کو خاموشی سے قبول کر لیا۔

ابھی شادی کو بہ مشکل تین ماہ ہی گزرے تھے کہ اس نے خود کو بیوی سے علاحدہ کر لیا، اور دوسرے کمرے میں سونے لگا۔عزیز خان کو جب اس کا پتہ چلا تو انھوں نے اسے بلایا اور کہا:

''بیٹا ماشاء اللہ تم جوان ہو۔سمجھ دار ہو ۔وقت کی نزاکت کو سمجھو ۔زندگی بہت قیمتی چیز ہے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ضروری نہیں کہ انسان کی ہر خواہش پوری ہو۔''

''وقت اور زندگی دونوں ہی ناقابلِ فہم ہیں ۔انھیں گزارا تو جا سکتا ہے، سمجھا نہیں جا سکتا۔'' اس نے سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عزیز خان کو بیٹے کی طرف سے اس طرح کے سخت جواب کی توقع نہیں تھی ۔انھیں اس پر شدید غصہ آیا ۔اس سے پہلے کہ وہ اس کا اظہار کرتے ،ان کے کانوں میں اپنے دادا کی آواز گونجنے لگی:

''اس کی شکل وصورت میرے دادا ظفر علی خان سے بہت ملتی ہے ۔یہ انھیں کی طرح حساس طبیعت کا ہوگا ۔اس کا خیال رکھنا۔''

اور وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

(۵)

چھوٹے خان کو اسپتال لائے آج دوسرا دن تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، اس کے ہوش میں آنے کی امیدیں دم توڑتی جا رہی تھیں۔ دوپہر کے وقت اسپتال کے ایم ایس نے عزیز خان کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو ایم ایس نے انھیں ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

''سردار صاحب۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ابھی تک آپ کے بیٹے کو ہوش میں نہیں لا سکے۔ میں آپ کے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن بطور ایک ڈاکٹر کے، میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں آپ کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کر دوں۔ ابتدائی رپورٹس میں جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں، چھوٹے خان جی سخت سردی میں، ایک بلند پہاڑ پر کئی گھنٹے موجود رہے۔ شدید سردی اور آکسیجن کی کمی کی وجہ سے ان کے دماغ کے دائیں حصے میں سوجن ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ Cerebral Edema کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ کومے کی ایک شکل ہوتی ہے۔ لیکن یہ ہماری ابتدائی تشخص ہے۔ کومے میں جانے کی کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ ہم ہر پہلو سے تشخیص کر رہے ہیں۔ جیسے ہی کوئی مزید اپ ڈیٹ سامنے آتی ہے۔ میں خود آپ کو آگاہ کر دوں گا۔''

ایم ایس نے دیوار پر لگے ایک پوسٹر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ جس پر انسانی دماغ کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ کچھ دیر وہ وہیں نظریں جمائے خاموش کھڑا رہا۔ پھر عزیز خان کی نظروں سے نظریں بچاتے ہوئے ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ جو دکھ کی تصویر بنے، گہری سوچوں میں غلطاں تھے اور ان کی نظریں اپنے آگے کو کیے ہوئے پاؤں پر مرکوز تھیں۔

''میں نے یہ تمام باتیں دوپہر کو وزیر صاحب کے بھی گوش گزار کر دی تھیں۔ جب وہ انھیں دیکھنے آئے تھے۔ انھوں نے ہی حکم دیا تھا کہ اس تمام صورتِ حال سے آپ کو آگاہ کر دوں۔'' ایم ایس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری طرف سے کوئی کوتاہی

نہیں ہوگی۔بس آپ دعا کریں کہ جیسا ہم اب تک کی ہونی والی تشخیص کی روشنی میں سمجھ رہے ہیں ویسا ہی ہو۔کومے کی دوسری شکلوں کی بہ نسبت اس میں مریض کے دوبارہ ہوش میں آنے کے چانسز زیادہ ہوتے ہیں۔'' اس نے عزیز خان کی پشت پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''بہت شکریہ۔ڈاکٹر صاحب۔لیکن اس میں کتنا وقت لگ سکتا ہے'' عزیز خان نے پوچھا۔ان کے لہجے میں اگرچہ خاصا سنبھلاؤ تھا لیکن اس میں بے تابی کا عنصر نمایاں تھا۔

''یہ چند گھنٹے بھی ہو سکتے ہیں اور کئی ۔۔۔۔'' ایم ایس جملہ ادھورا چھوڑ کر میز پر پڑے ہوئے فون کی طرف لپکا جس کی گھنٹی کی آواز سے کمرہ گونجنے لگا تھا۔

پانچواں باب

خواب در خواب

(۱)

زمان: زلزلہ ختم ہونے کے بعد کافی دیر تک پتھر یلے چبوترے پر کھڑا رہا۔اس نے زمین کے ساکت ہوتے ہی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں مگر اسے لگا جیسے زمین کے ساکت ہو جانے کے باوجود، چیڑ کے درختوں سے برف روئی کے گالوں کی طرح اب بھی گر رہی ہے اور ہر گزرتا لمحہ اس میں تیزی لا رہا ہے۔اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں تو سوائے برف باری کے اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔نہ پہاڑ۔نہ درخت۔نہ آسمان۔نہ چاند۔نہ چاندنی۔نہ خود اس کا اپنا وجود۔زمین سے آسمان تک ہر طرف برف ہی برف تھی۔

اس نے گھبرا کر اپنی آنکھیں دوبارہ بند کیں تو اپنے اندر بھی اسے ہر طرف برف ہی برف سجھائی دی۔اس نے اپنے دماغ پر زور ڈالا اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن سوائے برف کے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔اس نے محسوس کیا کہ اس کی یادداشت میں موجود ہر منظر برف کی دبیز چادر تلے دب چکا ہے۔

اچانک اسے اپنے دونوں پاؤں کے درمیان کھنچاؤ کا احساس ہوا۔اسے لگا جیسے پتھر پر بنی دراڑ چوڑی ہو رہی ہے اور اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔جوں ہی اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش میں، اپنی ٹانگیں سمیٹیں، اس نے خود کو خلا میں تیرتا ہوا محسوس کیا۔مارے خوف کے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔کافی دیر اپنی چیخ پر غور کرنے اور اس کی آواز سننے کی کوشش کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی چیخ بے آواز تھی۔بالکل بے آواز۔وہ مزید گھبرا گیا اور ایک مرتبہ پھر پورے زور سے چیخا۔مگر اب کی بار بھی اسے اپنی آواز سنائی نہیں دی۔اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو اسے ہر طرف اندھیرا دکھائی دیا۔گھپ اندھیرا۔

برفیلے منظر سے چھٹکارا حاصل کر کے اسے ہلکی سی مسرت کا احساس ہوا اور اپنی بے آواز چیخ کی طرف سے اس کا دھیان ہٹ گیا۔تاہم گرنے کا احساس بدستور قائم رہا اور وہ خود کو سنبھالنے کے لیے

خلا میں ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اسے لگا کہ وہ کسی گہری، بہت گہری کھائی میں گر رہا ہے۔ ایک ایسی کھائی میں؛ جس کی تہ تک پہنچنے کے لیے صدیاں درکار ہیں۔

اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر اسے کچھ یاد نہ آیا۔ البتہ برف سے چھٹکارا پانے اور گرنے کے احساسات کے ساتھ اب ایک اور احساس نے بھی اس کے وجود میں کہیں جگہ بنائی تھی؛ اور وہ تھا اپنے وجود کے اندر کی طرف گرنے کا احساس۔ اسے لگا کہ گرنے کا یہ عمل دوہرا ہے۔ ایک طرف تو وہ کسی بہت گہری کھائی میں گر رہا اور دوسری طرف کہیں اپنے اندر۔ جیسے کسی ہوا بھرے غبارے میں، جب وہ ہوا میں اڑ رہا ہو، کوئی باریک سا سوراخ ہو جائے اور وہ نیچے کی طرف گرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کی جانب بھی ڈھنے لگے۔

نہ جانے وہ کتنی دیر گراؤ کے اس دوہرے عمل کو محسوس کرتے ہوئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر مایوس ہو کر اپنی آنکھیں بند کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ لیکن برف باری کا خیال آتے ہی اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس نے سوچا۔ برفیلے منظر سے اندھیرا دیکھنا کم خوفناک ہے۔

اس نے اپنے تمام حواس؛ گراؤ کے دوہرے عمل پر مرکوز کر لیے اور اپنی منزل کا انتظار کرنے لگا۔ وہ اس عمل کو ہر حس کے ذریعے محسوس کرنا چاہتا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے احساس ہونے لگا کہ گرنے کے اس دوہرے عمل میں سے کوئی ایک اپنے اختتام کے قریب پہنچ چکا ہے اور آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے لیکن اس بات کی نشاندہی نہیں ہو پا رہی تھی کہ کون سا عمل؟ وجود کے باہر گرنے کا، یا اس کے اندر گرنے کا؟ اس نے اپنے تمام حواس کو اسی پر مرتکز کر لیا۔ واقعی دونوں میں سے ایک عمل گھٹ رہا تھا۔

اندھیرے سے وہ بہت مانوس ہو چکا تھا اور اس میں دیکھنا اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ لیکن اندھیرے میں مسلسل گھورنے کی وجہ سے اس کی پلکیں آہستہ آہستہ بوجھل ہونے لگیں۔ وہ برفیلے منظر کے خوف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر کب تلک بالآخر اسے اپنی آنکھیں بند کرتے ہی بنی۔

آنکھیں بند کرتے ہی اس کے تمام احساسات میں تازگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کے دماغ سے برفیلا منظر غائب ہو چکا تھا اور اس کی جگہ مانوس اندھیرے نے لے لی تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنی آنکھیں کھولیں۔ پھر بند کیں۔ پھر کھولیں۔ پھر بند کیں۔ اندر؛ باہر ہر طرف اندھیرا دیکھ کر خوشی کا ایک بھرپور احساس اس کے منہدم ہوتے وجود میں اتر گیا۔

''اندھیرا کائنات کی واحد چیز ہے جسے آنکھیں بند کر کے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔''

یہ عجیب وغریب خیال سوجھتے ہی اس نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں کھول کر بند کیں؛ اور پھر اپنی ساری توجہ گرنے کے دوہرے عمل پر مرکوز کر لی۔

اب کی بار غور کرنے پر اسے اچانک احساس ہوا کہ وہ اس حوالے سے غلطی پر ہے۔ گراؤ کے اس دوہرے عمل میں سے کوئی ایک معدوم نہیں ہو رہا۔ بل کہ اندر گرنے کا عمل؛ باہر گرنے کے عمل سے آہستہ آہستہ ہم آہنگ ہو رہا ہے۔ وہ کافی دیر انھیں ہم آہنگ ہوتے محسوس کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دونوں بالکل ایک ہو گئے۔ لیکن گرنے کا عمل مسلسل جاری رہا۔

اس کا خوف مکمل طور پر غائب ہو چکا تھا اور اب اس کی جگہ بوریت نے لے لی تھی۔ پہلے گراؤ کے دوہرے عمل کی وجہ سے کم از کم اسے کسی بھی مرحلے پر یکسانیت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب سے یہ دونوں عمل ایک دوسرے میں ضم ہوئے تھے، اسے بوریت سی ہونے لگی تھی۔ اس نے کئی مرتبہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر بار کی طرح اسے اب کی بار بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اب کی بار جب اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی تو اس کا سامنا خوفناک برفیلے منظر کے بجائے مانوس اور جانے پہچانے اندھیرے سے ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ ازل سے محوِ سفر ہے اور ابد تک اسی حالت میں رہے گا۔

(۲)

وہ اپنی آنکھیں بند کیے، خاموشی سے محو سفر تھا کہ یک دم اسے اپنے پپوٹوں پر روشنی کے جھماکے کا احساس ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آ گیا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی خوشی کی ایک لہر اس کے سارے وجود میں دوڑ گئی۔ لیکن اس لہر کا دورانیہ لمحہ بھر ہی تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے ایک خوفناک احساس نے آ گھیرا۔

''کہیں ایسا نہ ہو پھر وہی برفیلا منظر سامنے آ گیا ہو۔'' یہ سوچتے ہوئے اس کے وجود میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔

''دونوں میں یک سانیت سہی مگر اندھیرا بہر حال اس برفیلے منظر سے بہتر ہے۔ کم از کم آنکھوں پر بوجھ تو نہیں بنتا۔'' اس نے سوچا اور آنکھیں نہ کھولنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن روشنی کی چکاچوند آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ اس نے اپنی آنکھیں بدستور بند رکھیں مگر روشنی بند پپوٹوں کے غلافوں سے چھن چھن کر اندر آنا شروع ہو گئی۔ اس نے بند پپوٹوں کے اندر اپنی پتلیوں کو حرکت دی۔ اسے اپنا چہرہ جگمگاتا ہوا محسوس ہوا یہاں تک کہ خود اس کے لیے بھی اس کی تاب لانا ناممکن سا ہو گیا۔

وہ بدستور آنکھیں بند کیے اپنے خدوخال کی چکاچوند، تیسری آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز نے اسے ایک خوشگوار حیرت سے دوچار کر دیا۔ اس سے قبل وہ کوشش کے باوجود اپنی چیخ بھی نہیں سن سکا تھا۔ وہ کافی دیر تک اس آواز پر غور کرتا رہا۔ ہنسنے کی یہ آواز اسے جانی پہچانی لگی۔ اسے لگا جیسے ہنسنے والی لڑکی کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے فوراً اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلتے ہی سامنے سے آتی تیز روشنی کا ایک جھماکا اس کی پتلیوں میں جا گھسا اور اس کی آنکھیں یوں چندھیائیں کہ اسے کچھ سجھائی ہی نہ دیا۔ یک دم اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ جہاں اسے ایک جانا پہچانا منظر نظر آیا۔

''یہ منظر میں نے پہلے بھی دیکھ رکھا ہے۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ اور میں یہاں کیسے پہنچا؟'' اس

نے سوچا۔

اس نے اپنے آپ کو ایک پتھریلے ٹھلے پر بیٹھا ہوا پایا۔ جس کے چاروں طرف دھوپ میں پھیلا ہوا مانوس سا منظر تھا۔ جب اس نے اپنا رخ روشنی کے جھما کے والی سمت پھیرا تو اس کی نظر شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی خوبصورت جھیل پر پڑی۔ سورج کی کرنوں اور جھیل کے پانی کا زاویہ ایسا بن رہا تھا کہ ان کی روشنی جھیل کے پانی سے منعکس ہو کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ جب اس نے اپنی پتلیوں کو اوپر کی طرف گھمایا تو اس نے دیکھا کہ پانی؛ بلندی سے ایک بلوریں آبشار کی صورت میں نیچے گر رہا ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی نظریں آبشار کی ملتی بچھڑتی؛ بچھڑتی ملتی دھاروں کے ساتھ ساتھ اوپر کو اٹھانا شروع کیں تو دیکھا کہ عین اس جگہ پر، جہاں سے پانی آبشار کا روپ دھارنا شروع کرتا ہے، وہاں ایک خوبصورت لڑکی کھڑی، مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ اتنی حسین ہے کہ اس پر پری کا گمان ہوتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی وہ کچھ لجلجا کر پیچھے ہٹ گئی اور پھر اگلے ہی لمحے ندی پھلانگ کر گھنے جنگل میں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس نے فوراً اٹھ کر اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ ٹھلے کے شمالی کونے میں آلوچے کے ایک درخت کے ساتھ اسے ایک خوبصورت گھوڑا بندھا ہوا نظر آیا، جس پر زین کسی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بھرپور قلانچ بھری؛ گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑھ لگائی اور لڑکی کی تلاش میں نکل پڑا۔ وہ کافی دیر تک جنگل میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا، مگر وہ لڑکی کسی پرچھائیں کی طرح گھنے جنگل میں گم ہو چکی تھی۔ وہ اس پرچھائیں کا پیچھا کرتا کرتا دور جنگل میں نکل گیا۔ ایک جگہ اس کی نظر کچھ شناسا چہروں پر پڑی۔ جو دیودار کے دیوقامت درخت کاٹ رہے تھے۔

ان شناسا آدمیوں میں سے ایک نے اسے دیکھا تو اس کی طرف بھاگتا ہوا آیا اور اس کے گھوڑے کی لگام تھام کر اس کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ اسی گھبراہٹ کے عالم میں اس نے سہارا دے کر اسے گھوڑے سے اتارا اور حیرت کی تصویر بنا، اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس آدمی نے باقی لوگوں کو بھی آواز دی۔ وہ سارے اپنا کام دھندا چھوڑ کر بھاگتے ہوئے آئے اور اس کے گرد جمع ہو کر غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ سب کے سب گھبرائے ہوئے سے لگ رہے تھے:

''چھوٹے سردار جی آپ گھبرائیں نہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔'' وہ آدمی، جس نے اسے گھوڑے سے سہارا دے کر اتارا تھا، گویا ہوا۔ وہ ان سب کا سردار لگ رہا تھا۔

زمان خاموش رہا اور اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

اسے خاموش دیکھ کر وہ کچھ اور گھبرا گئے۔ اتنے میں اس آدمی نے، جو ان کا سردار لگ رہا تھا، باقی آدمیوں میں سے دو کو کوئی اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی انھوں نے اس کے گھوڑے کو، جس پر بیٹھ کر وہ آبشار سے یہاں تک پہنچا تھا، ایک دوسرے گھوڑے کے پیچھے باندھا۔ پھر ان سب نے مل کر اسے اگلے گھوڑے پر بٹھایا اور وہ آدمی ___ جو، ان سب کا سردار لگ رہا تھا ___ خود اس کے پیچھے بیٹھ کر ایک طرف کو روانہ ہو گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا؛ دو اور گھڑ سوار بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔

بیشتر راستہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ لیکن وہ ابھی تک الجھن کا شکار تھا، اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال اٹھ رہے تھے۔ یہ لوگ کون ہیں؟ وہ لڑکی کون تھی جو جنگل میں غائب ہو گئی تھی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ یہاں کیسے پہنچا؟ اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی تو اسے بس اتنا یاد آیا کہ شروع شروع میں اس کے دماغ میں برف گر تی رہی تھی، جس پر بعد میں اندھیرے کی چادر بچھ گئی تھی، جو اسے مانوس لگی تھی؛ پھر نہ جانے وہ کتنے عرصے تک اندھیرے میں سفر کرتا رہا تھا۔

''یہ لوگ کون ہیں اور مجھے کہاں لے جا رہے ہیں؟'' اس نے گھوڑے کے ایال کو بغور دیکھتے ہوئے دوبارہ سوچا۔

گھوڑا پگڈنڈی سے دریا کی ریتی پر اترتے ہوئے کچھ لڑکھڑایا اور اُس کا جسم گھوڑے کی پیٹھ پر تھوڑا سا آگے کو سرکا تو اسے یاد آیا کہ جب وہ اندھیرے میں گر رہا تھا تو اسے اپنا وجود بھی اندر کی طرف ڈھہتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس نے کسی جبلی جذبے کے تحت اپنے وجود کو ٹٹولا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اپنے بدن سمیت موجود ہے۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے بہتے پانی کی موسیقی سے لطف اندوز ہونے لگا۔

کافی دیر بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے مانوس اجنبی ساتھیوں کے ساتھ ایک دریا پار کر کے کسی دوسرے دریا میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ دریا بھی اس کا جانا پہچانا تھا۔ فرلانگ بھر کے فاصلے سے شروع ہونے والے کسی پہاڑ کی چوٹی پر سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کے عین نیچے ایک تنگ درے میں دونوں دریا آپس میں مل رہے تھے۔ اسے یاد آیا کہ وہ دریاؤں کے اس سنگم سے پہلے بھی کئی بار گزرا ہے۔ لیکن کب اور کیوں؟ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''لیکن میں ہوں کون؟'' اس نے اردگرد سے نظر ہٹا کر دوبارہ گھوڑے کے ایال پر مرکوز کرتے ہوئے خود سے سوال کیا۔ اس سوال کے پیدا ہوتے ہی، اس کے لیے اپنی شناخت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دماغ پر زور ڈال کر خود کو کریدنے کی کوشش کی، اسے بس اتنا یاد آیا کہ اس کے پیچھے

بیٹھے ہوئے آدمی نے اسے ''چھوٹے سردار جی'' کہہ کر بلایا تھا۔

''سردار جی آپ گھبرائیں نہیں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔'' اس کے کانوں میں اس آدمی کے کہے ہوئے الفاظ گونجے اور دیر تک گونجتے رہے۔

''میں چھوٹا سردار ہوں؟۔کیا یہی میرا نام ہے۔اگر میرا نام یہی ہے تو مجھے اور کچھ کیوں یاد نہیں آ رہا۔؟ مجھے یہ لوگ پہچانتے ہیں اور میں بھی انھیں پہچانتا ہوں۔لیکن میں اپنے آپ کو کیوں نہیں پہچان پا رہا؟۔'' اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوال اٹھنے لگے۔

''میں کون ہوں؟ میں کون ہوں؟'' یہ سوال اس کے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برسنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی گردن اپنا بوجھ نہیں سہار پا رہی اور ایک طرف لڑھک رہی ہے، جسے کوئی ہاتھ سہارا دے رہا ہے۔اگلے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو کسی کی گود میں گرتا ہوا محسوس کیا۔

(۳)

اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک بڑے کمرے میں موجود پایا۔ یہ کمرہ اس کا جانا پہچانا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ یہاں پہلے بھی آچکا ہے۔ کمرے میں دو اور لوگ بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک اس کے بائیں طرف والی کرسی پر جب کہ دوسرا سامنے والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ یہ دونوں اس کے شناسا تھے۔ خاص کر اس کے بائیں طرف والی کرسی پر بیٹھا ہوا شخص، اسے بہت جانا پہچانا لگا۔ دونوں آدمی ایک دوسرے سے ہر حوالے سے مختلف تھے۔ سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کے چہرے کے خدوخال، اس کی وضع قطع، چال ڈھال اور اس کا لباس خاصا مختلف تھا جب کہ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کی شکل و شباہت اور وضع قطع، اس کے اپنے جیسی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے یہ شخص، سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کی نسبت زیادہ مانوس لگا۔ درمیان میں رکھی ہوئی میز پر برتن بکھرے پڑے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہیں۔ کھانے کا خیال آتے ہی اسے اپنی زبان پر تازہ کھائے ہوئے کھانے کا ذائقہ محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے اس نے بھی ابھی ابھی ان کے ساتھ کھانا کھایا ہے۔

اس نے محسوس کیا کہ سامنے بیٹھا ہوا آدمی، اس کی نظروں سے نظریں بچا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اسے الجھن سی ہونے لگی۔

''میں کون ہوں اور یہاں کیسے آیا ہوں۔ یہ کون لوگ ہیں؟ جو میری نظروں سے نظریں بچا کر مجھے گھور رہے ہیں۔ ان کے اس طرح دیکھنے کا مطلب کیا ہے؟۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے فوراً وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔

''میں چلتا ہوں۔ آپ کی تواضع اور مہمان نوازی کا شکریہ'' ۔ اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں جناب !شکریہ تو آپ کا۔ آپ نے میری عزت افزائی کی۔''

سامنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے آدمی نے، اٹھ کر، اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ دوسرا آدمی بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''ایبٹ کو آپ کے فیصلے کا انتظار رہے گا۔ مجھے یقین ہے آپ کا فیصلہ بہتر نتائج لائے گا۔

میں بہت جلد نور آباد میں آپ کے دولت کدے پر حاضری دوں گا۔'' اجنبی وضع قطع والے شخص نے گرم جوشی سے اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

''کون ایبٹ؟ کون سا فیصلہ؟ اور کیسے نتائج؟'' اس نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے سوچا۔

''یہ نور آباد کون سی جگہ ہے؟ اور اس سے میرا کیا تعلق ہے؟۔'' اس نے صحن سے باہر ایک ڈھلوانی راستے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے سوچا۔

''میں بہت جلد نور آباد میں آپ کے دولت کدے پر حاضری دوں گا۔'' اس کے ذہن میں یہ جملہ دوبارہ گونجا۔

''اس کا مطلب ہے میں نور آباد کا رہنے والا ہوں۔ لیکن وہ ہے کہاں؟۔ اس نے اپنے ذہن میں نور آباد کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے ذہن میں اس جگہ کے حوالے سے کسی قسم کا کوئی تصور نہ ابھر سکا۔

''میں اگر نور آباد پہنچ جاؤں تو میری شناخت کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔'' اس نے سوچا۔

اندھیرے میں ڈوبا ہوا راستہ اسے جانا پہچانا لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اس بلند و بالا پہاڑی علاقے میں پہلے بھی کئی بار آ چکا ہے۔

''میں نور آباد کیسے پہنچ سکتا ہوں؟۔'' اس نے خود سے سوال کیا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ کوئی اور بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اسے اندھیرے میں ایک انسانی ہیولا سا دکھائی دیا۔ بغور دیکھنے پر اسے معلوم ہوا کہ وہ کمرے میں بیٹھے ہوئے اشخاص میں سے ایک ہے۔ یہ وہی تھا، جو اسے زیادہ مانوس لگا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

''یہ شخص میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے؟'' اسے الجھن سی ہونے لگی۔

''کہیں یہ میری جاسوسی تو نہیں کر رہا؟۔ اگر کر بھی رہا ہے تو کیوں؟۔ ایسا کرنے سے اسے ملے گا کیا؟۔ مجھے تو خود اپنی شناخت کا مسئلہ درپیش ہے۔'' طرح طرح کے اندیشے اس کے ذہن میں سر سرانے لگے۔

''چلو۔ اس آدمی سے پوچھتا ہوں کہ نور آباد کہاں ہے؟۔ اس کو ضرور پتا ہوگا۔ اگر میں وہاں پہنچ گیا تو وہاں کوئی نہ کوئی ایسا آدمی ضرور ہوگا، جو مجھے بتا سکے گا کہ میں کون ہوں۔'' یہ سوچتے ہوئے، وہ

پیچھے مڑنے کے لیے جوں ہی رکا، پیچھے چلتا ہوا شخص اس سے آ ٹکرایا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کیا۔ اسے لگا کہ وہ دوبارہ اندھیرے کے ہوائی سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔ جہاں گراؤ کا دوہرا عمل ایک مرتبہ پھر اس کا مقدر بن چکا ہے۔

گرتے گرتے اسے محسوس ہوا کہ اس کا وجود بہت تیزی کے ساتھ سکڑ رہا ہے۔۔ چند ہی لمحوں بعد اس نے اپنے آپ کو چادر کے ایک جھولنے میں پایا۔ اس نے دیکھا کہ جھولنا ایک چارپائی کے ساتھ باندھا ہوا ہے اور وہ اس میں آرام سے لیٹا ہوا ہے۔ اس نے اپنے جسم کو ٹٹولا۔ اسے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس کا وجود سکڑ کر ایک چھوٹے سے دودھ پیتے بچے جتنا ہو گیا۔ اس خیال کے آتے ہی اسے بھوک نے ستانا شروع کر دیا۔ اس نے دودھ مانگنے کے لیے منہ سے آواز نکالنا چاہی۔ جو بلبلاہٹ میں بدل گئی۔

اچانک اس کے کانوں میں لکڑی کی بڑی بڑی کڑیوں کے ٹوٹنے کی آواز گونجی۔ پھر ایک دھماکے کے ساتھ ملبے کا ایک بہت بڑا پہاڑ اس کے اوپر آ گرا۔ جس سے اس کا سارا وجود دہل سا گیا۔ مارے خوف کے اس نے رونا شروع کر دیا۔ نہ جانے وہ کتنی دیر یوں ہی روتا رہا اور پھر روتے روتے سو گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے اردگرد مٹی گرتی ہوئی محسوس ہوئی جس سے مدھم سی آوازیں بھی پیدا ہو رہی تھیں، وہ کافی دیر، ان آوازوں پر کان لگائے رہا۔ آہستہ آہستہ ان آوازوں کے ساتھ کچھ اور بے ترتیب سی آوازیں بھی شامل ہو گئیں۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے اوپر پڑے ملبے کا پہاڑ کوئی کھود رہا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ آوازیں صاف اور واضح ہوتی چلی گئیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اسے اپنے سر کی طرف ہلکی سی روشنی کا احساس ہوا اور اسے لگا جیسے اب اسے سانس لینے میں زیادہ آسانی ہو رہی۔ اس کے ساتھ ہی سرد ہوا کا ایک جھونکا اس کے وجود کی طرف لپکا۔

اس نے کسی کو پکارنا چاہا۔ لیکن اس کی پکار، بلبلاہٹ میں بدل گئی۔ وہ جوں جوں زور سے پکارنے کی کوشش کرتا اس کے کانوں میں اپنے رونے کی آواز اتنی ہی تیز گونجتی۔

''ٹھہرو۔ ٹھہرو۔'' اسے باہر کسی کے چلانے کی آواز آئی۔

اس آواز کے ساتھ ہی ٹھک ٹھک کی آوازیں اچانک بند ہو گئیں۔ کچھ دیر ہر طرف خاموشی چھائی رہی۔

''وہ زندہ ہیں۔ ابھی مجھے رونے کی آواز آئی ہے۔'' ایک مختصر وقفے کے بعد ایک اور آواز

اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

آواز کی گونج سنتے ہی اس نے دوبارہ پکارنا شروع کر دیا۔ جورونے اور بلبلانے کی آوازوں میں بدل کر اس کے اپنے کانوں سے ٹکرانے لگی۔

پھر اس کے کانوں میں کسی اور کے پھوٹ پھوٹ کر رونے کی آواز بھی آنے لگی۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے قریب آتی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد اسے لگا کہ وہ رونے والا شخص اس کے بالکل قریب ہے، لیکن اسے کوئی پیچھے دھکیل رہا ہے۔

''چھوڑ دو اس کو۔ شکر کرو۔ وہ رویا تو ہے۔ اگر روتا نہ تو اس کا دل پھٹ جاتا۔ اسے کرنے دو جو کرنا چاہتا ہے۔ تم لوگ دوسری طرف سے ملبا ہٹاؤ۔'' پہلی آواز سے ملتی جلتی آواز میں یہ جملے اس کے کانوں سے ٹکرائے۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب کچھ اسی کو یہاں سے نکالنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔

اس کے بعد اس پر سے ملبا ہٹانے کے کام میں یک دم تیزی آ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس تیزی میں ایک خاص طرح کی احتیاط بھی شامل ہے۔ جوں جوں ملبا ہٹ رہا تھا، اپنے رونے کی آوازوں کے ساتھ ساتھ ٹھک ٹھک کی آوازیں بھی اسے سنائی دینے لگیں۔ جن میں ''ذرا دیکھ کے۔ ذرا احتیاط سے۔ دیکھنا دیکھنا۔ مٹی نیچے نہ گرے۔'' جیسی آوازیں بھی شامل تھیں۔

اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے سر کی طرف ملبے میں ایک خاصا بڑا شگاف بنا لیا گیا ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اپنی طرف ایک ٹھنڈا یخ اور گارے سے لپڑا ہوا ہاتھ بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ اس ہاتھ نے اسے جھولے سے باہر نکال کر سینے سے چمٹایا اور اگلے چند لمحوں میں وہ اسے سینے سے لگائے، شگاف سے باہر نکل رہا تھا۔ جوں ہی وہ کسی کی چھاتی سے چمٹا ہوا باہر نکلا، اس نے دیکھا کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔ اس نے چیخنا چلانا بند کر دیا اور اس آدمی کی طرف دیکھنے لگا جو اسے چارپائی سے بندھے جھولے سے نکال کر اپنے سینے سے چمٹائے باہر لایا تھا۔ اسے وہ شخص اتنا مانوس لگا جیسے وہ شخص بھی وہ خود ہی ہو۔

''ملبے کے نیچے دبا ہوا بھی میں اور اس سے خود کو نکالنے والا بھی میں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟۔''

اس نے اس شخص کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ جو محبت سے لبریز اپنی نگاہوں میں، اس کے چہرے کو سمیٹے، تیزی سے کسی طرف بھاگ رہا تھا۔ کئی اور لوگ بھی اس کے قدموں سے قدم ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''فقیرے! بچے کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔ اسے لپیٹو۔'' پیچھے بھاگتے ہوئے کسی شخص نے آواز لگائی۔ یہ سنتے ہی تیز ہوا کا ایک سرد جھونکا اس کی ہڈیوں میں سرایت کر گیا۔

اگلے ہی لمحے اس نے خود کو کسی کمبل میں لپٹا ہوا پایا۔ کمبل بہت موٹا لگ رہا تھا اور اس کے اندر ہر طرف مانوس اندھیرے کی ایک دبیز چادر تنی ہوئی تھی۔ جس میں وہ خود کو بہت محفوظ محسوس کر رہا تھا۔

کمبل کے باہر سے، بہت سے قدموں کے تیز تیز چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جن میں سے ایک آواز دوسروں سے قدرے نمایاں تھی۔ وہ کمبل سے باہر ہونے والی افراتفری کو کانوں کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ ان آوازوں کے بیچ میں کہیں ''دھک دھک'' کی ایک اور آواز بھی ہے۔ اس نے باقی آوازوں کو نظر انداز کر کے ساری توجہ اس آواز کی جانب مبذول کر لی اور اس کی سمت کا اندازہ لگانے لگا۔ اگلے کچھ ہی لمحوں میں اس نے اس آواز کی سمت معلوم کر لی۔ وہ آواز اس شخص کے سینے سے آ رہی تھی، جو اسے اٹھائے ہوئے بھاگ رہا تھا۔ اس نے اس آواز پر کان لگا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ آواز اسے ایک لوری کی طرح محسوس ہوئی، جسے سنتے سنتے نیند اسے اپنی آغوش میں لینے لگی۔

(۴)

جب اُس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو کسی میدانِ جنگ میں پایا۔ جہاں ہر طرف اس کے شناسا چہروں کی بے شمار لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک جیسے چہرے، ایک جیسے جسم اور ایک جیسے زخم۔ وہ ان لاشوں کو روندتا، پھلانگتا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک لاش نے اس کے قدم روک لیے۔ اس لاش کا لباس باقی لاشوں کے لباس سے خاصا مختلف تھا۔ اس نے غور سے دیکھا تو اس کے خدوخال بھی باقی لاشوں کے خدوخال سے کچھ مختلف تھے۔ لاش کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس نے ان میں جھانک کر دیکھا تو اس کے دل میں عقیدت کے جذبات ابھرنے لگے۔

''یہ لاش کس کی ہے؟ اس آدمی کے ساتھ ضرور میرا کوئی دلی رشتہ ہے۔'' اس نے لاش کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔

''مرشد! مرشد!'' اس کے پیچھے کھڑا آدمی پکارا اور لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔ اس کی پکار میں، محبت، عقیدت اور دکھ کے جذبات اس طرح مل گھل گئے تھے کہ ان میں دوئی کا شائبہ تک نہیں تھا۔

''یہ مرشد ہے۔ لیکن میں کون ہوں؟'' اس نے لحہ بھر کے لیے سوچا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ذہن سے یہ سوال محو ہو گیا اور اسے لگا جیسے وہ اس کا بھی مرشد ہے۔

''سید احمد بریلوی شہید ہو گئے ہیں۔'' لاش سے لپٹ کر رونے والا اُٹھ کر اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے چلایا۔ سید احمد بریلوی کا نام سنتے ہی اس کی آنکھوں کے آگے وہ منظر لہرایا جب وہ پہلی بار اپنے قبیلے کے سربراہ کا پیغام لے کر ان کے پاس گیا تھا۔

وہ عقیدت سے مرشد کے چہرے پر جھکا۔ اسے لگا جیسے وہ زندہ ہے۔ اس نے مرشد کی چھاتی پر سر رکھ کر، ان کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی۔ کچھ دیر اسے دھک دھک کی آواز سنائی دیتی رہی لیکن بغور سننے پر اسے لگا کہ اس کے کان بج رہے ہیں۔ لحہ بھر کے لیے اسے وہ شخص یاد آیا جو اسے مکان کے ملبے سے نکال کر کمبل میں لپیٹے بھاگ رہا تھا۔ اس نے مرشد کے سینے کے بائیں حصے میں عین دل کی جگہ کو ٹٹول کر دیکھا، جہاں ایک گہرا گھاؤ تھا۔ گولی ان کے دل کو چھید کر اندر کہیں دور اتر گئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اسے لگا جیسے وہ بھی مر چکا ہے۔اس احساس کے ابھرتے ہی اس نے اپنے بدن کو ٹٹول کر دیکھا۔

خود کو زندہ پا کر وہ شدید صدمے سے دوچار رہا۔اس نے اردگرد دیکھا جہاں اور بھی بہت سے لوگ زندہ تھے۔جن میں سے اکثر اس کے شناسا تھے۔ایک دو چہرے تو اسے بہت زیادہ مانوس لگے۔

اتنے میں اسے سامنے کی ڈھلوان سے فوج کا دستہ اترتا ہوا دکھائی دیا۔جسے دیکھ کر اس کے اردگرد کھڑے لوگ بھاگنے لگے۔انھوں نے اسے بھی بھاگنے کا اشارہ کیا۔

بھاگتے بھاگتے وہ لمحہ بھر کے لیے رکے،مڑے،اور اس سمیت چار پانچ لوگوں نے یک بارگی جھک کر مرشد کی لاش اٹھائی اور دوبارہ بھاگنے کی کوشش کرنے لگے۔لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ لاش کو اٹھا کر بھاگنا مشکل ہو رہا ہے تو انھوں نے لاش کو انتہائی احترام کے ساتھ دوبارہ زمین پر رکھا، ایک نظر سامنے ڈھلوان سے اترتے ہوئے لشکر کو دیکھا اور پھر اس سمیت اس کے سب ساتھیوں نے اپنی بندوقیں کندھوں سے اتار کر پرے پھینکیں اور نیام سے تلواریں نکال کر واپس میدانِ جنگ کی طرف دوڑ لگا دی۔وہاں پہنچ کر وہ اور اس کے ساتھی اپنے ہی ساتھیوں کے مردہ جسموں پر پل پڑے۔انھوں نے دو درجن کے قریب لاشوں کے سر تن سے جدا کیے۔اس نے اپنی تلوار سے،مرشد کی لاش کا سر انتہائی احتیاط کے ساتھ تن سے جدا کر کے ساتھ لیا اور باقی لوگوں کے ساتھ میدانِ جنگ سے فرار ہو گیا۔

کافی دیر بھاگنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔گھوڑوں پر سوار دشمن کی فوج کا ایک دستہ ان کے بہت قریب پہنچ چکا تھا۔آگے ایک موڑ تھا، جیسے ہی وہ موڑ مڑا اور گھڑ سواروں کی نظروں سے اوجھل ہوا۔وہ رستہ چھوڑ کر رستے کے نشیب میں واقع گھنے جنگل میں گھس گیا۔اس کی دیکھا دیکھی اس کے ساتھی بھی جنگل میں گھس گئے۔جنگل گھنا اور ڈھلوانی تھا۔جس میں جگہ جگہ اونچے نیچے ٹوٹے ہوئے ،ابھری ہوئی چٹانیں اور کھائیاں تھیں۔وہ اور اس کے ساتھی ان کی اوٹ میں چھپ گئے۔کافی دیر تک انھیں راستے کے قریب گھوڑوں کے قدموں کی آوازیں آتی رہیں جو آہستہ آہستہ دور جاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''میرا خیال ہے کہ وہ آگے نکل گئے ہیں۔لیکن یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔وہ تھوڑا آگے جا کر جب دیکھیں گئے،اور ہم نظر نہیں آئیں گے تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ ہم اس جنگل میں چھپے ہیں۔ہمیں فوراً نیچے دریا کی طرف اتر جانا چاہیے۔'' اس کے ایک ساتھی نے مشورہ دیا۔

''ہاں۔عبداللہ خان ٹھیک کہہ رہا ہے''۔بیک وقت دو تین آوازیں بلند ہوئیں۔

''سب لوگوں کو خبر کر دو۔دیکھو کوئی رہ نہ جائے۔''عبداللہ خان نے کہا اور سب آہستہ آہستہ دریا کے کنارے کی طرف سرکنے لگے۔

جہاں کہیں جنگل کی گھنائی کچھ کم ہوتی۔سب لوگ کچھ دیر کے لیے رک جاتے۔پھر دو تین آدمی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دبے پاؤں آگے بڑھتے، جب انھیں تسلی ہو جاتی کہ آگے کا علاقہ محفوظ ہے تو وہ اپنے باقی ساتھیوں کو آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے۔جب وہ دریا کنارے پہنچے تو اندھیرا شور کرتے پانیوں پر تیر رہا تھا۔

دریا پر پہنچ کر انھوں نے پہلے جی بھر کر پانی پیا، پھر وضو کیا۔وضو کر کے سب لوگ دریا کنارے ایک ہموار جگہ پر جمع ہو گئے۔پھر دو مختلف صفیں ترتیب دی گئیں۔پہلے ایک صف امام کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اور دوسری پہرہ دیتی رہی۔جب پہلی رکعت ختم ہوئی تو وہ صف پیچھے ہٹ گئی اور پہرہ دینے لگی۔جب کہ پہرہ دینے والی صف امام کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئی۔اسی ترتیب سے انھوں نے باجماعت نماز ادا کی۔

نماز پڑھ کر انھوں نے اپنے دو ساتھیوں کو بالاکوٹ کے گاؤں کدالیں اور بیلچے لانے کو بھیجا اور انھیں تاکید کی کہ اگر رستے میں دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو جائے تو بھاگنا نہیں بل کہ اپنے آپ کو یہیں کے کسی گاؤں کا رہائشی ظاہر کرنا۔

جب کافی دیر گزر گئی اور وہ واپس نہ پلٹے تو انھیں کچھ شک گزرا۔بیشتر لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔اتنے میں انھیں قدموں کی آواز سنائی دی۔سب خاموش ہو گئے اور بھاگ کر پتھروں کی اوٹ میں چھپ گئے۔پھر آہستہ آہستہ نیام سے تلواروں کے نکلنے کی آوازیں پانیوں کے شور میں گڈمڈ ہونے لگیں، لیکن قدموں کی آہٹ ان سے ممیز تھی۔وہ سب قدموں کی آوازوں کی طرف کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگے۔جب اندھیرے میں انھیں صرف دو ہیولے نظر آئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ یہ ہمارے ہی ساتھی ہیں تو وہ پتھروں کی اوٹ سے باہر نکل آئے۔

انھوں نے دریا کے کنارے ایک اونچی جگہ کو نشان زد کیا اور زمین کھودنے لگے۔جب قبر تیار ہو گئی تو انھوں نے مرشد کے سر کو ایک کپڑے سے نکال کر غسل دیا اور اسے میدان کے مغربی کنارے پر واقع ایک اونچے پتھر پر رکھ کر صفیں ترتیب دینے لگے۔فیصلہ کیا گیا کہ نماز جنازہ چوں کہ فرض کفایہ ہے اس لیے سب کا جماعت میں شامل ہونا ضروری نہیں۔لہٰذا کچھ لوگ چاروں طرف پہرہ دیں۔

نماز جنازہ کے بعد مرشد کے سر کو، اس نے اپنے ہاتھوں سے انتہائی عقیدت واحترام کے ساتھ قبر میں اتارا اور قبر پر تختے رکھنے کا عمل شروع کر دیا گیا۔ جس میں وہ خود بھی پیش پیش تھا۔

جیسے ہی آخری تختہ رکھا گیا۔ اسے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ تختوں کی درزوں میں گارا بھرتے ہوئے اسے لگا جیسے قبر میں مرشد کے سر کے ساتھ اس کا دھڑ بھی دفن کیا جا رہا ہے۔

جب مٹی ڈالنے کا کام آغاز ہوا تو اسے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کے گلے نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے صرف اتنا یاد آیا کہ اس سے پہلے وہ کسی ملبے کے پہاڑ تلے دبی ایک چارپائی کے بازو کے ساتھ بندھے ہوئے جھولے میں لیٹا ہوا تھا اور اسے اپنے اوپر کدالیں اور بیلچے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وہی آوازیں اسے اب کی بار بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس بار کدالیں اور بیلچے چلنے کی یہ آوازیں اسے مٹی تلے دفن کرنے کے لیے بلند ہو رہی تھیں۔

وہ ایک مرتبہ پھر اندھیرے کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔

(۵)

وہ جب روشنی میں آیا تو اس نے اپنے آپ کو کسی پہاڑ کے دامن میں واقع ایک میدان میں کھڑا پایا۔ وہ میدان کے آخری سرے پر اُس جگہ کھڑا تھا، جہاں سے، میدان کے پہاڑ والے سرے سے پھوٹنے والے چشمے کا پانی ایک آبشار کی صورت نیچے گر رہا تھا۔ چشمہ عین اس جگہ سے اُبل رہا تھا جہاں سے میدان ختم ہو کر زمین بلند ہونا شروع ہوتی تھی۔

میدان کے نشیبی سرے پر ___ جہاں سے پانی ایک آبشار کی صورت میں نیچے گر رہا تھا ___ اگر پانی کے بہاؤ کی طرف پشت اور پہاڑ کی طرف سینہ کر کے کھڑا ہوا جائے تو پہاڑ کے دامن میں واقع گھنے جنگل میں تین بڑی بڑی چٹانیں انتہائی نمایاں تھیں، جو خاصی ابھری ہوئی تھیں۔ دو چٹانیں متوازی تھیں اور ان کے درمیان تقریباً پچاس گز کا فاصلہ تھا۔ جب کہ تیسری چٹان ان دونوں کے عین درمیان نگران سے کم بلندی پر واقع تھی۔ کم بلندی پر واقع اس درمیانی چٹان سے اوپر واقع ہر دو چٹان کا فاصلہ بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ ان دونوں کا؛ آپس کا درمیانی فاصلہ۔

''میں یہاں کب اور کیسے آیا؟'' اس نے دماغ پر زور ڈالا۔ کافی دیر سوچنے کے بعد اسے صرف اتنا یاد آ سکا کہ وہ دھرماراجیکا کے پہلو میں بہنے والی ندی کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دریائے ہرو میں اترا تھا، پھر کئی گھنٹے دریا کے بہاؤ کی الٹی سمت چلنے کے بعد، دوتارو کے مقام سے ___ جہاں دو دریا آپس میں ملتے تھے ___ اس کے گھوڑے کا رخ اُس ندی کی طرف موڑ دیا گیا تھا، جس کا سرچشمہ یہ چشمہ ہے۔

''آقا چلیں۔'' اسے کسی کی آواز سنائی دی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کا ایک شناسا باادب کھڑا تھا۔

''حضور! فرمانِ مقدس کا معائنہ کرنے کے لیے خاصا وقت درکار ہوگا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اب چلا جائے تا کہ حضور اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے فرمانِ مقدس کا معائنہ کر پائیں۔'' ان میں سے ایک آدمی نے سر جھکا کر ادب سے کہا۔

’’چلیں۔‘‘اس نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔اس نے اپنے اس کہے ہوئے لفظ پر غور کیا تو اسے لگا جیسے اس نے اسے حکم دیا ہے۔وہ گھنے جنگل میں راستے بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے چلنے والا آدمی،اس کے احترام میں اس کے قدموں کے نشانوں سے بچ کر چلنے کی کوشش کر رہا ہے۔قریباً ڈھائی سوقدم چڑھائی چڑھنے کے بعد اس نے دیکھا کہ وہ اور اس کا ساتھی ایک بڑی گزرگاہ میں داخل ہو گئے ہیں۔پہاڑ کے دامن میں واقع ہونے کے باوجود یہ گزرگاہ بالکل ہموار ہے ،جو وادی کو اوپر نیچے دو حصوں میں تقسیم کر رہی ہے۔وہ اس گزرگاہ پر تھوڑا ہی آگے بڑھے تھے کہ درمیانی چٹان کے قریب پہنچ گئے جو گزرگاہ سے تقریباً تیس قدم کے فاصلے پر بلندی کی طرف تھی۔انھوں نے گزرگاہ کو چھوڑ کر اپنا رخ چٹان کی طرف کر لیا اور چڑھائی چڑھنے لگے۔

جب وہ وہاں پہنچے تو دو درجن کے قریب لوگ ان کے منتظر تھے۔جن میں سے کچھ تو ان پڑھ مزدور لگ رہے تھے اور کچھ پڑھے لکھے ہنر مند۔ہنر مندوں کے ہاتھ میں چھینیاں اور ہتھوڑے تھے۔چٹان کے ساتھ لکڑی کی دو بڑی بڑی سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔جن پر ایک ایک آدمی اپنے ہاتھوں میں چھینی اور ہتھوڑا لیے چٹان پر جلی حروف میں کچھ کندہ کر رہا تھا۔جوں ہی وہ اور اس کے ساتھی وہاں پہنچے۔وہ دونوں بھی نیچے اتر آئے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ باادب کھڑے ہو گئے۔

’’حضور!‘‘۔

ایک آدمی نے ،جو شکل وصورت سے انتہائی مہذب اور پڑھا لکھا لگ رہا،چمڑے کا ایک رول اس کی طرف بڑھاتے ہوئے،اسے متوجہ کیا۔

اس نے چمڑے کا رول کھولا۔بھورے رنگ کے چمڑے پر سیاہ رنگ کی روشنائی میں لکھی ہوئی عبارت اس کی نظروں کو خیرہ کرنے لگی:

’’ساتواں فرمانِ مقدس‘‘ کی جلی سرخی تلے درج تھا:

’’یہ مقدس فرمان مہاراجہ اشوک کے حکم سے جاری کیا گیا ہے۔

مہاراجہ کی خواہش ہے کہ ہر جگہ ہر طبقے کے لوگ اطاعت گزار رہیں۔کیوں کہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ اپنے حواس پر قابو رکھے اور اس کا ذہن پاک صاف رہے۔البتہ مردوں کو اپنی خواہشات اور پسند پر قابو نہیں رہتا۔

کچھ لوگ احکامات پر پورا پورا عمل کریں گے اور کچھ جزوی طور پر۔حتیٰ کہ کسی ایسے شخص کے نزدیک بھی،جو مکمل آزادہ روی کا قائل ہے،حواس پر قابو رکھنا،ذہن کی پاکیزگی،احسان مندی اور

وفاداری ہمیشہ قابلِ تعریف رہی ہیں۔''☆

اس نے چمڑے کے رول سے نظریں ہٹائیں، کچھ پیچھے کو ہٹا اور پھر اس نے اپنی نظریں چٹان پر مرکوز کرلیں۔ چٹان پر لکھی ہوئی عبارت مکمل طور پر چمڑے پر لکھی ہوئی عبارت سے مماثل تھی۔ صرف عنوان: ساتواں فرمانِ مقدس، کی جگہ چٹان پر ابھی صرف ''ساتواں فرمان'' کے لفظ کندہ ہو پائے تھے اور ''مقدس'' کا لفظ کندہ کیا جانا تھا۔

اس نے چٹان پر کندہ یہ فرمانِ مقدس ایک مرتبہ پھر پڑھا۔ پھر اس نے نیچے ٹیکسا شلہ کو جانے والی بڑی گزرگاہ پر واقع کاہو کے ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھ کر پوری عبارت دوبارہ پڑھی؛ یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا اس فرمان کی لکھائی واضح ہے یا نہیں اور یہ کہ اس درخت کے نیچے ستانے والے؛ اسے آسانی سے پڑھ سکیں گے یا نہیں۔ اس نے دیکھا کہ چٹان پر کندہ عبارت کا آخری جملہ: '' حواس پر قابو رکھنا، ذہن کی پاکیزگی، احسان مندی اور وفاداری ہمیشہ قابلِ تعریف رہے ہیں۔'' چٹان کے نیچے واقع ایک پتھر اور اس کے اردگرد اگی ہوئی جھاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا ہے۔

''یہاں بیٹھ کر ستانے والا شخص اگر چٹان پر کندہ عبارت کو پڑھنا چاہے گا، تو آخری جملہ اسے کھڑے ہو کر پڑھنا پڑے گا۔''

یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنے اردگرد کھڑے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً اس پتھر کو اکھاڑیں۔ اگلے ہی لمحے اس کے حکم کی تعمیل شروع ہوگئی اور وہ خود اسی کاہو کے درخت تلے بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ دو آدمی ہاتھ میں ہتھوڑے اور چھینیاں لیے چٹان کے ساتھ لگی سیڑھیوں پر دوبارہ چڑھ گئے اور مقدس فرمان کا ادھورا عنوان مکمل کرنے لگے۔ چھینیوں پر ہتھوڑوں کی ضربیں پڑنے لگیں اور چٹان کے سینے پر حروف ابھرنے لگے۔ اس نے ایک پتھر سے ٹیک لگا کر اپنی نظریں مقدس فرمان کے اس جملے پر مرتکز کیں:

''ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ اپنے حواس پر قابو رکھے اور اس کا ذہن پاک صاف رہے۔''

''کیا میرے حواس میرے قابو میں ہیں؟ اور میرا ذہن پاک صاف ہے؟'' اس نے سوچا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اپنے وجود کے بارے میں سوچنے لگا اور اس کے ذہن میں مختلف خیالات گڈمڈ ہونے لگے۔

☆مانسہرہ کے قریب چٹان پر کندہ عبارت کا ترجمہ۔ بحوالہ ہزارہ گزیٹئر

’’میں کون ہوں؟اور یہاں کیوں آیا ہوں؟۔‘‘

’’کل مجھے ہر حال میں دھرماراجیکا پہنچ کر مہاراجہ اشوک کو فرمانِ مقدس کی رپورٹ پیش کرنی ہے۔پرسوں انھیں کوچ کرنا ہے۔‘‘

ٹھک۔ٹھک۔ٹھک ٹھکا ٹھک۔ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھک۔ٹھیاں۔(چھلیوں پر ہتھوڑے اور چٹان سے چھلیوں کے ٹکرانے کی آوازیں)

’’یہ لوگ کون ہیں؟اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟‘‘

’’جب میں مہاراجہ حضور کو یہ خوشخبری سناؤں گا کہ ساتواں فرمانِ مقدس بھی چٹانوں پر کندہ کرایا جاچکا ہے تو وہ کتنے خوش ہوں گے؟‘‘

’’مجھے کچھ کیوں نہیں یاد آرہا؟مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں ازل سے اندھیرے میں محوِ سفر ہوں۔کبھی کبھی کہیں روشنی میں پڑاؤ کرتا ہوں لیکن اس پڑاؤ کا دورانیہ ہر بار مختلف ہوتا ہے۔‘‘

’’اگر مہاتما بدھ کی پھیلائی ہوئی روشنی ہم تک نہ پہنچتی تو مہاراجہ حضور ملکِ کالنگاس کی طرح دوسرے ملکوں میں بھی لاکھوں لوگوں کو قتل کروارہے ہوتے اور میں آج بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ بے گناہ لوگوں کے گھروں پر شب خون ماررہا ہوتا۔‘‘

ٹھک۔ٹھک۔ٹھک ٹھکا ٹھک۔ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھک۔ٹھیاں۔

’’یہ لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔لیکن میں خود کو کیوں نہیں پہچان پارہا؟۔‘‘

’’مہاتما کی تعلیمات نے مجھے اپنی ذات کا عرفان بخشا۔اگر وہ نہ ہوتے تو میں آج بھی ذات کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہوتا۔‘‘

ٹھک۔ٹھک۔ٹھک ٹھکا ٹھک۔ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھک۔ٹھیاں۔

’’کیا کبھی اندھیرے کا یہ سفر ختم ہوگا؟۔کیا میں کبھی اپنے آپ کو پہچان پاؤں گا؟‘‘

’’نروان ہی سب کی منزل ہے۔ہاں نروان ہی میری منزل ہے۔‘

ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھک۔ٹھیاں۔

’’کیا کبھی اندھیرے کا یہ سفر ختم ہوگا۔؟نروان ہی میری منزل ہے۔‘‘

’’اندھیرا۔ٹھک۔ٹھک۔سفر۔نروان۔منزل۔‘‘

’’اندھیرا۔ٹھک۔نروان۔ٹھک۔اندھیرا۔ٹھک۔نروان۔‘‘

ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا ٹھکا۔۔۔۔۔

اسے لگا جیسے اس کی کھوپڑی میں ہر طرف لوہے کی چھتیاں نصب کر دی گئی ہیں جن پر مسلسل ہتھوڑے برس رہے ہیں جو اس کے دماغ میں موجود، اندھیرے میں سفر کی ہر یاد کو کھرچ رہے ہیں۔
پھر اسے لگا جیسے ایک پتلی دوشاخہ چھڑی اس کے ناک کے رستے اندر گھسیڑی جا رہی ہے۔ جس کی ایک نوک کا رخ اس کے دماغ کی طرف جب کہ دوسری کا رخ اس کے دل کی طرف ہے۔
دل کی طرف جانے والی نوک اس کے گلے میں پھنس گئی ہے اور اسے سانس لینے میں شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔
اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور شدتِ درد سے ایڑیاں رگڑنے لگا۔

(۶)

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک اجنبی کمرے میں، بستر پر پڑا ہوا، پایا۔ یہاں ہر چیز اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ اس اجنبی ماحول میں، وہ کچھ گھبرا سا گیا۔ جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا، اس نے ہمیشہ جانے پہچانے رستوں پر سفر کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ جہاں کہیں بھی جاتا، اس کا سامنا، جانے پہچانے راستوں، مانوس منظروں اور شناسا چہروں سے ہوتا۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔ آنکھ کھلتے ہی جس چیز پر سب سے پہلے اس کی نظر پڑی، وہ ایک سفید چھت تھی۔ اس نے اپنی نظروں کو تھوڑا سا جھکایا تو اسے ایک دیوار نظر آئی۔ اس سفید دیوار میں جو چیز سب سے نمایاں تھی وہ لکڑی کے دو دروازے تھے۔ دائیں طرف والا دروزہ بڑا اور دو پٹوں والا جب کہ بائیں طرف والا چھوٹا اور ایک پٹ والا تھا۔ دونوں دروازے بند تھے۔ اس نے دونوں دروازوں کو غور سے دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا کہ بڑے دروازے کے پٹ، اندر کی طرف، جب کہ چھوٹے کے، باہر کی طرف کھلتے ہیں۔ اس نے اپنے دائیں، بائیں دیکھا دونوں طرف سفید دیواریں تھی۔ جن پر انسانی ڈھانچوں کی عجیب وغریب تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔

دائیں طرف دیوار کے ساتھ تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جب کہ بائیں طرف لوہے کا ایک سونٹا ایستادہ تھا۔ جس کے ساتھ ایک تھیلی سی الٹی لٹک رہی تھی۔ جس میں سے ایک باریک سی رسی نما چیز نیچے کو لٹک رہی تھی۔ اس نے رسی کے ساتھ ساتھ اپنی نظروں کو نیچے کی طرف گھمایا تو اس نے دیکھا کہ وہ رسی نیچے سے ایک سانپ کی طرح بل کھا کر اس کے بستر کی طرف مڑ رہی ہے اور اس کا سرا اس کے بائیں بازو میں گھسا ہوا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اسی سے ملتی جلتی ایک اور رسی اس کے سینے پر پڑی ہوئی ہے جس کا سرا اس کے نتھنوں میں ہے۔ پھر اس نے اس سانپ نما رسی کو اپنے حلق کے اندر محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے وہ سانپ نما رسی اس کے سارے وجود میں پھیلی ہوئی ہے۔

اس نے اپنے دماغ پر زور ڈال کر اس نئی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے ایسا خوفناک منظر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مارے خوف کے اس کا سارا

وجود کانپ سا گیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ ازل سے اندھیرے میں محوِ سفر ہے، کہیں کہیں وہ روشنی میں پڑاؤ کرتا ہے اور اس روشنی میں ہر بار اس کا سامنا جانے پہچانے منظروں اور لوگوں سے ہوتا ہے۔ یہاں چہرہ تو کوئی موجود ہی نہیں تھا لیکن اب تک جو کچھ اس نے دیکھا تھا وہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔

وہ انھی سوچوں میں گم تھا کہ اسے چھوٹے دروازے کے پیچھے پانی کے گرنے کی آواز آئی۔ اسے لگا جیسے پانی کسی برتن میں تیزی سے گر رہا۔ اگلے ہی لمحے اسے چھپاک چھپاک کی آواز سنائی دی جیسے کوئی پرنالے کے نیچے ہاتھ دھو رہا ہو۔ پھر پانی گرنے کی آواز بند ہو گئی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی، اس نے دیکھا کہ ایک پٹ والا دروازہ باہر کی جانب کھل گیا ہے۔ جوں ہی دروازہ کھلا، ایک آدمی جو خاصا جوان لگ رہا تھا، دروازے سے نمودار ہوا۔ دروازے کے باہر کی طرف بھی روشنی تھی۔ پھر ایک ٹک کی آواز کے ساتھ وہ روشنی بجھ گئی اور دروازے کے پیچھے اندھیرا پھیل گیا۔

اس سے قبل کہ اس اجنبی کی آنکھیں اس سے چار ہوتیں، اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے کان اس کے قدموں کی آہٹ پر دھر لیے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آدمی آہستہ آہستہ اس کے قریب آ رہا ہے۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ وہ آدمی اس کے بستر کے قریب آ کر رک گیا ہے اور اس کے قدموں کی چاپ کمرے کی خاموشی میں گم ہو گئی ہے۔

یک دم اسے اپنے ہاتھ پر کسی کی انگلیوں کا لمس محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے کوئی اس کی نبض ٹٹول رہا ہے۔ پھر وہی لمس اسے اپنے ماتھے پر محسوس ہوا۔ اس نے اپنے پپوٹوں کو ہلکی سی جنبش دی۔ اسے لگا جیسے وہ شخص اس کے پپوٹوں کو بغور دیکھ رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر فوراً اپنی آنکھیں کھول دیں۔ جوں ہی اس نے آنکھیں کھولیں اس نے دیکھا کہ وہ شخص اسے دیکھ رہا ہے۔ پھر اس آدمی نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو یوں مسلا، جیسے اسے، اس دیکھے ہوئے منظر پر یقین نہ آ رہا ہو۔ وہ کچھ دیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر فوراً دو پٹوں والے دروازے کی طرف بھاگا۔ دروازے کے پٹ کھول کر اس نے ایک مرتبہ پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔ پھر دروازے کا پچھلا پٹ آہستہ آہستہ باہر کی طرف سرکنے لگا، اور کچھ ہی دیر میں مکمل طور پر بند ہو گیا۔

''میں یہاں کیسے پہنچا؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ یہ اجنبی کون تھا؟۔'' اس کے ذہن میں تینوں سوال ایک ساتھ ابھرے۔

کافی دیر سوچنے کے بعد اسے یاد آیا کہ وہ مہاراجہ اشوک کے حکم پر فرمانِ مقدس کے معائنے

کے لیے نکلا تھا۔اس کے ساتھ اس کا ایک ماتحت بھی تھا۔اس نے ایک بڑے پہاڑ کے دامن میں واقع تین بڑی چٹانوں میں سے نچلی چٹان پر کندہ کیے جانے والے ساتویں فرمانِ مقدس کا معائنہ کرنے کے بعد وہاں موجود لوگوں کو چٹان کے نیچے واقع ایک پتھر ہٹانے کا حکم دیا تھا، جو فرمانِ مقدس کے آخری جملے کو چھپائے ہوئے تھا اور یہ کہ اس نے یہ حکم ٹیکسا شلہ کو جانے والی بڑی گزرگاہ پر واقع کاہو کے ایک بڑے درخت کے نیچے بیٹھ کر دیا تھا۔اس کے بعد وہ کہاں گیا تھا؟ اسے کچھ یاد نہیں تھا۔

جب اس نے اپنے دماغ پر مزید زور ڈالا تو اسے کئی منظر آپس میں گڈمڈ ہوتے دکھائی دیے جن میں سے ایک منظر کسی شناسا پہاڑی علاقے کا تھا۔اندھیرے میں اسے اپنے پیچھے پیچھے چلتا ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔وہ کافی دیر تک اس منظر کو پوری طرح یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"میں بہت جلد نور آباد میں آپ کے دولت کدے پر حاضری دوں گا۔" اس کے ذہن میں کسی جانی پہچانی آواز میں یہ جملہ گونجا۔اس گونج کے دوران میں ہی اسے وہ پورا منظر یاد آ گیا۔وہ ایک بڑے کمرے میں دو آدمیوں کے ساتھ کھانا کھا کر باہر نکلا تھا کہ اسے اپنے پیچھے کسی کے چلنے کی آہٹ سنائی دی تھی۔اس نے جب پیچھے مڑ کر دیکھا تھا تو وہ انھی دو میں سے ایک تھا۔اس کو دیکھتے ہی اسے خیال آیا تھا کہ وہ اس آدمی سے نور آباد کا پتا پوچھ کر وہاں پہنچ جائے گا۔لیکن ابھی وہ اس سے پوچھنے ہی والا تھا کہ اس نے خود کو ہوا میں تیرتا ہوا محسوس کیا تھا۔اس کے بعد کا منظر کوشش کے باوجود اسے یاد نہ آ سکا۔

"مجھے کسی نہ کسی طرح نور آباد پہنچنا ہوگا۔ورنہ میں یوں ہی بھٹکتا رہوں گا۔" اس نے سوچا۔

اتنے میں اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اس نے دیکھا کہ تین آدمی یکےبعد دیگرے کمرے میں داخل ہوئے۔وہ تینوں اجنبی تھے۔ان میں سے ایک تو وہی شخص تھا، جو تھوڑی دیر پہلے یہاں سے گیا تھا۔جب کہ باقی دونوں نئے تھے۔ان تینوں کے چہرے پر خوشی کے آثار بہت نمایاں تھے۔نئے داخل ہونے والے دونوں اشخاص، پہلے آدمی سے عمر میں خاصے بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ان میں سے ایک کا لباس پہلے آدمی سے ملتا جلتا جب کہ دوسرے کا سراسر مختلف تھا۔مختلف لباس والے آدمی کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، اور کچھ کمزور دکھائی دے رہا تھا۔اس کے ہاتھ میں ایک سونٹا تھا۔یوں لگتا تھا وہ اس کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔جوں ہی وہ اس کے بستر کے قریب پہنچے۔سونٹے والے شخص نے اپنا سونٹا پرے پھینکا اور اس کے بستر پر جھک کر اس سے لپٹ گیا۔

"میرے بچے۔مجھے یقین تھا خدا میری دعاؤں کو رائگاں نہیں جانے دے گا۔" اس نے اس اجنبی کی آواز میں ایک عجیب طرح کا کرب محسوس کیا، ایک ایسا کرب، جس میں طرب کا ذائقہ بھی

تھا۔ وہ دیر تک اس سے لپٹ کر روتا رہا۔

پھر پاس کھڑے دوسرے دونوں اجنبیوں نے اس شخص کو اس سے زبردستی علاحدہ کیا، اسے سہارا دے کر دائیں طرف رکھی ہوئی تین کرسیوں میں سے درمیانی کرسی پر بٹھایا اور فرش پر پڑا اس کا سوٹا اٹھا کر اسے پکڑا دیا۔ جب وہ دونوں اسے کرسی پر بٹھا کر پیچھے ہٹے تو اس نے دیکھا کہ اس اجنبی کی آنکھوں میں ایک طلسمی چمک ہے، جیسے وہ کوئی ایسا منظر دیکھ رہا ہو، جسے دیکھنے کا وہ ایک عرصے سے تمنائی ہو۔ وہ اجنبی آگے کو جھکا ہوا، اپنے ایستادہ سونٹے پر دونوں ہاتھ جمائے، کمر سے اوپر کا سارا بوجھ اس پر ڈالے، اسے مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔

''یہ لوگ کون ہیں اور انھوں نے مجھے اس کمرے میں کیوں بند کر رکھا ہے؟۔ مجھے تو مہاراجہ حضور کے ہاں جا کر فرمانِ مقدس کی تکمیل کی رپورٹ پیش کرنا تھی۔ میں ان لوگوں کے درمیان کیسے پھنس گیا۔'' اس نے بند دروازوں پر اپنی نظریں جماتے ہوئے سوچا۔

اگلے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ اسے تو نور آباد جانا تھا۔

''نور آباد کہاں ہے؟'' اس نے سونٹے والے اجنبی کو دیکھتے ہوئے خیالوں ہی خیالوں میں اپنے آپ سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب! زمان مجھے پہچان کیوں نہیں رہا۔ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہا۔'' سونٹے والے شخص نے دوسرے دو میں سے ایک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسے اس کی آواز میں بے تابی لہریے لیتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''سردار صاحب۔ آج بائیس دنوں بعد انھیں ہوش آیا ہے۔ ابھی ان کے دماغ پر خواب ناکی کی کیفیت طاری ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کیفیت سے باہر نکلیں گے۔ آپ اطمینان رکھیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

اس نے زمان کے لفظ پر کچھ دیر سوچا۔ مگر اس کے ذہن میں اس نام کی مناسبت سے کوئی شکل نہیں ابھری۔

''یہ لوگ کس کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں؟ کہیں میرے بارے میں تو نہیں؟ ضرور انھیں میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو موقع ملتے ہی یہاں سے بھاگ نکلوں گا اور نور آباد کو تلاش کروں گا۔ وہاں ضرور کوئی نہ کوئی میرا جاننے والا موجود ہوگا، جس سے میری شناخت کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' اس نے سوچا۔

اتنے میں ایک جواں سال شخص کمرے میں داخل ہوااور سیدھا آ کر اس سے لپٹ گیا۔وہ کافی دیر اس سے لپٹ کر روتا رہا۔پھر وہ سونے والے شخص کی طرف بڑھا جس نے اسے گلے لگا کر شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

''بیٹا خدا نے میری دعائیں سن لی ہیں۔تیرے بھائی کو ہوش آ گیا۔''اس کے لہجے میں خوشی کی کھنک تھی مگر شدتِ جذبات سے اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔دونوں کافی دیر جذبات سے چھلکتی ہوئی آنکھوں سے کبھی ایک دوسرے کو اور کبھی اس کی طرف دیکھتے رہے۔

''ان لوگوں کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔میرا تو کوئی بھائی نہیں تھا۔میں تو نور آباد کی تلاش میں نکلا ہوا،اندھیرے کا مسافر ہوں۔''یہ سوچتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنے اردگرد کا بغور جائزہ لیا۔

''۔۔۔لیکن اس بار میں کسی اجنبی جگہ پر آ گیا ہوں۔یہاں تو میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں۔''اس نے ان چاروں کے چہرے پر باری باری نظر دوڑاتے ہوئے سوچا۔

سفید لباس میں ملبوس دو اشخاص میں سے ایک،اس کے پاؤں کی طرف رکھے ہوئے کاغذات کو الٹ پلٹ رہا تھا۔جب کہ دوسرا اس کی نبض تھامے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

انھیں دیکھتے ہوئے اس کی یادداشت میں ایک اور منظر ابھرا۔اسے یاد آیا کہ جب جنگل میں اس نے آبشار پر ایک خوبصورت لڑکی دیکھی تھی اور ایک آدمی اسے اپنے گھوڑے پر آگے بٹھا کر اسے دریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے راستے پر کہیں لے جا رہا تھا تو اسے ایسے ہی کسی کمرے میں بستر پر لٹایا گیا تھا۔جہاں ایسے ہی لباس میں ملبوس کچھ لوگ اس کے گرد جمع تھے۔

یہ سوچتے ہوئے اس نے ایک بار پھر کمرے اور ان لوگوں کے چہروں پر نظر ڈالی اور انھیں پہچاننے کی کوشش کی۔لیکن اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ نہ تو ان میں سے کوئی چہرہ اس کا شناسا ہے اور نہ ہی یہ جگہ۔

''مجھے فوراً ان کی غلط فہمی دور کر دینی چاہیے اور انھیں بتا دینا چاہیے کہ مجھے دھرما راجیکا جا کر مہاراجہ کو فرمانِ مقدس کے بارے میں بتانا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔پھر مجھے سید احمد بریلوی صاحب سے ملنے جانا ہے اور انھیں قبیلے کے سربراہ کا پیغام پہنچانا ہے کہ اگر آپ سکھوں کے خلاف جہاد کریں تو ہمارا پورا قبیلہ آپ کا ساتھ دے گا۔

۔۔۔۔اور ہاں میں نے تو ٹیکسا شلہ کی پہاڑیوں میں در در گھوم کر بھیک مانگنے والے

آنند سادھو کے پاس بھی جاتا ہے:

''پیدائش سے جسم وجود پاتا ہے۔

جسم سے ذہن جنم لیتا ہے

ذہن سے شعور جنم لیتا ہے۔

شعور سے حواس جنم لیتے ہیں۔

حواس سے اشیا کا ادراک جنم لیتا ہے۔

اشیا کے ادراک سے وابستگی جنم لیتی ہے۔

وابستگی سے خواہش جنم لیتی ہے۔

خواہش سے دکھ جنم لیتا ہے

لہٰذا تمام انسان دکھ میں مبتلا ہیں۔''

اس کے ذہن میں آنند کے الفاظ گونجے۔ اسے لگا جیسے وہ اس وقت مراقبے میں ہے:

''جنم چکر کے خاتمے سے جسم تحلیل ہوتا ہے۔

جسم کی تحلیل سے ذہن کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ذہن کے خاتمے سے شعور ختم ہوتا ہے۔

شعور کے خاتمے سے حواس ختم ہوتے ہیں۔

حواس کے خاتمے سے چیزوں کا ادراک ختم ہوتا ہے۔

ادراک کے خاتمے سے وابستگی ختم ہوتی ہے۔

وابستگی کے خاتمے سے خواہش ختم ہوتی ہے۔

خواہش کے خاتمے سے دکھ سے نجات ملتی ہے۔''

وہ کافی دیر ان الفاظ پر غور کرتا رہا۔ اسے لگا جیسے اس کے تمام دکھ ختم ہو گئے ہیں۔

''دکھ کے خاتمے سے پانچوں حواس، چھٹی حس میں جمع ہو جاتے ہیں جس سے تیسری آنکھ جنم لیتی ہے۔

تیسری آنکھ سے، میں وہ سب کچھ دیکھ سکتا ہوں جو مایا جال سے ادھر ہے۔''

وہ ان الفاظ پر ٹھٹھکا:

''کیا آنند نے مجھے تیسری آنکھ کے بارے میں بھی بتایا تھا؟''

وہ کافی دیر اس بارے میں سوچتا اور اس کی معنویت پر غور کرتا رہا۔

''شاید مہاتما نے ایسا ہی کہا ہو۔ لیکن آنند نے مجھے اس بارے میں کچھ نہ بتایا ہو۔'' اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔

''نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آنند جو فلسفہ، نجوم، تقویم، ریاضی، اتہاس، قانون، جغرافیہ، سیاست، طب، فلکیات، حتیٰ کہ فنِ حرب، عطر کشی، شراب کشی، سنگ تراشی، سکہ سازی اور گھڑ سواری جیسے متنوع علوم و فنون کا استاد مانا جاتا ہے اور ایک عرصے تک ٹیکسا شلہ یونیورسٹی میں، ان میں سے بیشتر علوم کی باقاعدہ تعلیم بھی دیتا رہا ہے، وہ اس چیز کے بارے میں نہ جانتا ہو جو میرے علم میں آ چکی ہے۔'' وہ اپنی بدگمانی پر شرمندہ سا ہونے لگا۔

''ہے بدھا، ہے دھرما، ہے سنگھا۔'' اس کی آنکھوں میں آنند سادھو کا چہرہ لہرایا، جو لال رنگ کی چادر میں لپٹا، دھرما راجیکا میں موجود مہاراجا اشوک کے محل کے پچھواڑے واقع اسٹوپ کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ اس کے کاندھے سے ایک چرمی تھیلا لٹک رہا تھا جس پر ''غاؤسہ فروس'' کے الفاظ درج تھے۔ وہ نہ صرف ''ہے بدھا، ہے دھرما، ہے سنگھا'' کی مالا جپے جا رہا تھا بل کہ ''اوم مانی پدمی اوم'' کا راگ بھی الاپ رہا تھا۔ یوں اس کی ذات میں ہنایان اور مہایان دونوں فرقے جمع ہو گئے تھے۔ حالاں کہ ہنایان، مہایان کو بدعتی؛ جب کہ مہایان، ہنایان کو قدامت پرست قرار دیتے تھے۔ لیکن وہ ان کے اختلافات کو معمولی گردانتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ بنیادی مقصد سچ کی تلاش ہے، جہاں سے بھی ملے اور جیسے بھی ملے۔ صرف یوگ اور پوجا پاٹ ہی کو نہیں وہ دنیا کے تمام علوم کو سچ کی تلاش کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

''یہ تمام علوم اپنی اصل میں ایک ہیں۔ ان سب کا مقصد سچ کی تلاش ہے۔ اپنے اپنے سچ کی تلاش۔ سچ کی مثال ایک ہاتھی کی سی ہے جب کہ ہماری اندھوں کی سی۔ ہمارا ہاتھ اس ہاتھی کے جس حصے پر پڑ جاتا ہے ہم اسی کو پورا سچ سمجھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ ہمیں اس کے صرف ایک حصے کا علم ہوتا ہے، دوسرے حصے تک ہمارا ہاتھ پہنچ ہی نہیں پاتا۔'' اسے آنند کے الفاظ یاد آئے۔ اسے لگا جیسے وہ اس کے سامنے بیٹھا، اپنے تھیلے سے پوتھی نکال رہا ہے۔ اس کی پوٹلی میں ان تمام علوم کی پوتھیاں ہر وقت موجود رہتیں۔ یہ بھاری پوٹلی نہ صرف شکھشائیں دیتے وقت اس کے ساتھ موجود رہتی، بل کہ اسٹوپے کا چکر کاٹتے ہوئے بھی اس کی بغل میں ہوتی۔

بہت سے معاملات میں وہ تانتریوں سے اختلاف رکھتا تھا۔ خاص کر وقت کے حوالے سے اس کا ایک جداگانہ نظریہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وقت چیزوں پر سے نہیں گزرتا بل کہ چیزیں وقت میں سے

گزرتی ہیں۔تانتریوں سے بحث کرتے ہوئے وہ اپنے چرمی تھیلے سے پوتھی نکالتا اور اس پر ہاتھ مار کر کہتا:''وقت اس پوتھی کے اوپر سے نہیں گزر رہا جیسے ندی کی تہہ میں پڑے ہوئے پتھر پر سے پانی گزرتا ہے بلکہ یہ پوتھی بذاتِ خود وقت میں سے گزر رہی ہے۔''

''یعنی تمھارے خیال میں دریائے ہر وٹھہرا ہوا ہے اور اس کی تہہ میں موجود پتھر اور مٹی سفر میں ہیں۔''تانتری اس کا مذاق اڑاتے۔

''ہاں۔چلو یوں ہی سمجھ لو۔''وہ انتہائی سنجیدگی سے کہتا۔''یہ الگ بات ہے کہ تمھارا ذہن اس کا تصور کرنے سے قاصر ہے کیوں کہ تم اس کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔''

پھر وہ پوتھی کو زمین پر رکھتا اور اپنی سوٹی سے اس کے دونوں طرف دو لکیریں کھینچتا۔'فرض کرو یہ ماضی ہے،یہ مستقبل اور یہ پوتھی لمحہ موجود۔''

....................O....................

وہ اپنی سوٹی کی نوک پہلے باری باری دونوں لکیروں پر اور پھر پوتھی پر رکھتے ہوئے کہتا۔''یہ پوتھی صرف مستقبل کی طرف نہیں ماضی کی طرف بھی اسی رفتار سے سفر کر رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ ہمیشہ لمحہ موجود میں دکھائی دیتی ہے اور وقت ہمیں ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے۔اگر تم خود کو وقت میں سے گزرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہو تو آتم تیاگ دو۔''پھر ایک دن اس نے اپنے کہے پر عمل کرتے ہوئے آتم تیاگ دیا اور اپنا سچ پالیا۔اسی دن سے نہ صرف اس نے تانتریوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی بلکہ یونیورسٹی کو بھی خیر آباد کہہ دیا۔اب وہ نیکسا شملہ کی پہاڑیوں میں موجود بستیوں میں در در بھیک مانگتا پھرتا ہے۔صرف برسات کے دنوں میں وہ واپس دھرمارا جیکا آتا ہے کہ ان دنوں زمین سے کیڑے مکوڑے نکل آتے ہیں اور اسے ہر پل ان کے کچلے جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔پوٹلی اب بھی اس کی بغل میں دابی ہوتی ہے لیکن اب اس میں پوتھیوں کے بجائے خیرات پڑی ہوتی ہے۔

''مجھے پورا وشواس ہے کہ تیسری آنکھ کے بارے میں بھی اسی آتم تیاگی نے بتایا ہوگا۔''وہ انھی سوچوں میں گم تھا کہ اسے کسی کی آواز سنائی دی۔

''فرمان بیٹا!نور آباد میں اکبر خان کو فون کر کے بتا دو کہ زمان کو ہوش آ گیا ہے۔''جوں ہی یہ جملہ اس کے کانوں سے ٹکرایا۔وہ خوشی سے بڑبڑایا:

''نور آباد۔ہاں مجھے بھی نور آباد جانا ہے۔۔۔۔۔۔''

اس کی بڑبڑاہٹ پر وہ چاروں چونکے اور ان کے چہرے پر مسکراہٹیں بکھرنے لگیں۔

''ہاں ۔ہاں ۔بیٹا نورآباد جائیں گے۔'' سونٹے والا اجنبی اپنی کرسی سے اٹھ کراس کی طرف بڑھتے ہوئے ،گویا ہوا۔

''اس کا مطلب ہے ۔یہ لوگ جانتے ہیں نورآباد کہاں ہے؟'' اس نے سوچا۔ ''مجھے اپنے ارادے سے باز رہنا چاہیے۔اگر میں نے انھیں بتادیا کہ میں آنند کو ڈھونڈنے نیکسا شلہ کی پہاڑیوں میں جاؤں گا تو یہ مجھے نورآباد کا پتہ نہیں بتائیں گے۔جب تک یہ لوگ مجھے نورآباد نہیں لے کر جاتے ۔میں انھیں اپنے اورآنند کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔'' اس نے نیکسا شلہ کی پہاڑیوں میں جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے سوچا۔

چھٹا باب

ہیں خواب میں ہنوز

(۱)

''سردار صاحب! اب آپ اسے گھر لے جا سکتے ہیں۔تمام رپورٹس ٹھیک ہیں۔خدا نے چاہا تو کچھ دنوں میں یہ مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے گا۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب یہ بات چیت کیوں نہیں کر رہا۔حالاں کہ پرسوں ہوش میں آنے کے بعد اس نے ایک آدھ جملہ بولا بھی تھا۔لیکن اس کے بعد ابھی تک خاموش ہے۔''

''آہستہ آہستہ بولنا بھی شروع کر دے گا۔آپ فکر نہ کریں۔میں نے دوائیں لکھ دی ہیں۔دوا اسے وقت پر دینی ہے۔''

''ہاں یہ دھیان بھی رکھیے گا کہ اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہو''سفید لباس والا شخص اور سونٹے والا بزرگ آپس میں محو گفتگو تھے۔

''میرا مشورہ ہے کہ آپ اسے نور آباد ہی لے جائیں۔ایک تو وہاں کی آب و ہوا اچھی ہے ،دوسرا اس نے اپنی زندگی کا ایک انتہائی اہم حصہ وہیں گزارا ہے۔وہاں اس کا دل لگا رہے گا اور جلد صحت یاب ہو گا۔''

''خود میرا بھی یہی خیال ہے۔پرسوں اس نے خود بھی نور آباد جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔میں اپنے بیٹے کی ہر خواہش پوری کروں گا۔''

کچھ دیر بعد وہی نوجوان اجنبی کمرے میں داخل ہوا۔سب نے مل کر اسے بستر سے اٹھا کر ایک دوسرے بستر پر ڈالا جس کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے اور پھر اسے دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اسی طرح کے چلتے پھرتے بستروں پر لیٹے ہوئے ہیں اور لوگ انھیں ادھر اُدھر دھکیلتے پھر رہے ہیں۔

''گاڑی بڑے دروازے کے قریب لے آؤ''نوجوان اجنبی نے اپنے کسی ساتھی سے

کہا۔کچھ ہی دیر میں اسے کسی گاڑی میں لٹا دیا گیا اور گاڑی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔

اس نے ایسی گاڑی پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ان اجنبیوں کی طرح یہ گاڑی بھی اس کے لیے اجنبی تھی۔"ایسی شاندار گاڑی تو مہاراجہ اشوک کے پاس بھی نہیں۔"اس نے سوچا۔اسے یہ گاڑی جادوئی سی لگی، جسے نہ تو کوئی جانور کھینچتا تھا اور نہ ہی انسان؛ بل کہ پر اسرار طریقے سے خود بخود چلتی تھی۔اس کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔اس نے گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو اسے لگا جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں آ گیا ہے،ایک ایسی دنیا جو اس کی دیکھی بھالی ہوئی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔وہ بڑی بڑی عالی شان عمارتوں کو حیرت سے دیکھتا رہا۔جن کے درمیان بنے کشادہ راستوں پر اس کی جادوئی گاڑی سے ملتی جلتی بے شمار گاڑیاں رواں دواں تھیں۔

"یونان بہت ترقی یافتہ ملک ہے۔وہاں بڑی بڑی عمارتیں ہیں اور سڑکیں بہت چوڑی۔"اسے اپنے ایک ساتھی کے الفاظ یاد آئے ، جو مہاراجہ اشوک کی طرف سے شاہ انطبوکس کے لیے خیر سگالی کا پیغام لے کر گیا تھا۔اس نے واپس آ کر یونان کے بارے میں حیرت انگیز باتیں بتائی تھیں۔

"لیکن اس نے بھی نہیں بتایا تھا کہ وہاں ایسی جادوئی گاڑیاں چلتی ہیں۔"اس نے تیز رفتار سے بھاگتی ہوئی گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

"میں واپس ٹیکسا شلہ جا کر مہاراجہ کو اس شہر کے بارے میں ضرور بتاؤں گا۔وہ یقیناً میری باتوں پر یقین نہیں کریں گے۔پھر میں انھیں ساتھ لے کر یہاں آؤں گا۔وہ انھیں دیکھ کر کتنے خوش ہوں گے۔وہ جب اس گاڑی میں بیٹھیں گے تو انھیں بھی یہ اڑن طشتری کی طرح لگے گی۔"

یہ سوچتے ہوئے اس کی نظر کچھ عجیب وغریب کتبوں پر پڑی، جو سڑک کے کنارے ایستادہ تھے۔اس نے دیکھا کہ کسی نامانوس زبان میں ان پر کچھ لکھا ہوا ہے۔اس نے جب غور کیا تو دیکھا کہ ان پر موجود لکھائی خروشتی کے بجائے کسی اور رسم الخط میں تھی، لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ ان عبارات کو بھی بآسانی پڑھ سکتا ہے۔

"جب مہاراجہ اشوک یہاں آئیں گے تو میں انھیں یہ کتبے دکھاؤں گا اور انھیں مشورہ دوں گا کہ وہ آئندہ اپنے فرامین چٹانوں پر کندہ کرانے کے بجائے،ایسے کتبوں پر لکھوائیں۔"یہ سوچتے ہوئے اس کا دھیان رسم الخط کی طرف گیا جو اسے خاصا مانوس لگا۔

"یہ کون سی زبان ہے اور میں اسے کیسے جانتا ہوں۔"اس کا ذہن الجھنے لگا۔وہ کافی دیر اس پر سوچ بچار کرتا رہا۔

''ہاں ۔ یہ وہی زبان ہے ۔ جو میرے خلیفہ سید احمد بریلوی لکھتے تھے۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ کچھ اداس سا ہو گیا اور اسے وہ منظر یاد آ گیا جب اس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ان کے سر کو قبر میں اتارا تھا۔

اتنے میں اس نے باہر دیکھا تو منظر بدل چکا تھا۔ وہ کسی پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکا تھا، جہاں ہر طرف درخت ہی درخت تھے ۔ جو تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے ۔ وہ یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن یہ خوشی وقتی تھی ۔ جوں ہی اس نے باہر سے نظریں ہٹا کر گاڑی کے اندر دیکھا، وہی منظر تھا ۔ وہی اجنبی چہرے، وہی اجنبی ماحول ۔ جب وہ سلسلہ در سلسلہ پہاڑوں کو عبور کر کے ایک نئے پہاڑی علاقے میں داخل ہوئے تو کہیں کہیں اسے جانے پہچانے منظروں کی جھلک سی دکھائی دی۔ لیکن کوئی بھی منظر ایسا نہیں تھا جو اسے پوری طرح شناسا لگا ہو ۔

جب وہ ان اجنبیوں کے ساتھ ایک بستی میں پہنچا اور انھوں نے سہارا دے کر اسے اس جادوئی گاڑی سے اتارا تو اسے یوں لگا جیسے وہ یہاں پہلے بھی آیا ہے لیکن کب؟ اسے کچھ یاد نہ آ سکا۔ اسے ایک اونچے ٹیلے پر بنے ہوئے مکان کے صحن میں ایک چارپائی پر لٹایا گیا جہاں اسے دیکھنے کے لیے بے شمار لوگ جمع تھے ۔ وہ سب کے سب اس کے لیے اجنبی تھے ۔ لیکن ان کے دیکھنے کے انداز اور ان کی آپس میں گفتگو سے اسے اندازہ ہوا کہ وہ ان لوگوں کے لیے اجنبی نہیں ۔

ان لوگوں میں سے بہت سوں نے اسے اپنا قریبی رشتہ دار بتایا ۔ کسی کے بقول وہ اس کا ماموں ہے، کوئی خود کو اس کا چچا تایا ظاہر کر رہا تھا ۔ نوجوانوں میں کوئی اس کا ماموں زاد تھا تو کوئی چچا زاد۔ یہی حال عورتوں کا تھا کوئی خود کو اس کی خالہ کہہ کر اپنا تعارف کروا رہی تھی تو کوئی چچی یا تائی ۔ ایک لڑکی اس کی بہن بن گئی تھی تو کچھ چچا زاد اور ماموں زاد ۔ مگر اس نے نہ تو کسی بات کی تردید کی تھی نہ ہی تائید ۔ وہ بس ایک ادھیڑ عمر عورت کو دیکھتا رہا، جو خاموش تھی اور اسے آبدیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی ۔ اس کی آنکھوں میں ممتا کی چمک اور چہرے پر ایک کرب آمیز سکون تھا۔

''شاید یہ مجھے اپنا بیٹا سمجھ رہی ہے۔'' اس نے ادھیڑ عمر عورت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوچا ۔ جہاں اسے مانوسیت کا شائبہ سا ہوا۔

''یہ سب کسی بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔''

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ساری کی ساری بستی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو؟''

''ممکن ہے میری شکل وصورت زمان نامی شخص سے بہت ملتی ہو ۔ وہ شخص کہیں گم ہو گیا ہو اور

یہ سب مجھے زمان سمجھنے لگ گئے ہوں۔لیکن یہ زمان تھا کون؟''

پھران کی باتوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ اسی جگہ کا نام نور آباد ہے۔زمان،اس گھر کے مالک عزیز خان کا بیٹا تھا۔عزیز خان وہی اجنبی ہے جو آج اسے یہاں لے کر آیا تھا۔زمان اسی گھر میں پیدا ہوااور اس نے اپنے بچپن کے دن یہیں گزارے۔۔پھر وہ اور اس کے خاندان والے شہر چلے گئے۔لیکن بارہ سال پہلے وہ شہر سے یہاں آ گیا تھا اور اپنا بیشتر وقت یہاں موجود کسی غار کی چھت پر گزارتا تھا۔کسی کے بقول وہ بہت پڑھ لکھ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ پاگل سا ہو گیا تھا اور کوئی کہہ رہا تھا اس پر کسی پری یا جن کا سایہ تھا۔کچھ دن پہلے ایک بڑا زلزلہ آیا جس میں وہ زخمی ہو گیا۔دوسرے دن وہ بے ہوشی کی حالت میں غار میں پڑا ہو پایا گیا۔جہاں سے علاج معالجے کے لیے اسے شہر لے جایا گیا۔

''بے چارے کی زبان بھی بند ہو گئی ہے۔''سامنے چارپائی پر بیٹھی ایک عورت نے دوسری سے کہا۔

''ہاں مجھے تو لگتا ہے۔اس کی دماغی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے۔دیکھو تو ہمیں یوں دیکھ رہا ہے ،جیسے کوئی کسی اجنبی کو دیکھتا ہے۔''دوسری نے اس کی تائید کی۔

ان کی باتیں سنتے ہوئے،اس نے دماغ پر زور ڈال کر ایک مرتبہ پھر زمان کے بارے میں کچھ سوچنا چاہا لیکن کچھ بھی سوچ نہ پایا۔

شام ڈھلے جب اس کے پاس سے بھیڑ چھٹنا شروع ہوئی تو اس نے اردگرد کا بغور جائزہ لینا شروع کیا۔اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ یہ جگہ اس کی دیکھی ہوئی بھی ہے اور نہیں بھی۔وہ جس منظر کو بھی دیکھتا اسے لگتا کہ یہ منظر،اس کا جانا پہچانا بھی ہے اور انجانا بھی۔جیسے جگہ تو وہی ہو مگر وہاں کوئی تبدیلی رونما ہو چکی ہو۔جہاں اس کے خیال میں درخت ہونا چاہیے تھا وہاں اب کسی مکان کی دیوار تھی۔جہاں ٹیلا ہونا چاہیے تھا وہاں زمین ہموار تھی۔جہاں جنگل ہونا چاہیے تھا وہاں لہلہاتے کھیت تھے۔اسے جو چیز سب سے شناسا اور جانی پہچانی لگی،وہ بستی کے پیچھے واقع بڑا پہاڑ تھا،جس کے بیشتر مناظر اس کے جانے پہچانے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو بیٹا۔تم کوئی بات کیوں نہیں کرتے؟''عزیز خان نے شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

وہ بدستور خاموش رہا۔بولتا بھی تو کیا؟اس کے پاس انھیں بتانے کے لیے سوائے اس کے اور کچھ تھا بھی نہیں کہ آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔میں وہ نہیں ہوں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔اسے

اب ان لوگوں سے ہمدردی سی ہونے لگی تھی۔

''اگر میں نے اپنے بارے میں انھیں کچھ بتا بھی دیا تو یہ لوگ یقین نہیں کریں الٹا مجھے پاگل سمجھیں گے۔حالاں کہ یہ خود پاگل ہیں۔''اس نے سوچا۔

''لیکن اگر میں دھرمارا جیکا نہ پہنچ سکا تو فرمانِ مقدس کی رپورٹ کا کیا بنے گا؟انھوں نے کل پاٹلی پتر☆ کی طرف کوچ بھی کرنا ہے۔ممکن ہے مہاراجہ میری تلاش میں آدمی بھیج دے۔لیکن خیر دیکھا جائے گا۔ابھی تو مجھے ان لوگوں سے کسی نہ کسی طرح جان چھڑانی ہوگی۔مگر کیسے؟ کیا یہ لوگ مجھے جانے دیں گے؟ یہ شخص تو ہرگز نہیں۔بے چارے کا بیٹا جو کہیں غائب ہوگیا ہے۔''اس نے عزیز خان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔جوں ہی اس نے،اس کے چہرے کی طرف دیکھا،عزیز خان کو لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔

''ہاں۔ہاں۔کہو بیٹا۔کچھ تو بولو۔میں تمھاری آواز سننے کو ترس گیا ہوں۔''وہ سمجھ گیا کہ عزیز خان زبان کھولنے کے لیے اس کا حوصلہ بڑھا رہا ہے،لیکن وہ خاموش رہا۔

☆موجودہ پٹنہ

(۲)

''یہ عورت میری ماں نہ سہی۔مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر وہ مجھے اپنا بیٹا سمجھ سکتی ہے تو میں بھی اسے اپنی ماں فرض کر سکتا ہوں۔'' اس نے عزیز خان کی بیوی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔وہ اسی دن اس سے مانوس ہو گیا تھا جب اس نے پہلی بار اسے آبدیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔وہ اس کی موجودگی میں سہولت محسوس کرتا تھا۔اس وجہ سے نہیں کہ اس کی آنکھوں میں اسے مانوسیت کی جھلک دکھائی دیتی بل کہ اس لیے کہ وہ اسے کریدنے کے لیے الٹے سیدھے سوال نہیں کرتی تھی۔

وہ گزشتہ کئی دنوں سے دن رات اس کی خدمت میں مصروف تھی۔اس کی دیکھ بھال یوں کر رہی تھی جیسے وہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہو۔وہ خود اس کے ہاتھ دھلاتی، انھیں پونچھتی اور پھر اپنے ہاتھوں سے اسے کھانا کھلاتی۔ہر بار نوالہ اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے ایک امید بھری نظر اس کے چہرے پر ڈالتی اور پھر حسب معمول وہاں ایک مانوس سی اجنبیت پا کر اپنی نم دیدہ پلکیں جھکا لیتی۔ایسے موقعوں پر وہ بھی اس کی آنکھوں میں جھانکتا اور اپنی ماں کا چہرہ ذہن میں لانے کی کوشش کرتا لیکن ایسا کرتے ہوئے ہر بار اس کے ذہن میں اسی عورت کی شکل ابھرتی۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ عورت تو عزیز خان کی بیوی ہے یہ میری ماں کیسے ہو سکتی ہے؟''

''ممکن ہے اس عورت کی شکل میری ماں سے ملتی ہو۔جیسے میری: زمان سے۔'' وہ سوچتا۔کئی بار، اس نے سوچا کہ وہ اسے ماں کہہ کر پکارے اس سے وہ خوش ہو جائے گی۔مگر اس خوف سے کہ وہ بھی دوسروں کی طرح الٹے سیدھے سوال کرے گی، خاموش رہا۔

اسے یہاں آئے ہوئے کئی دن گزر چکے تھے۔اب وہ یہاں کے لوگوں اور ماحول سے کچھ کچھ مانوس ہو چلا تھا اور یہاں اس کا دل لگنا شروع ہو گیا تھا۔یہاں وہ شہزادوں کی طرح رہ رہا تھا۔ہر طرح سے اس کا خیال رکھا جا رہا تھا۔لیکن اس نے ابھی تک خاموشی نہیں توڑی تھی۔اس نے کئی بار خاموشی توڑنے کا ارادہ کیا۔لیکن پھر اسے عملی جامہ پہنانے سے باز رہا۔

اب وہ اٹھ کر ادھر ادھر گھومنے پھرنے بھی لگا تھا۔اس معاملے میں اس پر کوئی پابندی عائد نہیں

تھی۔لیکن آہستہ آہستہ اس نے محسوس کیا کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے۔کوئی نہ کوئی سائے کی طرح اس کے تعاقب میں ہوتا ہے۔اسے کسی بھی لمحے اکیلا نہیں چھوڑا جاتا۔یہاں تک کہ جب وہ پاخانے جاتا ہے تب بھی ایک آدمی باہر کھڑا رہتا ہے۔

''شاید انھیں ڈر ہے کہ میں موقع ملتے ہی یہاں سے بھاگ جاؤں گا۔تبھی یہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔'' وہ تعاقب کرتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر سوچتا۔

ایک آدھ مرتبہ اس نے یہاں سے بھاگ جانے کا منصوبہ بھی بنایا لیکن ایک دن، شام کے وقت، جب وہ مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر عقبی پہاڑ کا نظارہ کر رہا تھا تو وہاں کے بہت سے مناظر اسے جانے پہچانے لگے۔اسے لگا جیسے وہ یہاں پہلے بھی آ چکا ہے۔اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی مگر اسے کچھ یاد نہ آ سکا۔

''ٹیکسا شلہ جانے سے پہلے میں ایک دفعہ پہاڑ پر ضرور جاؤں گا۔ہو سکتا ہے مجھے اپنا کوئی سراغ مل جائے۔'' اس نے پہاڑ کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا اور آج صبح سویرے ہی اس نے وہاں جانے کا ارادہ باندھ لیا۔

ابھی وہ بہ مشکل سو، سوا سو قدم ہی چلا ہوگا کہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔وہ لمحہ بھر کے لیے رکا، اسے لگا کہ تعاقب کرنے والے نے بھی اپنے قدم روک لیے۔پھر وہ اسے نظر انداز کر کے دوبارہ قدم اٹھانے لگا۔جوں ہی اس نے ٹیلے دار پہاڑی کا پہلا ٹیلا عبور کیا وہ ایک میدان میں داخل ہو گیا۔اسے لگا جیسے وہ یہاں پہلے بھی آ چکا ہے۔وہ میدان کے وسط میں کھڑا ہو کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔وہ جوں جوں غور سے دیکھتا اسے میدان زیادہ مانوس اور دیکھا بھالا سا لگتا۔

''یہ جگہ میری دیکھی بھالی ہے۔یہاں میں پہلے کب آیا؟'' اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میدان کے نشیبی سرے پر، اسے ایک بڑی چٹان نظر آئی، جو اسے خاصی اوپری لگی۔وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور اسے حیرت سے تکنے لگا۔

''اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے۔یہاں تو کوئی چٹان نہیں تھی۔'' وہ بڑبڑایا۔

ایک دم اسے لگا جیسے اس کا تعاقب کرنے والا، چٹان کے پیچھے کھڑا ہے۔اگلے ہی لمحے اس نے دیکھا، فرمان وہاں کھڑا، اسے حیرت اور خوشی سے دیکھ رہا تھا۔

''لگتا ہے اس نے میری آواز سن لی ہے۔'' اس نے سوچا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔فرمان کو لگا جیسے زمان کو میرا تعاقب کرنا اچھا نہیں لگا۔

''زمان ۔میرے بھائی ،تم اس کا کوئی غلط مطلب نہ نکالنا۔ میں تمھارے ساتھ تمھاری حفاظت کے لیے آیا ہوں ۔تم بیماری کی وجہ سے نقاہت کا شکار ہو گئے ہو ناں ۔ میں تو صرف اس لیے تمھارے ساتھ ہوں کہ تم کہیں گر نہ جاؤ ۔تم جہاں جانا چاہو، جاؤ ۔بس مجھے اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دے دو، میں تمھارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں ۔''

''اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہاں تو کوئی چٹان نہیں تھی ۔'' اس نے چٹان کو بغور دیکھتے ہوئے دوبارہ اپنے الفاظ دہرائے ۔

''تو بول سکتا ہے۔میرے بھائی تو بول سکتا ہے؟'' فرمان اس سے لپٹ گیا ۔اس کی خوشی دیدنی تھی، لیکن اس نے کسی قسم کا کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور بدستور چٹان کو دیکھتا رہا۔

اس نے خود کو فرمان سے علاحدہ کیا، پہاڑ کی جانب مڑا، ایک بھرپور نظر وادی پر ڈالی اور قدم بڑھانے لگا ۔ جب وہ دوبارہ میدان کے وسط میں پہنچا تو اسے لگا جیسے فرمان وہیں کھڑا ہے اور خلافِ توقع اس کا تعاقب نہیں کر رہا۔وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور پیچھے مڑ کر ایک نظر فرمان کے چہرے پر ڈالی ۔فرمان کو لگا جیسے اب زمان کو اس کے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہیں ۔وہ تیز تیز اٹھا تا اس کی طرف آیا ۔فرمان کو پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں اپنائیت نظر آئی ۔

دونوں خاموشی سے وادی کی طرف قدم بڑھانے لگے ۔ جب وہ وادی کو اوپر نیچے تقسیم کرنے والے قدیم رستے پر پہنچے تو وہ کچھ دیر کے لیے رکا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا ۔

''میں یہاں سے پہلے بھی گزرا ہوں ۔'' یہ سوچتے ہوئے اس کے کانوں میں مانوس سی آوازیں آنے لگی ۔وہ کافی دیر ان آوازوں پر کان دھرے کھڑا رہا ۔یہ آوازیں اسے راستے سے کچھ اوپر وادی سے آرہی تھیں ۔اس نے اس جانب نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے وہاں دو بڑی چٹانیں نظر آئیں ۔

''یہ منظر میرا دیکھا ہوا ہے۔لیکن اس میں کچھ کمی سی ہے۔'' وہ کچھ دیر کھڑا چٹانوں کو بغور دیکھتا رہا۔پھر بڑی گزرگاہ سے ہٹ کر چٹانوں کی طرف جانے والی عمودی پگ ڈنڈی پر ہولیا ۔ہر بڑھتے قدم کے ساتھ آوازیں، صاف، واضح اور بلند ہوتی جا رہی تھیں ۔اٹھائیس ،تیس قدم چلنے کے بعد ایک پیالہ نما گڑھے کے کنارے اس کے قدم خود بخود رک گئے اور آوازیں یک دم تیز ہو گئیں ۔کچھ دیر وہ وہاں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر گڑھے کے کنارے سے کافی پیچھے ہٹ کر اس نے گڑھے کو منظر کے درمیان میں رکھ کر ایک بار پھر پورے منظر پر نظر دوڑائی ۔ارد گرد کا منظر تو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اس کا جانا پہچانا اور مانوس تھا؛ مگر اس منظر میں یہ گڑھا سے مخمل کی چادر میں ٹاٹ کے پیوند کی طرح عجیب، بے ڈھنگا اور

اوپرا لگ رہا تھا۔

"یہاں گڑھا نہیں ہونا چاہیے۔" وہ بڑبڑایا۔

فرمان اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا اور وہ گڑھے کو۔

"یہاں یہ گڑھا کس نے کھودا؟" اس نے خود کلامی کی۔ فرمان کو لگا جیسے وہ اس سے سوال کر رہا ہے۔

"یہ گڑھا تو بہت پرانا ہے۔ میں اور تو بچپن میں یہاں کھیلا کرتے تھے۔ تجھے یاد ہے ناں۔ بارش کے دنوں میں جب یہ پانی سے بھرا ہوتا، ہم دونوں اس میں کنکر پھینک کر، اس سے اٹھنے والی لہریں دیکھا کرتے تھے۔ یاد کرو۔۔۔ جب چھٹیوں میں ہم یہاں آیا کرتے تھے۔۔۔" فرمان نے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی لیکن اس کے ذہن میں کوئی ایسی یاد ندا بھر پائی۔

مانوس آوازیں اسے بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آوازوں پر کان لگائے ٹک ٹکی باندھے منظر کو دیکھتا رہا۔ یک دم اس کی آنکھوں کے آگے ایک دھندلا سا منظر لہرایا:

ایک بڑی سی چٹان۔۔

لکڑی کی سیڑھیاں۔۔۔

انسانی شباہت لیے کچھ ہیولے۔۔

اس نے جوں ہی پلک جھپکی سب کچھ غائب تھا اور اس کے سامنے وہی منظر تھا، جسے وہ ٹک ٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن الجھنے لگا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس دھندلے منظر کو دوبارہ ذہن میں ابھارنے کی کوشش کرنے لگا۔ آنکھیں بند ہونے کے کچھ ہی لمحوں بعد مانوس آوازوں کا شور بڑھنے لگا۔ اس نے منظر سے توجہ ہٹا کر اپنا ذہن آوازوں کی طرف ملتفت کر لیا۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد آہستہ آہستہ اسے آوازوں کی شناخت ہونے لگی۔ یہ لوہے کی چھینیوں پر ہتھوڑے پڑنے اور چھینیوں کے چٹان سے ٹکرانے کی آوازیں تھیں۔ اس دوران میں یک دم اسے محسوس ہوا کہ اس کے دماغ کے اندر ایک بہت بڑی چٹان ہے جس پر مسلسل ہتھوڑے کی ضربیں پڑ رہی ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو کاہو کے ایک بڑے درخت کے نیچے لیٹا ہوا محسوس کیا اور ایک اور دھندلا منظر اس کے دماغ میں عود کر آیا:

ہیولوں کے ہاتھ میں چھینیاں اور ہتھوڑے۔۔۔

چھینیوں پر ہتھوڑے کی ضربیں۔۔۔

چٹان پر ابھرتے ہوئے حروف۔۔

ساتواں فرمان۔۔۔۔۔

اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی آنکھیں کھولیں تو فرمان حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ منظر کو۔

''یہاں چٹان تھی۔وہ کدھر گئی۔'' اس نے اردگرد سے نظریں ہٹا کر گڑھے پر مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی۔یہاں کوئی چٹان نہیں تھی۔یہی گڑھا تھا جس میں ہم کنکر پھینکا کرتے تھے۔''فرمان نے نرمی سے کہا۔

''نہیں یہاں چٹان تھی۔میں نے خود اس پر ساتواں فرمان مقدس کندہ کروایا تھا۔'' فرمان کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہونے لگا۔لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہا۔

اس نے گڑھے کے کنارے کھڑے ہوکر بستی پر ایک نظر دوڑائی، جہاں مکانوں کی صرف چھتیں دکھائی دے رہی تھیں۔پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنی نظریں بستی کے پیچھے واقع میدان کی طرف لانا شروع کیں، اور میدان میں ٹھہرا کر اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔پھر اس نے اپنی نظریں میدان کے آخری سرے پر ایستادہ چٹان پر مرکوز کرلیں۔وہاں سے چٹان اگرچہ بہت چھوٹی دکھائی دے رہی تھی، مگر اسے کچھ جانی پہچانی سی لگی۔

یک دم اس کے ذہن میں کوئی خیال ابھرا اور وہ تیزی سے نیچے میدان کی طرف بھاگنے لگا۔
اسے یوں بھاگتے دیکھ کر فرمان خوف زدہ ہوگیا اور وہ بھی تیزی سے اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

میدان میں پہنچ کر فرمان نے دیکھا کہ اس کا بھائی پہلے تو چٹان کے چاروں طرف چکر لگاتا اور کچھ کھوجتا رہا پھر چٹان کے شمالی کونے میں کھڑا ہوکر اسے گھورنے لگا۔چٹان کا یہ کونا بالکل ہموار تھا، جیسے کسی نے اسے باقاعدہ تراشا ہو۔

پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر اپنی دونوں ٹانگیں چٹان کے ساتھ ٹکائیں اور ہاتھوں کے بل یوں کھڑا ہوگیا کہ اس کی ٹانگیں اوپر آسمان کی طرف تھیں اور سر زمین کی طرف۔فرمان کو لگا جیسے اس کا بھائی مکمل طور پر پاگل ہو چکا ہے۔

''یہ تو وہی چٹان ہے۔یہ یہاں کیسے آ گئی؟'' اس نے اسی طرح ہاتھوں کے بل کھڑے، چٹان کو گھورتے ہوئے کہا۔

پھر وہ دوبارہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔فرمان کو کچھ سجھائی نہ دیا۔وہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ اس حیرت میں پریشانی کا عنصر بہت نمایاں تھا۔

''یہ یہاں کیسے آ گئی، یہ تو اس گڑھے والی جگہ تھی۔''اس نے اوپر وادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا اس چٹان کو کسی طرح سیدھا کیا جا سکتا ہے۔''وہ پہلی بار فرمان سے براہِ راست مخاطب ہوا تھا۔

فرمان اس براہِ راست تخاطب پر خوش بھی ہوا لیکن اس کی تشویش برقرار رہی اور اس کی سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''کیا مطلب میں سمجھا نہیں؟''فرمان گویا ہوا۔

''جب یہ وہاں سے لڑھکتی ہوئی آئی تو سر کے بل یہاں زمین میں دھنس گئی۔اس کا اوپر والا حصہ یہاں زمین میں دھنسا ہوا ہے۔میں نے ٹیکسا شلہ جا کر مہاراجہ اشوک کو اس فرمان کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کرنی ہے۔''

''میں نے اسی پر ساتواں فرمانِ مقدس کندہ کروایا تھا۔وہ دیکھو۔وہ وہ۔۔۔''اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔

فرمان نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا، پہلے تو اسے کچھ نظر نہ آیا۔لیکن بغور دیکھنے پر اسے لگا کہ چٹان پر کچھ الٹی سیدھی لکیریں کندہ ہیں۔مزید غور سے دیکھنے پر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔کسی قدیم زبان میں اس پر واقعی کچھ لکھا ہوا تھا۔

فرمان نے مانسہرہ کے قریب بریڑی کے مقام پر، مہاراجہ اشوک کے، چٹانوں پر کندہ، چودہ فرمانوں کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔

''لیکن اس علاقے میں۔۔۔۔؟ممکن ہے اس نے اس علاقے میں بھی اپنے فرمان کندہ کرائے ہوں۔یہ علاقہ تو مانسہرہ کی بہ نسبت ٹیکسلا کے زیادہ قریب ہے۔''اس نے سوچا۔

''میں نے اسی پر ساتواں فرمانِ مقدس کندہ کروایا تھا۔وہ دیکھو۔وہ۔۔۔۔۔۔میں نے ٹیکسا شلہ جا کر مہاراجہ اشوک کو اس فرمان کے بارے میں اپنی رپورٹ پیش کرنی ہے۔''اس کے ذہن میں اپنے بھائی کے کہے ہوئے جملے دوبارہ گونجے۔

''میرے بھائی کا ان فرمانوں کی کندہ کاری سے کیا تعلق ہے؟''

اس کا سر چکرانے لگا اور اسے اپنے پیروں تلے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔اس نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا۔

''فی الحال۔آؤ گھر چلیں۔اسے الٹا کر سیدھا کرنے کے بارے میں گاؤں والوں سے مشورہ کریں گے۔تم فکر نہ کرو۔۔کوئی حل نکل آئے گا۔''فرمان نے بہ مشکل کہا اور ان کے قدم بستی کی طرف اٹھنے لگے۔

(۴)

''تم بہت تھک گئے ہو۔آرام کرو۔میں چٹان کو سیدھا کرانے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔اور ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔میں سب انتظام کرلوں گا۔' فرمان نے اپنے بھائی کو بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔

کمرے سے باہر نکل کر وہ سیدھا عزیز خان کے پاس گیا، جو مہمان خانے میں مہمانوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔اس نے ان کے کان میں کچھ کہا اور وہ دونوں باہر نکل آئے۔

''خیریت تو ہے ناں؟'' عزیز خان نے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابا جی! آپ ادھر دوسرے کمرے میں آئیں۔بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' فرمان نے کہا۔

''آپ بیٹھیں۔میں آتا ہوں۔'' عزیز خان نے مہمان خانے کے دروازے پر کھڑے ہو کر مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے بیٹا۔زمان تو ٹھیک ہے ناں؟'' عزیز خان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے فرمان سے پوچھا۔

''ابا جی! زمان پہاڑ کی طرف نکل گیا تھا۔میں بھی اس کے ساتھ گیا تھا----------''

فرمان نے وہاں پیش آنے والے واقعات ان کے گوش گزار کیے اور وہ حیرت کی تصویر بنے اسے دیکھتے رہے۔انھیں اپنے بیٹے کی باتوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

''ابا جی۔میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے چٹان پر واقعی کچھ لکھا ہوا ہے۔آپ ابھی میرے ساتھ چلیں۔میں آپ کو دکھاتا ہوں۔'' وہ دونوں اٹھے۔ان دونوں کا رخ میدان کی طرف تھا۔

باوجود اس کے کہ عزیز خان اب بوڑھے ہو چکے تھے۔ان کے قدم اپنے بیٹے کے قدموں سے بھی تیز اٹھ رہے تھے۔

''یہ دیکھیں۔' فرمان نے انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تھوڑا غور سے دیکھیں۔مجھے بھی پہلے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔'' اس نے اپنی انگلی نسبتاً

زیادہ ابھرے ہوئے حروف پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ۔۔ہاں ۔۔'' عزیز خان نے چٹان پر اس کی انگلی کی سیدھ میں نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔انھیں لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہے ہیں ۔

''یہ کیسے ممکن ہے ۔'' انھوں نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

وہ کافی دیر تک چٹان پر کندہ عبارت کو حیرت سے تکتے رہے ۔

گھر پہنچ کر انھوں نے مہمانوں کو رخصت کیا اور دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے ۔

عزیز خان کی بیوی نے جب شوہر اور بیٹے کو اس طرح پریشان بیٹھے سرگوشیاں کرتے ہوئے دیکھا تو بوکھلا سی گئی ۔مگر ان دونوں نے یہ کہہ کر کہ کاروبار میں لاکھوں کا نقصان ہوگیا ہے، جس کی وجہ سے وہ پریشان ہیں، اسے ٹال دیا۔

گھر والوں کو یہ کہہ کر کہ وہ اس نقصان کے ازالے کے بارے میں رات کو صلاح مشورے کریں گے، دونوں باپ بیٹے نے رات ایک ہی کمرے میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔وہ ساری رات، دن کو پیش آنے والے واقعات اور زمان کی ذہنی حالت کے بارے میں سوچ بچار کرتے رہے ۔رات کے پچھلے پہر انھوں نے فیصلہ کیا کہ صبح اُٹھ کر تین کام کرنے ہیں:

۱۔ اسلام آباد جا کر ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی سے ملنا ہے اور گزشتہ روز پیش آنے والے واقعات ان کے گوش گزار کر کے زمان کی ذہنی حالت کے بارے میں ان سے مشورہ کرنا ہے ۔

۲۔ کسی کو یہ بتائے بغیر کہ چٹان کو گرانے کا مقصد کیا ہے، اسے نیچے کھائی میں اس طرح گرانا ہے کہ اس کا زمین والا سرا اوپر کی طرف آجائے ۔

۳۔ قدیم زبانوں کے ماہر ڈاکٹر کلیم ، جو ایک یونیورسٹی میں صدر شعبہ ہیں، کو یہاں لا کر ان سے چٹان کا معائنہ کرانا ہے۔

(۴)

دوسرے دن صبح آٹھ بجے کے قریب گاؤں کے پینتیس کے قریب افراد میدان میں جمع تھے۔انھیں سردار جی کی طرف سے پیغام ملا تھا کہ سب لوگ مع کدالوں، بیلچوں اور کھودائی کے دیگر سامان کے وہاں جمع ہوں اور فرمان کے وہاں پہنچنے کا انتظار کریں۔

ٹھیک آٹھ بجے فرمان وہاں پہنچ گیا۔اس نے تمام حاضرین کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا اور تاکید کی کہ چٹان کو اس طرح نیچے گرایا جائے کہ اس کا سلیٹ نما ہموار حصہ اوپر آسمان کی طرف ہو۔

ایک دو نے مقصد جاننے کی کوشش بھی کی۔لیکن فرمان کی طرف سے خاموشی دیکھ کر وہ بھی دوسروں کے ساتھ اپنے کام میں جت گئے۔سب سے پہلے میدان کے مغربی سرے سے، آبشار کی صورت نیچے گرتے پانی کا رخ موڑا گیا اور اسے ایک چکر کاٹتی نالی کے ذریعے دوبارہ برساتی نالے میں چھوڑا گیا۔پھر نیچے کھائی میں جہاں پانی گرنے کی وجہ سے پہلے ہی ایک بڑا سا گڑھا بنا ہوا تھا، اسے مزید گہرا کیا گیا تاکہ جب چٹان نیچے گرے تو وہ وہیں دھنس کر رہ جائے اور آگے کو نہ لڑھک سکے۔بصورتِ دیگر وہ بستی کے ان مکانوں کو مسمار کرتے ہوئے بہت دور بھی جا سکتی تھی، جو برساتی نالے کے بالکل کنارے بنے ہوئے تھے۔

ظہر کے وقت تک خاصا بڑا گڑھا تیار کیا جا چکا تھا۔یہ یقین کر لینے کے بعد کہ اگر چٹان نیچے گرائی جائے تو وہ یہیں زمین میں دھنس جائے گی، انھوں نے چٹان کے نیچے کھودائی شروع کر دی۔اگلے دو گھنٹوں میں وہ معدنی کان کی طرز پر چٹان کے نیچے ایک خاصی بڑی غار بنا چکے تھے، جو چٹان کی چوڑائی کو محیط تھی۔پھر کچھ لوگ بڑے بڑے رسے لے کر چٹان کے اوپر چڑھ گئے اور انھوں نے تین رسوں سے اسے باندھا اور چھ چھ لوگ ہر رسے کو پکڑ کر نیچے گڑھے کے کنارے کھڑے رہے، جب کہ باقی چٹان کے پیچھے کھڑے ہو کر فرمان کے حکم کا انتظار کرنے لگے۔فرمان نے چٹان کے چاروں طرف گھوم کر، چٹان، اس سے بندھے رسوں اور انھیں کھینچنے والے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔

''سب تیار ہیں!'' فرمان نے باآوازِ بلند پوچھا۔

''جی ی ی ی'' ۔پچیس تیس آوازیں ایک ساتھ ابھریں ۔

''چلیں ۔بسم اللہ کریں ۔''

''نعرہ تکب ی ی ی ر ۔'' اللہ اکبرررر۔''

اور اگلے چند لمحوں میں چٹان دھم کی ایک زوردار آواز کے ساتھ نیچے گڑھے میں تھی اور اس کے ہموار حصے کا رخ آسمان کی طرف ۔فرمان نے میدان کے سرے پر کھڑے ہو کر اس پر کندہ عبارت پر نظر دوڑائی اور اندازہ لگایا کہ اس نامعلوم زبان کو سمجھنے والا کوئی بھی شخص یہاں کھڑے ہو کر اسے آسانی سے پڑھ سکے گا۔

(۵)

''ویری سیڈ۔ میں اس سلسلے میں سرِ دست کوئی حتمی بات نہیں کرسکتا۔میری پینتیس سالہ پیشہ ورانہ زندگی میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا کیس ہے۔کل تو ایک بہت ضروری میٹنگ ہے۔پرسوں میں خودنور آباد آؤں گا۔تین چار دن کی چھٹی لے کر۔میں چاہتا ہوں کہ آپ کے بیٹے کے ساتھ ساتھ میں اس عجیب وغریب چٹان کو بھی دیکھوں۔''ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی نے زمان کی پوری کہانی تفصیل سے سننے کے بعد کہا۔ڈاکٹر فاروقی عزیز خان کے دیرینہ دوستوں میں سے تھے۔وہ ایک ممتاز نفسیاتی معالج ہی نہیں دردِدل رکھنے والے انسان بھی تھے۔وہ انتہائی وسیع المطالعہ شخص تھے۔زلزلے کے دنوں میں وہ ملک سے باہر تھے اور ابھی چند دن پہلے ہی واپس آئے تھے۔جب انھیں زمان کی ذہنی حالت کے بارے میں پتا چلا تھا تو انھوں نے عزیز خان کو فون کر کے زمان کا حال احوال پوچھا تھا۔اب نئی کہانی سن کر وہ خود بھی پریشان ہو گئے تھے۔

''Cerebral Edema'' ڈاکٹر فاروقی رپورٹس کا معائنہ کرتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑائے۔

''یہ تو طے ہے کہ اس مرض میں مریض ہوش میں آنے کے بعد خطائے حس (Hallucination) کی کیفیت میں مبتلا ہوسکتا ہے اور اپنی خیالی دنیا کو حقیقی سمجھ سکتا ہے۔لیکن زمان جو کچھ دیکھتا یا سوچتا ہے وہ نہ تو فریبِ نظر ہے اور نہ ہی خطائے حس۔''ڈاکٹر فاروقی نے اپنے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

''لیکن یار کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک شخص میں اڑھائی ہزار سال پہلے کی روح داخل ہو جائے؟ اب تو سائنس کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔کیا میڈیکل سائنس اس کی کوئی توجیہ پیش کرسکتی ہے؟''عزیز خان نے پوچھا۔ان کے لہجے میں پریشانی کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا۔وہ یہاں آتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ ان کا دیرینہ دوست ان کے بیٹے کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر یقین ہی نہیں کرے گا۔ڈاکٹر صاحب اس پر پریشان ضرور ہوئے تھے لیکن انھوں نے اس پر کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔

''دیکھیں۔میڈیکل سائنس روح ووح کے چکر کو تو نہیں مانتی۔البتہ انسانی ذہن کی پر اسراریت کی پوری طرح قائل ہے،اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔آپ نے سائنسی ترقی کی بات کی ہے۔بات یہ ہے کہ سائنس نے ابھی تک،میرے خیال میں صرف طبیعات کے میدان میں زیادہ ترقی کی ہے۔اس نے انسان کے صرف معروض کو بدلا ہے،اندر سے انسان اب بھی وہی ہے۔وہی۔غاروں میں رہنے والا۔ابھی تک سائنس کی رسائی انسان کے باطن تک پوری طرح ممکن نہیں ہو پائی ہے۔ہمیں جو ترقی نظر آ رہی ہے وہ ہمارے اردگرد ہوئی ہے۔میرے سامنے بیٹھا ایک انسان کیا سوچ رہا ہے؟ کیوں سوچ رہا ہے؟ کیسے سوچ رہا ہے؟ایک ماہر نفسیات ہونے کے باوجود میں اس سے بے خبر ہوں۔میرے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا عجوبہ ___ بلکہ میں اسے معجزہ کہوں گا___ انسانی دماغ ہے۔دنیا میں اب تک جتنی بھی ترقی ہوئی ہے وہ سب اسی دماغ کی مرہونِ منت ہے۔لیکن خود دماغ کیسے کام کرتا ہے،اس کے بارے میں ہم فی الحال بہت کم جان پائے ہیں اتنا کم کہ شاید وہ قابلِ ذکر بھی نہیں۔ہم مستقبل میں اس کے بارے میں کتنا جان پائیں گے۔اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔سولومن سنائیڈر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ہم انسانی دماغ کو پوری طرح کبھی سمجھ ہی نہیں پائیں گے۔''ڈاکٹر فاروقی بغیر کوئی وقفہ دیے بولتے چلے گئے۔عزیز خان کے اندر کا فلسفی جاگ اُٹھا۔ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن کر ان کا تجسس مزید بڑھ گیا۔

''کیا میڈیکل سائنس کی تاریخ میں ایسی مثالیں پہلے بھی موجود ہیں؟''

''بالکل ایسی نہ سہی۔لیکن اس سے ملتی جلتی کئی مثالیں موجود ہیں۔میرے خیال میں قریب ترین مثال مولی فانچر نامی ایک عورت کی ہے۔جس کی پچاس سالہ زندگی میں ایسے کئی واقعات پیش آئے،جنھوں نے اس کے معالجین کو ہلا کر رکھ دیا۔اس کے دونوں معالج ڈاکٹر رابرٹ سپاڑا اور ڈاکٹر جارج سارجنٹ اپنے وقت کے ممتاز ماہر ذہنی امراض تھے۔لیکن وہ کبھی اس کی کوئی توجیہ پیش نہیں کر سکے۔جب اس کے بارے میں اخبارات میں خبریں چھپی تھیں تو بہت سے لوگوں نے ان پر یقین نہیں کیا۔ایسے لوگوں میں مشہور فلکیات دان ہنری پارخرسٹ بھی تھا۔وہ خصوصی طور پر اس سے ملنے بھی گیا تھا۔وہ کئی روز تک اس کے ساتھ رہا اور ایک ہی تجربہ بار بار دہراتا رہا،وہ ایک خط لکھ کر لفافے میں بند کر دیتا اور مولی بغیر لفافہ کھولے اسے بتا دیتی کہ خط میں کیا لکھا ہے اور کس انداز میں لکھا ہے۔ہنری کو شبہ ہوا کہ مولی اس کا ذہن پڑھ لیتی ہے۔اپنے اس شبے کو دور کرنے کے لیے اس نے ایک پرانی فائل کا ایک صفحہ بغیر دیکھے نکال لیا کہ خود اسے بھی اس کے مندرجات کا علم نہ ہو پائے۔لیکن جب اس نے لفافہ آگے

کیا تو اس کا شبہ دور ہو گیا۔ مولی نے بغیر لفافہ کھولے اسے بتا دیا کہ صفحے پر کیا لکھا ہے۔ ہنری نے لفافہ کھول کر دیکھا تو ایک حرف بھی آگے پیچھے نہیں تھا۔ اس سے ملتی جلتی اور بھی کئی مثالیں موجود ہیں۔ اس لیے آپ زمان کی ذہنی حالت کو حیرت انگیز تو کہہ سکتے ہیں لیکن ناممکن نہیں کہہ سکتے۔'' ڈاکٹر فاروقی نے اپنے دائیں طرف ایستادہ انسانی ڈھانچے کی کھوپڑی پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر فاروقی کافی دیر تک کھوپڑی کے اندر موم سے بنے مصنوعی دماغ پر نظریں جمائے کچھ سوچتے رہے۔ پھر انھوں نے وہاں سے نظریں ہٹا کر اپنے دوست عزیز خان کی طرف دیکھا؛ جو حیرت، پریشانی، تجسس اور الم کی تصویر بنے، ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ جسے دروازے پر ہونے والی دستک نے توڑا۔

''مے آئی کم ان سر۔''

''یس۔''

''سر ساڑھے بارہ بجے میٹنگ ہے۔'' ایک نوجوان، جس کے ایک ہاتھ میں ڈائری جب کہ دوسرے میں قلم تھا، باادب انداز میں گویا ہوا۔

''او۔کے۔'' ڈاکٹر فاروقی نے سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جس پر بارہ بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔

گھڑی سے نظر ہٹا کر انھوں نے عزیز خان کے چہرے پر ڈالی جو بدستور کسی سوچ میں گم تھے۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا بہتر کرے گا۔ میں آج رات اس سلسلے میں اپنے ایک امریکی دوست سے بھی مشورہ کروں گا۔ اس کا شمار دنیا کے بہترین نفسیاتی معالجین میں ہوتا ہے۔ پرسوں میں خود نور آباد آؤں گا۔ آپ بیٹھیں۔ گھنٹے بھر کی میٹنگ ہے۔ پھر ملتے ہیں۔'' ڈاکٹر فاروقی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں چلتا ہوں۔ مجھے شام تک نور آباد بھی پہنچنا ہے۔ ابھی میں ڈاکٹر کلیم سے ملنے جاؤں گا۔ انھیں ساتھ لے کر جانا ہے۔ ان سے صبح میری بات ہوئی تھی۔ چٹان پر لکھی ہوئی عبارت کے سلسلے میں۔ وہ تو اسی وقت ساتھ چلنے کو تیار تھے۔ لیکن میں نے انھیں بتایا تھا کہ میں پہلے ڈاکٹر صاحب سے ملوں گا، پھر آپ کی طرف آؤں گا۔ اب وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' عزیز خان نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

دونوں ایک ساتھ کمرے سے باہر نکلے اور الگ الگ راہداریوں کی طرف چل پڑے۔

(۶)

عزیز خان جب ڈاکٹر کلیم کو لے کر نور آباد پہنچے تو بستی کی مسجد سے عصر کی اذان بلند ہو رہی تھی۔ حویلی کے پیچھے واقع قبرستان میں جب وہ گاڑی سے اترے تو ان کے قدم مہمان خانے کے بجائے بستی کے پیچھے واقع میدان کی طرف اٹھنے لگے۔ کیوں کہ ڈاکٹر کلیم، عزیز خان سے بھی زیادہ متجسس تھے۔ انھوں نے گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ پہلے چٹان کا معائنہ کریں گے اور پھر گھر جائیں گے۔ بصورتِ دیگر اندھیرا پھیلنے کے باعث معائنے کا کام کل پہ ٹل جائے گا۔ چٹان کو سیدھا کرنے کی خبر فرمان نے انھیں پہلے ہی دے دی تھی۔ انھوں نے اسے ہدایت کی تھی کہ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی تمام لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ تا کہ بر سرِ دست کوئی شخص اس بارے میں کچھ جان نہ پائے۔

جب وہ میدان میں داخل ہوئے تو وہاں صرف فرمان کھڑا چٹان کو دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کلیم کی نظر جوں ہی چٹان پر پڑی ان کے پورے بدن میں سر خوشی کی لہر پھیل گئی۔ انھیں لگا جیسے انھوں نے کوئی نیا امریکہ دریافت کر لیا ہے۔ عزیز خان نے ان کی طرف دیکھا تو انھوں نے اپنی خوشی چھپانے کے لیے فوراً اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی۔ وہ کافی دیر چٹان کو بغور دیکھتے رہے اور عبارت پڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ عزیز خان اور فرمان نے دیکھا کہ ان کی نظریں بار بار اوپر نیچے حرکت رہی تھیں۔ پھر میدان میں ان کی پر اسرار آواز گونج گئی:

"یہ مقدس فرمان مہاراجہ اشوک کے حکم سے جاری کیا گیا ہے۔

مہاراجہ کی خواہش ہے کہ ہر جگہ ہر طبقے کے لوگ اطاعت گزار رہیں۔ کیوں کہ ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ اپنے حواس پر قابو رکھے اور اس کا ذہن پاک صاف رہے۔ البتہ مردوں کو اپنی خواہشات اور پسند پر قابو نہیں رہتا۔

کچھ لوگ احکامات پر پورا پورا عمل کریں گے اور کچھ جزوی طور پر۔ حتیٰ کہ کسی ایسے شخص کے نزدیک بھی، جو مکمل طور پر آزادہ روی کا قائل ہو، اپنے حواس کو قابو رکھنا، ذہن کی پاکیزگی، احسان مندی

اور وفاداری ہمیشہ قابلِ تعریف رہی ہیں۔"

ڈاکٹر کلیم نے چٹان پر نظریں جماتے ہوئے نامعلوم زبان میں کندہ عبارت کا ترجمہ انھیں سنایا؛ اور ساتھ ہی انھیں یہ بھی بتایا کہ یہ عبارت خروشتی رسم الخط میں ہے۔ جو ساتویں صدی عیسوی تک اس علاقے میں مروج رہا، بعد میں اس کی جگہ دیوناگری نے لے لی۔

"یہ مہاراجہ اشوک کا ساتواں فرمان ہے۔ اس نے اپنے دورِ حکومت میں کئی فرمان کندہ کرائے۔ جن میں سے چودہ فرمان مانسہرہ میں بریڑی کے مقام پر دریافت ہو چکے ہیں۔ یقیناً ایسے فرمان یہاں اور چٹانوں پر بھی موجود ہوں گے۔"

ڈاکٹر کلیم نے سنجیدگی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی آواز میں مسرت لہریے لے رہی تھی۔ جسے خود ان کے علاوہ صرف چٹان نے محسوس کیا، جو ان کے قدموں سے تقریباً بیس فٹ نیچے ایک کھائی میں جائے نماز کی طرح بچھی ہوئی تھی۔

عزیز خان اور فرمان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر پریشانی جب کہ آنکھوں میں حیرت تھی۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے اور ڈاکٹر کلیم کی تصدیق کے باوجود انھیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

سورج مغربی سمت واقع کوہل کے پہاڑوں پر غروب ہو رہا تھا اور ان تینوں کے سائے ان کی پشت پر واقع وسیع میدان کے مغربی سرے کو چھو رہے تھے۔

ڈاکٹر کلیم نے کاندھے سے لٹکائے ہوئے بیگ میں سے اپنا کیمرہ نکالا اور تصویریں کھینچنے لگے۔ انھوں نے مختلف زاویوں سے چٹان کی دو درجن سے زائد تصاویر اتاریں، پھر ڈیجیٹل سکرین پر ایک ایک تصویر کو بغور دیکھنے لگے۔ ہر تصویر کو دیکھتے ہوئے ان کے اندر سرشاری کی ایک لہر ابھرتی، جسے وہ بڑی مشکل سے چہرے تک آنے سے بچاتے۔ تمام تصاویر دیکھنے کے بعد انھوں نے کیمرے کو احتیاط سے بیگ میں رکھا اور ان دونوں کے ساتھ بستی کی طرف اترنے لگے۔

ابھی وہ بستی میں داخل بھی نہیں ہو پائے تھے کہ ان کے سائے گھنے اندھیرے میں کہیں گم ہو چکے تھے۔

(۷)

''نورخان

والدِ محترم خان بہادر فقیر محمد خان

تاریخِ وفات ۱۲/ جون ۱۸۴۹ء، بہ مقام باڑہ

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں

سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں''

ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی نے جوں ہی حویلی کے پیچھے گاڑی کھڑی کی ان کی نظر سنگِ مرمر سے بنی ایک بڑی قبر کے سرہانے لگی تختی پر پڑی۔اس سے آگے سبز گنبد والا ایک مزار تھا۔جس کی چھت پر کبوتر بیٹھے ہوئے تھے۔عزیز خان ان کے دیرینہ دوستوں میں سے تھے،لیکن انھیں یہاں آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔حالاں کہ عزیز خان کے اسلام آباد والے گھر میں وہ سینکڑوں مرتبہ جا چکے تھے۔

''نور آباد کی بنیاد رکھنے والا۔نورخان۔''انھوں نے عبارت پر دوبارہ نظر دوڑاتے ہوئے زیرِ لب کہا۔

''السلام علیکم، انکل۔''انھوں نے مڑ کر دیکھا تو فرمان کھڑا،ان کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔اس کی نظریں ان کے لباس پر تھیں اور آنکھوں میں حیرانی۔ڈاکٹر فاروقی نے عجیب وغریب قسم کا اوور کوٹ زیبِ تن کر رکھا تھا۔لیکن اس نے ادب آداب کے پیشِ نظر کسی قسم کا کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔تاہم ڈاکٹر فاروقی اس کی حیرانی کو بھانپ گئے تھے۔

''کیسے ہو بیٹا؟۔''

''ٹھیک ہوں۔''وہ ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''زمان اب کیسا ہے؟۔''

''بظاہر تو ٹھیک ہی ہے۔لیکن ۔۔۔باقی ابا جی نے آپ کو بتایا ہی ہوگا۔''

''ہاں۔''

''خان جی نے ایک جنازہ پہ جانا تھا۔صبح بتا رہے تھے۔واپس آچکے ہیں؟''

''ابھی پہنچے تو نہیں ہیں۔لیکن آتے ہی ہوں گے۔جنازہ پڑھا جا چکا ہوگا۔''اتنے میں وہ حویلی میں داخل ہو رہے تھے۔جس کا ایک حصہ پچھلے ماہ آنے والے زلزلے میں گر گیا تھا اور اس کی تعمیرِ نو کا کام جاری تھا۔

''عزیز خان کے آبا و اجداد بہت شاندار لوگ رہے ہوں گے۔''انھوں نے حویلی کے در و دیوار کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

''انکل آپ یہاں تشریف رکھیں،میں ابا جی کا پتا کر کے آتا ہوں۔'فرمان نے مہمان خانے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

جوں ہی وہ مہمان خانے میں داخل ہوئے۔ان کی نظر ایک بڑی تصویر پر پڑی،جو پچھلی دیوار پر آویزاں تھی۔انھوں نے قریب جا کر دیکھا نیچے نور خان کا نام لکھا ہوا تھا۔یہ ہاتھ سے بنی ہوئی خیالی تصویر تھی اور اس کے خدوخال نور خان کی جلالت کے ساتھ ساتھ بنانے والے کی مہارت کا بھی پتہ دے رہے تھے۔عزیز خان کی زبانی انھوں نے نور خان کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔

''کیسا شاندار آدمی رہا ہوگا اپنے وقت کا۔مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت سے ٹکر لینے والا اور اس کے گورنر کو قتل کرنے والا۔کیسی شاندار جگہ آکر بستی بسائی۔''انھوں نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔

اس تصویر کے دائیں اور بائیں دونوں طرف دو اور بڑی بڑی تصاویر بھی آویزاں تھیں۔یہ دونوں کیمرے سے اتاری گئیں بلیک اینڈ وائٹ تصاویر تھیں۔دائیں طرف والی تصویر پر خان بہادر فقیر محمد خان جب کہ بائیں طرف والی پر خان بہادر ظفر علی خان کے الفاظ درج تھے۔

''یقیناً یہ درویش منش آدمی رہا ہوگا۔''ڈاکٹر فاروقی نے فقیر محمد خان کی تصویر کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔تصویر میں وہ صاف ستھرا مگر بالکل سادہ لباس پہنے ہوئے نظر آ رہا تھا۔

"یہ آدمی تو دیکھا دیکھا ہوا سا لگتا ہے! لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ تصویر بہت پرانی ہے۔ کم از کم سو سال پرانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پھر اس کے خد و خال کس سے ملتے ہیں؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں نے ایسے ہی خد و خال والا کوئی شخص دیکھ رکھا ہے۔" انھوں نے بائیں طرف والی تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے ذہن پر زور ڈال کر کچھ یاد کرنے کی کوشش کی۔ پھر وہ صوفے پر بیٹھ کر چھت کو گھورنے لگے۔

"یہ اپنے وقت کی شاندار حویلی رہی ہوگی۔ لکڑی کا ایسا شاندار کام۔۔۔"

"جنگجوؤں میں ایسی نفاست۔ اور ایسا ذوق آرائش؟۔۔" انھوں نے لکڑی پر کیے گئے نقاشی کے باریک اور نفیس کام کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

وہ انھی خیالوں میں گم تھے کہ عزیز خان کمرے میں داخل ہوئے۔ فرمان بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہر وقت تھری پیس سوٹ میں ملبوس رہنے والے اپنے دیرینہ دوست کو، وہ ایک پراسرار قسم کے اوور کوٹ میں ملبوس دیکھ کر چونک اٹھے۔

"بہت شکریہ دوست۔" عزیز خان نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"دوست بھی اور شکریہ بھی۔" ڈاکٹر فاروقی نے اپنائیت سے کہا۔

میں آپ کو کبھی زحمت نہ دیتا۔ لیکن میری مجبوری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ زمان کو کسی طرح بھی خبر ہو کہ ہم اسے بیمار سمجھ رہے ہیں۔"

"سردار صاحب آپ بھی کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ چھوڑیں ان باتوں کو۔ مجھے یہ بتائیں زمان اس وقت ہے کہاں؟"

"یہیں ہے میں اسے ابھی بلواتا ہوں۔"

"مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے مگر آپ فکر نہ کریں، خدا بہتر کرے گا۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی نے اپنے بریف کیس میں سے ایک انگریزی اخبار نکال کر میز پر پھیلا دیا۔

"یہ دیکھیں۔" انھوں نے اخبار کے اندرونی صفحے کی طرف ان دونوں کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔ جہاں ڈاکٹر کلیم کا مضمون تصویروں کے ساتھ چھپا ہوا تھا۔

عزیز خان نے جلدی جلدی پورا مضمون پڑھ ڈالا۔ انھیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ پورے

مضمون میں ان کے بیٹے کا کہیں کوئی ذکر نہیں تھا۔اس چٹان کی دریافت کا سہرا ڈاکٹر کلیم نے اپنے سر باندھا تھا۔اس سے بھی زیادہ اطمینان کی بات یہ تھی کہ انھوں نے نورآباد کا بھی کہیں کوئی ذکر نہیں کیا۔بس ہزارہ کی جنوب مشرقی پہاڑیوں کا اشارہ دیا تھا۔شاید وہ اس پر مزید تحقیق کرنا چاہتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اور ماہر لسانِ قدیم یا ماہر آثارِ قدیمہ نورآباد پہنچے۔مضمون کے آخر میں انھوں نے اس سلسلے کے اگلے مضمون کا بھی ذکر کیا تھا۔

"فاروقی صاحب! یہ بات ذہن میں رکھیے گا۔وہ آپ کو پہچانے گا نہیں۔" عزیز خان نے تشویش کے انداز میں کہا۔

"آپ فکر نہ کریں۔سرِ دست مجھے اس سے ملوائیں؛ میں اس سے کچھ بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔لیکن جیسے ہی وہ یہاں آئے۔میرے اور اس کے علاوہ کمرے میں کوئی موجود نہ ہو۔ممکن ہے وہ آپ لوگوں کے سامنے ہچکچائے۔میں چاہتا ہوں وہ زیادہ سے زیادہ بولے اور میں سنوں۔"

"ٹھیک ہے۔" یہ کہتے ہوئے دونوں باپ بیٹا دروازے سے باہر نکل گئے۔

"مجھے ٹیکسلا شلہ جا کر مہاراجہ اشوک کو فرمان مقدس کے چٹان پر کندہ ہونے کی رپورٹ پیش کرنی ہے۔" ڈاکٹر فاروقی کے ذہن میں زمان کا جملہ گونجا، جو عزیز خان نے انھیں پرسوں سنایا تھا۔

ابھی وہ اس جملے کی معنویت پر غور کر رہے تھے کہ زمان، عزیز خان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔عزیز خان دروازے ہی سے واپس پلٹ گئے۔

ڈاکٹر فاروقی نے اسے بیٹھنے کو کہا لیکن وہ کھڑا رہا اور کچھ دیر ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کے بعد سامنے دیوار پر لگی تصویریں دیکھنے لگا۔

"مجھے پہچانا؟" ڈاکٹر فاروقی نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔اس نے ایک اچٹتی سی نظر ان پر ڈالی اور دوبارہ تصویریں دیکھنے لگا۔

"نہیں ناں۔" اسے خاموش پا کر انھوں نے خود ہی جواب دیا اور اپنا اوور کوٹ اتارنے لگے۔جوں ہی اس کی نظر ڈاکٹر فاروقی کے لباس پر پڑی وہ انھیں مانوس نظروں سے دیکھنے لگا۔ڈاکٹر فاروقی نے اس کے چہرے پر لکھی انسیت پڑھ لی۔وہ کافی دیر کھڑے ان کے لباس کو دیکھتا رہا

جب کہ ڈاکٹر فاروقی اس کے چہرے کو۔

''میں اس آدمی سے پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں۔آنند ایسا ہی لباس پہن کر ٹیکسا شلہ کی یونیورسٹی میں پڑھانے جایا کرتا تھا۔شاید یہ آدمی بھی وہیں پڑھاتا ہے''زمان نے سوچا۔ڈاکٹر فاروقی نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا کہ وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔انھوں نے معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے کہا:

''میں ٹیکسا شلہ سے آیا ہوں۔''

ان کے منہ سے ٹیکسا شلہ کا نام سنتے ہی زمان کے دماغ میں کوئی لہری کوندی:

''آپ مجھے وہاں لے جا سکتے ہیں؟''اس نے بغیر سوچے بے تابی سے کہا۔

''تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟''ڈاکٹر فاروقی نے بغیر کسی توقف کے کہا۔

''مہاراجہ کو جا کر بتانا ہے کہ چٹان پر فرمانِ مقدس کندہ کرایا جا چکا ہے۔لیکن۔۔۔''وہ یک دم خاموش ہو گیا۔

''لیکن کیا؟ہاں۔ہاں بولو۔کیا ہوا؟''ڈاکٹر فاروقی نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔وہ وہ۔۔۔وہ چٹان وہاں سے میدان میں کیسے آ گئی۔میں نے جب اس پر فرمان کندہ کرایا تھا تو وہ بڑی گزرگاہ کے ساتھ تھی۔اب وہ لڑھک کر نیچے آ گئی ہے۔کل ان لوگوں نے میرے کہنے پر اسے سیدھا کرایا ہے۔وہ تو الٹی پڑی ہوئی تھی۔''

''کوئی بات نہیں۔اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔میں تمھارے ساتھ جاؤں گا۔میں مہاراجہ کو بتاؤں گا کہ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔''ڈاکٹر فاروقی نے کہا۔کافی دیر تک کمرے پر خاموشی کا پہرہ رہا۔

''تم کب سے مہاراجہ کی ملازمت میں ہو؟''

''ٹھیک سے تو یاد نہیں مگر کافی عرصے سے۔''

''اس سے پہلے تم کیا کرتے تھے؟''اس سوال پر وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا اور کچھ یاد

کرنے کی کوشش کرنے لگا:

''جی۔ میں اس سے پہلے۔۔۔۔''

''اس سے پہلے میں خلیفہ سید احمد بریلوی کے ساتھ تھا۔''اس نے اپنے بائیں طرف دیوار پر آویزاں قل شریف کو دیکھتے ہوئے کہا۔اس رسم الخط سے اسے یاد آیا تھا کہ وہ خلیفہ کے ساتھ تھا۔

ڈاکٹر فاروقی اس جملے پر چونکے لیکن انھوں نے کسی قسم کی حیرت یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا:

''وہاں کیا ہوا تھا؟''

''پوری طرح سے یاد نہیں ہے۔مگر جب میں وہاں پہنچا تو وہ شہید ہو چکے تھے۔میں نے ان کا سر اتارا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ میدان سے فرار ہو گیا۔پھر میں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ان کے سر کو ایک دریا کے کنارے دفن کر دیا تھا۔''

دونوں کافی دیر خاموش رہے۔ڈاکٹر فاروقی اس کے کہے ہوئے جملوں کی معنویت پر غور کرتے رہے اور وہ انھیں دیکھتا رہا۔

''اس سے پہلے؟''ڈاکٹر فاروقی نے سوالات کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔وہ کافی دیر کچھ سوچتا رہا۔ڈاکٹر فاروقی کو لگا کہ وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے:

''ہاں۔ہاں۔بتاؤ۔میں تمھیں ٹیکسا شلا اسی رستے سے لے کر جاؤں گا،جس سے تم آئے ہو۔اس رستے کو یاد کرنے کی کوشش کرو۔''انھوں نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس سے پہلے میں دو آدمیوں سے ملا تھا۔ایک کا نام جمعہ خان جب کہ دوسرے کا ایبٹ تھا۔ایبٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ بہت جلد مجھ سے ملنے نور آباد آئے گا۔۔۔۔۔۔لیکن۔۔۔لیکن وہ مجھ سے ملنے پھر نہیں آیا۔''اس نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے پہلے؟''ڈاکٹر فاروقی نے اگلا سوال کیا۔

''اس سے پہلے۔۔۔مجھے کچھ یاد نہیں۔''

''یاد کرنے کی کوشش کرو۔ہاں ہاں یاد کرو۔اس سے پہلے تم کہاں تھے۔میں اسی راستے سے تمھیں واپس ٹیکسا شلہ لے کر جاؤں گا۔تھوڑا دماغ پر زور ڈالو۔''

وہ صوفے پر دراز ہو کر چھت کو گھورتے ہوئے کافی دیر سوچتا رہا۔

''اس سے پہلے ۔۔۔۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ۔ میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ چارپائی کے ساتھ باندھے ہوئے ایک جھولے میں لیٹا ہوا بچہ۔ مکان کی چھت چارپائی پر آ گری تھی اور میرا سانس گھٹنے لگا تھا۔ میں بہت دیر روتا رہا اور روتے روتے سو گیا تھا۔ جب آنکھ کھلی تو مجھے لگا کہ کچھ لوگ چھت کو کھود کر مجھے نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کافی دیر کے بعد مجھے ایک آدمی نے وہاں سے نکال کر ایک کمبل میں لپیٹا۔ اور میں اس کے ہاتھوں میں سو گیا۔''

وہ کافی دیر مہمان خانے کی چھت کو گھورتا اور کچھ سوچتا رہا۔ کمرے میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ ڈاکٹر فاروقی مسلسل اس کے چہرے کی طرف دیکھتے رہے اور وہ کسی گہری سوچ میں گم، چھت کو گھورتا رہا۔

''اس سے پہلے کیا ہوا تھا؟'' ڈاکٹر فاروقی نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ ڈاکٹر فاروقی نے اس کے چہرے سے اندازہ لگایا کہ کوشش کے باوجود اسے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ وہ بھی خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ اس کے چہرے پر مختلف تاثرات ابھرے اور مٹتے رہے۔ یک دم انھیں محسوس ہوا کہ اس کا دماغ تھکنے لگا ہے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے:

''کوئی بات نہیں۔ جلد ہی تمھیں یاد آ جائے گا۔ فی الحال سوچنا چھوڑ دو۔ تم فکر نہ کرو۔ میں بہت جلد تمھیں ٹیکسا شلہ لے جاؤں گا۔ فی الحال تم آرام کرو۔ بل کہ کوشش کرو کہ سو جاؤ۔ جب تم اٹھو گے تو تمھارا ذہن تر و تازہ ہو گا۔ اور تمھیں فوراً یاد آ ئے جائے گا۔'' انھوں نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں یہاں کسی کو مت بتانا کہ میں بھی ٹیکسا شلہ سے آیا ہوں۔'' انھوں نے اپنا اوور کوٹ کھونٹی سے اتار کر پہنتے ہوئے کہا؛ اور وہ انھیں حیرانی سے دیکھتا رہا۔

(۸)

''میرا اندازہ ٹھیک تھا۔'' ڈاکٹر فاروقی نے زمان کے ساتھ ہونے والی گفتگو کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جب وہ کومے میں گیا تو اس کا لاشعور جاگ گیا اور اس نے ایک طویل خواب دیکھا۔ گویہ ایک عام سی بات ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب یہی خواب اس کا ماضی ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور اب بظاہر ہوش میں آ گیا ہے۔ لیکن اس کے نقطۂ نظر سے ایسا نہیں۔ اس نے جو کچھ بند آنکھوں سے دیکھا اور اب جو کچھ کھلی آنکھ سے دیکھ رہا ہے، اس کا ذہن ان دونوں میں تفریق نہیں کر پا رہا۔ چوں کہ وہ اپنا ماضی بھول چکا ہے اس لیے اس نے جو کچھ خواب میں دیکھا، وہ اس کے لیے مانوس اور جانا پہچانا ہے، لیکن اب جو کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے وہ اس کے لیے بالکل اجنبی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ زمان نے جو کچھ دورانِ خواب دیکھا وہ اسے حقیقت سمجھ رہا ہے!'' عزیز خان نے پریشانی اور تجسس سے پوچھا۔ باوجود اس کے کہ وہ ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو کو ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے سن چکے تھے، انھیں بالکل یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

''بالکل۔ دیکھیں۔ ہمارا کوئی بھی تجربہ ہمارے لیے تو حقیقی ہی ہوتا ہے، چاہے دوسروں کے لیے کتنا ہی غیر حقیقی کیوں نہ ہو۔''

''لیکن، یہ کیسے ممکن ہے؟ میں سمجھ نہیں پا رہا۔''

''سردار صاحب۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ ہم ایک امکان کی دنیا میں رہ رہے ہیں اور امکانات کی دنیا میں کسی بھی امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت کو کلی طور پر جاننا تو ویسے بھی ناممکن ہے۔ ہمارے پاس اس بات کی کیا دلیل ہے کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں یا سمجھ رہے ہیں وہ حقیقی ہے؟۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ حقیقت وہی ہو جو زمان دیکھ یا سمجھ رہا ہے۔ خیر میں خواہ مخواہ ایک فلسفیانہ بحث میں پڑ گیا۔ آپ خود اس بات کی تصدیق کر چکے ہیں کہ زمان نے جو باتیں کہی ہیں خاص کر حضرت سید احمد بریلوی کے سر کاٹنے، میجر ایبٹ سے نور خان کی ملاقات، پھر آپ کے لکڑ دادا ظفر علی خان کے بچپن میں مکان کے نیچے دب جانے اور پھر معجزانہ طور پر زندہ بچ نکلنے کے واقعات آپ کی خاندانی تاریخ کے

مطابق بالکل درست ہیں۔"

"لیکن بعض باتیں یا واقعات ایسے بھی تو ہیں کہ جن کا ہمارے خاندان کی تاریخ سے کوئی تعلق نہیں! جیسے یہ چٹان والا معمہ۔۔۔۔"

"آپ یوں کہیں کہ یہ آپ کے خاندان کے تاریخی ریکارڈ میں نہیں۔" ڈاکٹر فاروقی ان کی بات کاٹتے ہوئے گویا ہوئے۔

"آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا آپ کے خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔ ان واقعات اور باتوں کا بھی آپ کے آبا واجداد سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ ان واقعات کا، جن کی آپ نے تصدیق کی ہے۔"

"آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ چٹان پر کندہ یہ عبارت۔۔۔۔"

"بالکل۔ یہ آپ کے آباو اجداد ہی میں سے کسی نے کندہ کروائی تھی۔ کوئی پچاسی نوے پشت پہلے۔ آپ اسی شخص کی اولاد میں سے ہیں۔ اگر یہ کچھ دن اور کومے میں رہتا تو ممکن ہے اور بھی بہت پیچھے جاتا۔ شاید بابا آدم تک۔"

"حیرت انگیز بات یہ ہے کہ۔۔۔" ڈاکٹر فاروقی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔ "اس کے ذہن میں واقعات کی ترتیب بھی بالکل الٹی ہے۔ وہ ماضی میں ایک خاص ترتیب سے پیچھے کی طرف گیا ہے۔ جو منظر اس نے سب سے پہلے دیکھا وہ اس کا ماضی بعید اور جو سب سے آخر میں دیکھا وہ ماضی قریب ہے۔ وہ کوشش کے باوجود اس منظر کو اپنے ذہن میں نہیں لا پایا جو اس نے سب سے پہلے دیکھا تھا، اگر ہم کسی طرح، اسے وہ منظر یاد دلانے میں کامیاب ہو جائیں تو ممکن ہے اس کی یادداشت لوٹ آئے۔"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی نے عزیز خان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ آخری جملہ سنتے ہوئے عزیز خان کے چہرے پر امید کی ایک لہر سی ابھری۔ مگر وہ بدستور خاموش رہے۔

ڈاکٹر فاروقی نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ایک نظر نور خان کی تصویر پر ڈالی۔ پھر جوں ہی ان کی نظر اس کے بائیں طرف آویزاں ظفر علی خان کی تصویر پر پڑی ان کے ذہن سے وہ التباسی الجھن فوراً رفع ہوگئی، جو اسے پہلی مرتبہ دیکھنے سے ان کے ذہن میں پیدا ہوئی تھی:

"ظفر علی خان کے بارے میں، آپ کیا جانتے ہیں؟ میرا مطلب ہے آپ کی خاندانی روایات کیا کہتی ہیں۔ میں ان کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر فاروقی کے اس فوری سوال پر عزیز خان چونک اٹھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر فاروقی کی نظریں ان کے لکڑ دادا کی تصویر میں کچھ

تلاش کر رہی ہیں۔ وہ فوراً سمجھ گئے کہ ڈاکٹر فاروقی یہ سوال کیوں کر رہے ہیں۔لیکن خاموش رہے۔

''اگر آپ ان کے بارے میں کچھ بتا سکیں تو بہت بہتر ہوگا،ممکن ہے اس سے مجھے زمان کے کیس کو سمجھنے میں مدد ملے۔''ڈاکٹر فاروقی نے خیالوں ہی خیالوں میں تصویر کے خدوخال کا زمان کے چہرے کے نقوش سے موازنہ کرتے ہوئے کہا۔

''جس طرح ان کے چہرے کے نقوش زمان سے بہت مماثل ہیں۔''عزیز خان اپنی نظریں تصویر پر مرکوز کرتے ہوئے گویا ہوئے۔''میں نے اپنے دادا سے سنا ہے کہ ان کی طبیعت بھی زمان سے بہت ملتی تھی۔ سنا ہے ان پر جنون کے دورے پڑتے تھے،اور ایسی حالت میں وہ اسی غار پر جا کر بیٹھتے تھے ،جہاں گزشتہ بارہ سالوں سے زمان اپنا بیشتر وقت گزارتا رہا ہے اور۔۔۔۔۔۔''

انھوں نے ،ظفر علی خان کی پوری کہانی، جو انھوں نے اپنے دادا سے سنی تھی ،ڈاکٹر فاروقی کو سنا دی۔

(۹)

ڈاکٹر فاروقی رات بھر زمان اور ظفر علی خان کی شخصیت کے تلازمے آپس میں ملاتے اور مماثلتیں تلاش کرتے رہے۔ صبح وہ دیر سے جاگے اور دوبارہ اسی کام پر لگ گئے۔ مگر اب وہ ہر واقعے کے حوالے سے باقاعدہ نوٹس بھی لینے لگے تاکہ تجزیہ کرنے میں آسانی رہے۔ اس دوران میں ایک دومرتبہ انھوں نے عزیز خان سے دونوں کی زندگی کی کہانی باری باری دوبارہ بھی سنی۔ پھر انھوں نے یہی کہانی زمان کے سسر اور عزیز خان کے بھائی سے بھی سنی۔ جہاں جزئیات میں کچھ فرق محسوس ہوا، اسے بھی نوٹ کیا۔ عصر کے وقت وہ عزیز خان کے ساتھ چٹان کا معائنہ کرنے چلے گئے۔ شام تک وہیں بیٹھے اس حیرت انگیز واقعے کے حوالے سے تبادلہ خیال کرتے رہے۔ یوں پورا دن اسی میں گزر گیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد انھوں نے دن کو لیے ہوئے نوٹس پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالی:

''یقیناً زمان کے لاشعور میں بچپن میں مکان کے نیچے دبنے کے علاوہ بھی ظفر علی خان کے کچھ واقعات ضرور ہوں گے۔ دونوں کی شخصیت میں خاصی مماثلتیں ہیں۔ آبشار پر حسین لڑکی والا واقعہ اور غار سے وابستہ یادیں تو ضرور اس کے لاشعور میں ہونی چاہییں۔۔''

یہ سوچتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا، اسے انٹرنیٹ سے منسلک کیا اور اجتماعی لاشعور کے حوالے سے ژونگ اور دوسرے نفسیاتی سائنس دانوں کا نیٹ پر موجود مواد ڈاؤن لوڈ کیا اور صبح چار بجے تک اس کا مطالعہ کرتے رہے۔

اگلے دن ناشتے کے بعد انھوں نے غار پر جانے کا فیصلہ کیا۔ غار کے دولخت پتھریلے چبوترے پر پہنچ کر انھوں نے اس کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا۔ یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ غار کے چبوترے پر انسانی ہتھیلی کی لکیروں سے ملتی جلتی لکیریں موجود ہیں۔ اگرچہ چبوترہ دولخت ہو چکا تھا لیکن اس پر موجود لکیریں بآسانی دیکھی جاسکتی تھیں۔ وہ کافی دیر ان لکیروں کا مشاہدہ کرتے رہے۔

غار سے واپسی پر انھوں نے فرمان کے ذریعے زمان کو مہمان خانے میں بلوایا۔معمول کی گپ شپ کے بعد وہ آہستہ آہستہ اسی کہانی کی طرف آ گئے۔اس نے دو دن پہلے سنائی ہوئی کہانی دوبارہ سنائی اس فرق کے ساتھ کہ اس مرتبہ اس نے تمام واقعات خاصی تفصیل سے بیان کیے۔مگر مکان گرنے والے واقعے کے بعد ایک مرتبہ پھر اسے چپ سی لگ گئی۔ڈاکٹر فاروقی بھی کافی دیر خاموشی سے اس کے چہرے سے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ لگاتے رہے، پھر یک دم گویا ہوئے:

''اس سے پہلے تم کہاں تھے؟''

وہ بدستور خاموش رہا۔ڈاکٹر فاروقی نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کی یادداشت اس کا ساتھ نہیں دے رہی۔

''تمھیں کوئی لڑکی نہیں ملی تھی؟''ڈاکٹر فاروقی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے رازداری کے سے انداز میں پوچھا۔انھوں نے نوٹ کیا کہ لڑکی کے نام سے اس کے چہرے پر ایک مانوس سی لہر ابھری؛ اور اس نے آنکھ کی پتلیوں کو کچھ دیر ٹھہرا کر کچھ سوچا۔

''ہاں ہاں۔اس سے پہلے۔۔۔۔مجھے ایک لڑکی ملی تھی۔بالکل پری جیسی۔''

''وہ ایک آبشار کے کنارے کھڑی تھی۔وہ بہت خوبصورت تھی۔اس وقت میں ایک جھیل کے کنارے لیٹا ہوا تھا۔لیکن جب میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچا تو وہ غائب ہو چکی تھی۔میں نے اسے بہت تلاش کیا۔لیکن وہ مجھے نہیں ملی۔پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''میں جنگل میں گھوڑے کو ادھر ادھر بھگاتا رہا۔مگر وہ نہیں ملی۔پھر میری ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے ہوئی۔جو درخت کاٹ رہے تھے۔مجھے بس اتنا یاد ہے کہ انھوں نے مجھے چھوٹے سردار جی کہہ کر پکارا تھا۔وہ مجھے ایک گھوڑے پر سوار کر کے کہیں لے گئے تھے۔۔۔معلوم نہیں کہاں۔بس مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم ایک دریا کو عبور کر کے دوسرے میں داخل ہوئے تھے۔''اس کا ذہن الجھنے لگا۔

''اس سے پہلے؟ ہاں ہاں۔یاد کرنے کی کوشش کرو۔''ڈاکٹر فاروقی نے کہا۔

وہ کافی دیر خاموش رہا اس دوران میں اس کے چہرے پر مختلف رنگ آتے جاتے رہے۔ڈاکٹر فاروقی ان رنگوں سے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگاتے رہے۔

''اس سے پہلے بس اندھیرا تھا اور برف۔۔۔'' وہ دوبارہ خاموش ہو گیا۔

''اس سے پہلے؟'' ڈاکٹر فاروقی نے بغیر کوئی وقفہ دیے سوال داغا۔

وہ خاموشی سے انھیں گھورتا رہا۔

''یاد کرو۔ ہاں ہاں یاد کرو۔ ایک غار کا چبوترا۔ اس پر انسانی ہتھیلی سے مماثل لکیریں۔۔

ہتھیلی کا نام سنتے ہی اس نے بلا ارادہ اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کھولی اور کافی دیر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اسے اپنے دماغ میں خالی پن کا احساس ہوا۔ اسے لگا جیسے اس کا دماغ ہر طرح کے جذبے اور خیال سے خالی ہے۔ بالکل خالی۔ ہر طرف اندھیرا ہے۔ اور بس اندھیرا۔ وہ اس اندھیرے میں محوِ سفر ہے اور کہیں اوپر کو اُٹھ رہا ہے۔ اسے اپنا وجود پھولتا ہوا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی کسی غبارے میں آہستہ آہستہ ہوا بھرنا شروع کر دے۔ اس کا وجود اوپر کو اٹھتا رہا، اٹھتا رہا۔ پھیلتا رہا، پھیلتا رہا۔

وہ دیر تک وجود کے پھیلاؤ، اور نامعلوم بلندی کی طرف اٹھاؤ کو محسوس کرتا رہا۔

یک دم اسے لگا جیسے اُٹھاؤ اور پھیلاؤ میں سے کوئی ایک عمل ختم ہونے کو ہے۔ وہ کافی دیر تک اس پر غور کرتا، اور یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ کونسا عمل؟ باریک بینی سے غور کرنے پر اسے محسوس ہوا کہ وہ اس حوالے سے غلطی پر ہے۔ ان دونوں میں سے کوئی عمل ختم نہیں ہو رہا بلکہ یہ دونوں عمل آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں۔

پھر ایک ایسا وقت آیا۔ جب یہ دونوں عمل ایک دوسرے سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو گئے۔ اتنے ہم آہنگ کہ ان میں تمیز کرنا بھی مشکل ہو گیا۔

''میں کب تک یوں ہی اڑتا رہوں گا۔'' اس نے سوچا۔ اسے یکسانیت سی ہونے لگی۔ اس نے اکتا کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کے دماغ میں روشنی کا ایک زوردار سا جھماکا گھسا اور اس کے سارے وجود کو چکا چوند کر گیا۔

''چاندنی میں برف باری۔۔۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

ڈاکٹر فاروقی، جو اس کے چہرے کی طرف مسلسل دیکھ رہے تھے، کو لگا جیسے اس کا سر چکرانے لگا ہے۔ انھوں نے بھاگ کر اسے سہارا دیا۔ عزیز خان اور فرمان کو بلایا۔ ان تینوں نے اسے صوفے سے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔

ساتواں باب

خواب اور حقیقت کے درمیان

(۱)

اب کے زمان کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو حویلی کے مہمان خانے میں پایا۔اس کا دماغ خیالات سے یکسر خالی تھا۔وہ کافی دیر یونہی لیٹا چھت کو گھورتا اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے بس اتنا یاد آسکا کہ رات کو وہ غار پر، برف اور چاندنی کے ملاپ سے جنم لینے والے طلسمی منظر کا نظارہ کرنے گیا تھا۔

''لیکن میں حویلی میں کب واپس آیا؟'' یک دم اسے خیال آیا اور پھر وہ کافی دیر تک اس بارے میں سوچتا رہا۔لیکن اس کی یادداشت میں سیلن زدہ اندھیرے کے سوا کچھ نہ ابھرا۔

''رات کو چاندنی کھلی برف کا نظارہ خوب تھا۔'' برف کا خیال آتے ہی اس کے وجود میں ایک سرد لہر دوڑی اور اس نے ایک جھرجھری سی لی۔جھرجھری لیتے ہوئے اسے محسوس ہوا کہ رات کو پاجاموں کی جو تہہ اس نے اپنے بدن پر چڑھائی تھی، وہ موجود نہیں ہے۔اس نے اپنے بدن کو ٹٹولا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔اس نے دیکھا کہ وہ گرمیوں کے ہلکے پھلکے لباس میں ملبوس ہے۔

''میں نے لباس کب بدلا؟''

اس نے حیرت اور پریشانی سے اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو اسے محسوس ہوا کہ کمرے کی شکل وصورت اور وہاں رکھے سامان کی ترتیب بھی بدلی ہوئی ہے۔بہت سی ایسی چیزیں بھی کمرے میں موجود تھیں جن کا گزشتہ رات تک کوئی وجود ہی نہیں تھا۔اس پر مستزاد یہ کہ تمام چیزیں ایک خاص ترتیب اور سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔حالاں کہ وہ انھیں الٹا پلٹا چھوڑ کر رات کو غار پر گیا تھا۔پھر اس کی نظر پلنگ کے ساتھ رکھے ہوئے میز پر پڑی دوائیوں کی طرف گئی اور وہ کافی دیر تک انھیں حیرانی سے دیکھتا رہا۔

ابھی وہ حیرانی سے اس تبدیلی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے مانوس آوازیں سنائی دینے لگیں۔ابتدا میں یہ آوازیں کچھ دبی دبی سی تھیں جیسے بہت دور سے آرہی ہوں، لیکن جب اس نے

بغور سنا تو اسے معلوم پڑا کہ آوازیں اسی حویلی کے دوسرے حصے سے آرہی ہیں۔

"شاید میرے کان بج رہے ہیں۔" اس نے سوچا۔

یک دم اسے اپنے ابا جی کی آواز سنائی دی۔ آواز خاصی واضح تھی، وہ کسی سے کچھ کہہ رہے تھے۔

"میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" یہ سوچتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ پر چٹکی کاٹنے ہی کو تھا کہ اسے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے اپنے کان قدموں کی آہٹ پر لگا دیے۔ آہٹ ہر آن واضح اور تیز ہو رہی تھی۔ پھر یہ آہٹ اسے دروازے پر سنائی دی اور اس کے بدن میں خوف کی ایک لہر سی تیر گئی۔

اس نے خوف زدہ آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا بھائی فرمان اس کے سامنے کھڑا بے گانگی سے اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر خوشی کے آثار ہیں لیکن اس خوشی میں بھی ایک اوپرا پن ہے۔ وہ کچھ دیر کھڑا اسے اوپری نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر تیز تیز قدموں سے واپس حویلی کے اندرونی حصے کی طرف پلٹ گیا۔

ابھی وہ اس ان ہونی کو سمجھنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ اس کے ابا جی اور ڈاکٹر مسیح الدین فاروقی کمرے میں داخل ہوئے۔ فرمان بھی ان کے ساتھ تھا۔

"یہ لوگ کب آئے؟" اس نے سوچا۔

زمان انھیں حیرت اور پریشانی سے، جب کہ وہ تینوں اسے بے گانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اسے سب سے زیادہ حیرت اپنے والد کے دوست ڈاکٹر فاروقی کی موجودگی اور ان کے عجیب وغریب اور بے ڈھنگے سے اوور کوٹ پر تھی۔ وہ اپنے اسلام آباد والے گھر میں ان سے سینکڑوں بار مل چکا تھا۔ لیکن یہاں نور آباد میں ان کی موجودگی کسی معمے سے کم نہیں تھی۔

حیرت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا۔ اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر فاروقی نے اس کے ابا جی کو کوئی معنی خیز اشارہ کیا اور پھر تینوں دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی اس نے اپنے بائیں ہاتھ پر چٹکی کاٹنا چاہی۔

"آپ لوگ جائیں۔ میں ذرا اس سے گفتگو کر کے صورت حال معلوم کرتا ہوں۔" اس نے چٹکی کاٹنے کے لیے دایاں ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کے کانوں سے ڈاکٹر فاروقی کی مبہم سی سرگوشی ٹکرائی، جو اس کے والد اور بھائی سے کوئی رازدارانہ گفتگو کر رہے تھے۔ اگلے ہی لمحے ڈاکٹر فاروقی دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے۔

''کیسے ہو؟''

وہ خاموش رہا اور انھیں حیرت سے دیکھتا رہا۔

''میں غار سے کب واپس آیا؟ لباس کب تبدیل کیا؟ یہ لوگ کب آئے؟'' وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ڈاکٹر فاروقی اپنا اوور کوٹ اتار کر کھونٹی پر ٹانگ چکے تھے اور اب وہ اس بھی زیادہ پراسرار اور عجیب وغریب لباس میں ملبوس تھے۔

''ڈاکٹر فاروقی نے یہ عجیب سا لباس کیوں پہن رکھا ہے؟'' اس کا ذہن الجھنے لگا۔

''کچھ نروس سا لگ رہا ہے۔ لگتا ہے بے ہوش ہونے کے بعد وہ اپنی کہی ہوئی ساری باتیں بھول چکا ہے۔ ساری کہانی نئے سرے سے شروع کرنا پڑے گی۔'' ڈاکٹر فاروقی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ کافی دیر تک کمرے میں خاموشی سرسراتی رہی۔ اس خاموشی میں ایک خاص طرح کی پراسراریت تھی۔

''میں ٹیکسا شلہ جا رہا ہوں۔ تم نہیں جاؤ گے؟ فرمانِ مقدس کے چٹان پر کندہ کرانے کی رپورٹ پیش کرنے۔'' اس کے کانوں میں ڈاکٹر فاروقی کے ناقابلِ فہم اور اسرار زدہ الفاظ گونجے۔ ان الفاظ سے کہیں زیادہ پراسراریت ان کے لہجے میں تھی۔

وہ اس عجیب وغریب جملے پر حیرت زدہ سا ہو گیا اور خوف کی ایک تیز لہر سنسناتی ہوئی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ خوف سے اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے امنڈ رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ یہ قطرے اس کے ہر مسام سے امنڈنے لگے۔

ڈاکٹر فاروقی نے دیکھا کہ وہ اب پہلے سے بھی زیادہ نروس ہو رہا ہے۔

''سرِ دست اس سے کوئی گفتگو مناسب نہیں۔'' ڈاکٹر فاروقی یہ سوچتے ہوئے اٹھے، ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور باہر نکل گئے۔

اس نے اپنے بائیں ہاتھ پر چٹکی کاٹی۔ ''سی'' کی ایک ہلکی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اسے یہ سوچ کر ٹھیس سی پہنچی کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا۔

اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا اور کمرے میں کل رات کے بعد ہونے والی تبدیلیوں کو حیرت اور خوف سے دیکھنے لگا، اور دیر تک دیکھتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ خوف اس کے وجود سے نکل کر آہستہ آہستہ کمرے میں موجود ہر چیز کو اپنے گھیرے میں لے چکا ہے۔

(۲)

''میرا خیال ہے کہ اب کے بے ہوش ہونے سے اس کی ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔یا اس نے کوئی نیا خواب دیکھا ہے اور وہ ابھی تک اس سے باہر نہیں آیا۔اس کا اندازہ مجھے اس کے رویے سے ہوا۔اس نے میرے لباس، ٹیکسا شملہ اور فرمان مقدس کے ذکر پر مجھے حیرت اور خوف سے دیکھا اور خاصا نروس دکھائی دیا۔لیکن یہ اس وقت تک ایک مفروضہ ہی ہے جب تک وہ خود کوئی بات نہیں کرتا۔اس کی موجودہ ذہنی حالت کا اندازہ اس سے گفتگو کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔''ڈاکٹر فاروقی نے کہا۔

کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی سرسراتی رہی۔گہری، الم ناک اور پراسرار خاموشی۔

'' آپ فکر نہ کریں۔خدا بہتر کرے گا۔میں نے اسپتال سے مزید کچھ دن کی چھٹی لے لی ہے۔ایک دو دن دیکھتے ہیں۔اگر ضرورت پڑی تو اسے اسپتال منتقل کر دیں گے۔''ڈاکٹر فاروقی دوبارہ گویا ہوئے۔

''جیسے آپ مناسب سمجھیں۔''عزیز خان نے کہا۔

''فی الحال اس سے کسی قسم کی کوئی بات نہ کی جائے اور نہ ہی اس کے کمرے میں زیادہ آمدورفت رکھی جائے۔وہ سکتے کے سے عالم میں ہے۔''ڈاکٹر فاروقی نے مزید اضافہ کیا۔عزیز خان نے ہامی بھرنے کے انداز میں گردن ہلائی۔

(۳)

زمان جوں جوں اس اچانک تبدیلی کے بارے میں سوچتا اس کی پریشانی اور الجھن میں اضافہ ہوتا جاتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اچانک کیسے ہوگیا۔ سب سے زیادہ حیرانی، اسے ڈاکٹر فاروقی کی یہاں موجودگی، ان کے عجیب وغریب لباس اور ان کی پراسرار گفتگو پر تھی۔

یک دم اسے یاد آیا کہ گذشتہ رات اس نے دُبِ اکبر (بگ ڈپر) کے منظر میں ایک تبدیلی دیکھی تھی، جو اچانک رونما ہوئی تھی۔ وہ کافی دیر تک ٹکی باندھے بگ ڈپر کو دیکھتا رہا تھا، جب اس نے لحظہ بھر کے لیے پلک جھپکنے کے بعد منظر دوبارہ دیکھا تھا تو اس میں سے ستاروں کا ایک پورا جھرمٹ پل بھر میں غائب ہو چکا تھا۔

''کیا بگ ڈپر کے منظر اور کمرے کی ہیئت میں تبدیلی کے درمیان کوئی روحانی علامت پوشیدہ ہے؟'' اس نے سبب اور علت کے گورکھ دھندے سے نکل کر سوچا۔

''ان دونوں واقعات کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔'' اس نے خود ہی نتیجہ نکالا اور ایک لمبی سانس بھری۔

''ہوسکتا ہے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی ایسا ربط ہو، جسے میں نے نظر انداز کر دیا ہو۔ یا میری سمجھ سے بالاتر ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بگ ڈپر کے منظر میں تبدیلی دراصل کمرے میں ہونے والی تبدیلی کا اشارہ ہو۔'' اس نے منطقی انداز اختیار کیا۔

''لیکن میرے گھر والے؟ یہ سب اچانک کہاں سے آ گئے؟'' اس نے سوچا۔ ''ممکن ہے رات کو جب میں غار پر بیٹھا، چاندنی میں برف پوش منظر کا نظارہ کر رہا تھا، یہ سب لوگ یہاں آ گئے ہوں!''

''۔۔۔اور ڈاکٹر فاروقی، جو اس سے پہلے کبھی یہاں آئے ہی نہیں۔ پھر ان کا عجیب وغریب لباس، جیسے قبل از مسیح کے اشرافیہ کا؛ وہ اس لباس میں یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟ اور ان کا یہ کہنا کہ وہ ٹیکسا شلہ سے آئے ہیں۔ یہ سب خواب سا ہے۔'' یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنے بائیں ہاتھ پر ایک

مرتبہ پھر چٹکی کاٹی۔

''ممکن ہے آدمی خواب میں بھی چٹکی کاٹ سکتا ہو۔'' اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا جس کے باہر اوس میں بھیگا گھنا اور گہرا اندھیرا تھا۔ جیسے اس کے کھلے پٹوں کے آگے گاڑھے سیاہ رنگ کی دیوار کھڑی کر دی گئی ہو۔

''برفانی راتوں میں اندھیرا اتنا گھنا اور گہرا کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ اس سوال پر غور کر رہا تھا کہ اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور اگلے چند ہی لمحوں میں فرمان اس کے لیے کھانا لے کر آ گیا۔ کھانا دیکھ کر اسے اپنے معدے میں ایک اشتہا سی محسوس ہوئی۔ فرمان کھانا میز پر رکھ کر بغیر کچھ کہے ،کمرے سے نکل گیا۔

اس نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور برتن دوبارہ میز پر رکھ کر سوچنے لگا:

''خواب میں بھی آدمی کو بھوک لگتی ہے اور اتنا لذیذ کھانا دستیاب ہو سکتا ہے؟'' لذیذ کھانے سے اس کا دھیان فوری طور پر اپنی ماں کی طرف گیا۔ جس کے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے اسے ہمیشہ مرغوب رہے تھے۔ اسے یاد آیا کہ وہ اپنے دوسرے بچوں کی نسبت اس کا خیال بھی زیادہ رکھتی تھی۔ یوں کہ جیسے وہ اب بھی کوئی چھوٹا سا بچہ ہو، حالاں کہ باقی دونوں بہن بھائی اس سے چھوٹے تھے اور فرمان تو بہن سے بھی چھوٹا تھا۔ سب سے چھوٹا۔

''کمرے کی ہیئت میں تبدیلی کا بگ ڈپر کے منظر میں تبدیلی سے ضرور کوئی گہرا تعلق ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک رات میں سب کچھ بدل جائے۔'' اس نے کمرے کا بغور جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔ اس نے دیکھا کہ صوفہ سیٹ، میز، کرسیاں، آرائش کا ساز و سامان اور پردے سب بدل چکے تھے۔ یہاں تک کہ باپ اور بھائی کا رویہ بھی۔ باپ اور چھوٹے بھائی دونوں نے اسے کسی اجنبی کی طرح دیکھا تھا۔ باپ کی تو اس نے محض ایک جھلک ہی دیکھی تھی لیکن فرمان کو پچھلے دو اڑھائی گھنٹوں میں وہ تین مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ تینوں مرتبہ اس نے نہ تو اس سے کوئی بات کی اور نہ کسی قسم کی گرم جوشی دکھائی تھی۔ سوائے پہلی مرتبہ کے، جب اس کے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی لکیر ابھری تھی، باقی دونوں مرتبہ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے خالی تھا۔

''اور پھر ڈاکٹر فاروقی عجیب و غریب لباس پہنے یہاں کیا کرنے آئے ہیں۔ ٹیکسلا شملہ اور فرمان مقدس ۔۔۔ یہ کیا معمہ ہے؟'' اس نے سوچا۔

''ممکن ہے یہ سب محض میرا وہم ہو۔ یہاں کوئی آیا ہی نہ ہو۔ سب لوگ اسلام آباد میں

ہوں اور مجھے یوں ہی ان کی یہاں موجودگی کا احساس ہو رہا ہو۔ بسا اوقات آدمی خطائے حس یا فریب نظر کا شکار ہو جاتا۔ کہیں میں بھی۔۔۔۔؟"

"لیکن یہ کھانا، جو میں نے ابھی کھایا ہے؟"

"ہو سکتا ہے میں نے نہ کھایا ہو۔ یوں ہی کھانا کھانے کا التباس ہو رہا ہو۔" اس نے اپنی زبان ہونٹوں پر پھیری تو اسے اپنے ہونٹوں پر تازہ کھائے ہوئے کھانے کا ذائقہ محسوس ہوا۔ اسی اثنا میں حویلی کے دوسرے حصے سے آوازیں آنے لگی۔ جن میں سے اس کے باپ کی آواز نسبتاً زیادہ واضح تھی۔ وہ کافی دیر دیوار سے کان لگائے ان کی آپس میں ہونے والی گفت گو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن باہر چلنے والی تیز ہوا کے شور کی وجہ سے اس کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا تھا۔

یک دم اسے یہ آوازیں گڈمڈ سی ہوتی معلوم پڑیں۔ جیسا ایک ہی آدمی آواز بدل بدل کر بول رہا ہو۔ رفتہ رفتہ اسے یہ آواز ڈراؤنی لگنے لگی۔ ہوا کے تیز جھونکے نے کھڑکی کے پٹ ہلائے تو خوف کی ایک تیز لہر اس کے ریشے ریشے میں اتر گئی۔

گزشتہ بارہ سالوں میں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی حویلی میں بسر کیا تھا۔ اس دوران میں وہ زیادہ تر یہاں اکیلا ہی رہا تھا۔ خاص کر راتوں کو۔ لیکن وہ کبھی خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ ان راتوں میں بھی نہیں جو پوری کی پوری اس نے غار کے چبوترے پر گزاریں تھیں۔ لیکن آج نہ جانے کیوں اسے زندگی میں پہلی بار ڈر لگ رہا تھا۔ اس کی نظر دوبارہ کھڑکی کی طرف گئی جہاں سے سیلن زدہ اندھیرا جھانک رہا تھا۔ وہ اٹھا اور کھڑکی کی طرف بڑھا، اسے بند کرنے کی غرض سے، جوں ہی اس نے کھڑکی کے پٹوں کی طرف ہاتھ بڑھائے، وہ یہ دیکھ کر وہیں منجمد ہو کر رہ گیا کہ بستی پر سے برف کی چادر غائب ہے۔

"برف۔۔۔ کہاں ں ں۔۔۔ گئی؟" وہ بہ مشکل اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ اسے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کوئی اس کے کمرے کی طرف آ رہا تھا۔ وہ ایک کوندے کی طرح بستر کی طرف لپکا۔ اگلے ہی لمحے فرمان کمرے میں داخل ہوا، اسے اجنبیت بھری آنکھوں سے دیکھا اور برتن سمیٹنے لگا۔ یک دم اسے لگا جیسے وہ اس کا بھائی نہیں محض ایک دو ابعادی سایہ ہے۔ جس کا تیسرا بعد غائب ہے۔ سائے نے برتن اُٹھائے اور پلک جھپکنے میں دروازے سے باہر نکل کر اندھیرے میں معدوم ہو گیا، تاہم اس کے قدموں کی آواز اسے سنائی دیتی۔ سائے کے قدموں کی آہٹ کے تصور سے اس کا وجود تپنے لگا اور اسے سخت سردی کا احساس ہوا اس نے پائنتی کی طرف پڑا ہوا کمبل اوڑھا اور خوفناک سائے کے قدموں کی آہٹیں سنتے سنتے سو گیا۔

(۴)

اسے اسپتال لائے آج تیسرا دن تھا۔اس دوران میں اس کا بیشتر وقت نیم بے ہوشی کی حالت میں گزر رہا تھا۔اس پر ایک خوابیدگی سی طاری تھی ۔اس کی یادداشت لاکھوں ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی ،جیسے کسی چٹان کو دھماکے سے اڑا کر ذروں میں تحلیل کر دیا گیا ہو اور سوائے گاڑھی دھول کے کچھ بھی سجھائی نہ دے رہا ہو۔اس دوران میں جب بھی اس کی آنکھ کھلتی تو اس کی نظروں کے آگے سائے سے لہراتے اور وہ مارے خوف کے دوبارہ آنکھیں بند کر لیتا۔کچھ دیر تک اسے اپنے اردگرد بیٹھے سایوں کی آوازیں سنائی دیتی رہتیں اور پھر وہ دوبارہ ڈراؤنے خوابوں کی دنیا میں چلا جاتا۔تا آں کہ ایک وقت ایسا آیا ، جب خواب اور حقیقت اس کے لیے ایک ہو گئے۔دونوں کے درمیان تمیز کرنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔

کل شام کو جب اس کا بخار اترا اور اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے اپنے آپ کو اسپتال کے ایک کمرے میں پایا۔اسے یاد آیا کہ جب وہ غار پر تھا تو اچانک زلزلہ آ گیا تھا۔درخت زور زور سے ہل رہے تھے اور چٹانی چبوترے میں دراڑ پڑ گئی تھی ۔اس نے اپنی بائیں ہتھیلی دیکھی جہاں زخم کا باریک سا نشان تھا۔وہ سمجھ گیا کہ وہ وہاں بے ہوش ہو گیا تھا اور اسی حالت میں اسے یہاں منتقل کیا گیا۔وہ انھی خیالوں میں گم تھا کہ اس کے ہوش میں آنے کی اطلاع پا کر عزیز خان کمرے میں داخل ہوئے۔اس نے دیکھا کہ اس کے ابا جی پہلے کی نسبت خاصے کمزور سے دکھائی دے رہے ہیں۔جوں ہی وہ اس کے بستر کے پاس پہنچے خلافِ توقع انھوں نے اسے سینے سے نہیں لگایا۔

"لگتا ہے ابا جی مجھ سے ناراض ہیں۔ہونا بھی چاہیے۔میں نے زندگی میں انھیں صرف دکھ ہی تو دیے۔کبھی ان کا کہا نہیں مانا ، ہمیشہ اپنی ہی منوائی۔" وہ آب دیدہ سا ہو گیا۔عزیز خان کو لحظہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی سی محسوس ہوئی ۔انھیں لگا جیسے زمان کی آنکھوں سے اوپرا پن غائب ہو چکا ہے اور اب ان میں شناسائی کی چمک عود کر آئی ہے۔لیکن انھیں اس کا پوری طرح یقین نہیں تھا لہٰذا خاموش رہے اور کن آکھیوں سے اسے دیکھتے رہے۔

''ابا جی۔ مجھے معاف کردیں میں نے آپ کو بہت دکھ دیے۔'' جوں ہی یہ جملہ عزیز خان کے کانوں سے ٹکرایا ان پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔انھیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ان کے بیٹے نے انھیں پہچان لیا ہے۔

''ایسا نہ کہو بیٹے۔ میں تو تیری باتیں سننے کو ترس گیا ہوں۔'' وہ فرطِ جذبات میں اس سے لپٹ گئے اور دیر تک اسے چومتے رہے۔

انھوں نے اپنا موبائل نکالا اور فرمان اور ڈاکٹر فاروقی کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔قریباً آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں بھی وہاں پہنچ گئے۔دونوں اس سے انتہائی محبت والہانہ سے ملے اور اس کے قریب بیٹھ گئے۔

''انکل۔ میں نے ایک طویل،خوفناک اور عجیب وغریب خواب دیکھا ہے۔اس میں آپ کا کردار بڑا عجیب وغریب ہے۔'' ڈاکٹر فاروقی چونکے۔

''میں نے دیکھا کہ میں حویلی کے مہمان خانے میں سویا ہوا ہوں۔پھر میری آنکھ کھلتی ہے تو وہاں کا سارا فرنیچر تبدیل ہوا ہوا ہوتا ہے۔ پہلے فرمان آتا ہے مجھے اوپری اوپری نظروں سے دیکھتا ہے اور چلا جاتا ہے۔پھر ابا جی،فرمان اور آپ کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔آپ نے بڑا سا اوورکوٹ پہنا ہوا ہے۔لحہ بھر مجھے دیکھنے کے بعد آپ تینوں کمرے سے چلے جاتے ہیں۔باہر آپس میں کوئی مشورہ کرتے ہیں اور پھر آپ اکیلے کمرے میں آتے ہیں اور اپنا اوورکوٹ اتارتے ہیں تو نیچے آپ نے اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب لباس پہنا ہوتا ہے پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ٹیکسا شلہ جا رہا ہوں۔تم نہیں جاؤ گے۔فرمانِ مقدس کے چٹان پر کندہ کرانے کی رپورٹ پیش کرنے۔میں آپ کا یہ جملہ سن کر خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔آپ کچھ سوچتے ہیں اور اوورکوٹ دوبارہ پہن کر کمرے سے نکل جاتے ہیں۔کافی دیر کے بعد فرمان کھانا لے کر آتا ہے۔میں کھانا کھاتا ہوں۔پھر وہ دوبارہ برتن اٹھانے آتا ہے تو مجھے کسی ڈراؤنے سائے کی طرح لگتا ہے۔اسے دیکھ کر میں ڈر جاتا ہوں اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔آگے کا سارا خواب گڈمڈ سا ہے،جس میں کوئی بھی منظر واضح نہیں ہے۔بس آوازیں ہیں اور سائے ہیں۔عجیب وغریب آوازیں اور عجیب وغریب سائے۔''

ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔

''مجھے اچھی طرح یاد ہے آپ کا لباس قدیم اشرافیہ کے لباس جیسا تھا۔بالکل ویسا جیسا قبل از مسیح کی تاریخ پر بنائی جانے والی فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔''

''انکل! آپ تو ماہرِ نفسیات ہیں ناں۔ آپ میری تحلیل نفسی کیجیے۔ ممکن ہے انسانی نفسیات کی کوئی نئی گرہ آپ کے ہاتھ لگے۔'' اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا۔ پھر انھیں سنجیدہ دیکھ کر خود بھی سنجیدہ ہو گیا۔

''اب تو تمھارے ساتھ ساتھ مجھے اپنی بھی تحلیل نفسی کرنا پڑے گی۔ اس خواب میں سب سے عجیب بات تو میرا لباس ہی تھا ناں۔ کہیں میری شکل تو نہیں۔۔'' اسے سنجیدہ دیکھ کر انھوں نے بھی جواباً مذاق کیا۔ پھر سارے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

(۵)

''میرا خیال ہے کہ وہ اپنی لاشعوری حالت سے اسی دن نکل آیا تھا جب میں نے دوسری بار اس سے طویل مکالمہ کیا تھا اور وہ بے ہوش گیا تھا۔ دوبارہ جب اسے ہوش آیا تو وہ نہ صرف کومے کے دوران میں دیکھا ہوا سارا خواب بھول چکا تھا بلکہ اپنی اس ذہنی حالت کو بھی؛ جس میں وہ کومے کے بعد کئی مہینے رہا۔ اس کے ذہن میں آخری منظر زلزلے کا تھا جب وہ غار پر تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد جب اس نے کمرے کی ہیئت میں تبدیلی دیکھی اور پھر ہمیں دیکھا تو اس کا ذہن دوبارہ الجھ گیا، خاص کر میرا لباس دیکھ کر۔ اس کا ذہن اتنی بڑی تبدیلی کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ لیکن میں اس کا اندازہ نہیں کر پایا۔ الٹا اس سے عجیب وغریب سوال کر ڈالا۔ جس سے اس کے دماغ کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ اب اس حقیقت کو خواب سمجھ رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ زلزلے والی رات کے بعد ابھی ہوش میں آیا ہے۔'' ڈاکٹر فاروقی نے زمان کی ذہنی حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے عزیز خان سے کہا۔

''۔۔۔ اور ہاں۔ گھر کے ہر فرد کو بتا دیں کہ وہ سرِ دست اس کی گزشتہ ذہنی حالت کے بارے میں اسے کچھ نہ بتائیں۔ اگر اسے ابھی پتا چل گیا تو وہ اس کے بارے میں سوچے گا۔ اس سے، اس کے دماغ پر زور پڑے گا، جس سے کچھ مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ جو کچھ سمجھ رہا ہے اس کے مطابق اس سے بات چیت کریں۔ جب وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے تو پھر اسے بتانے میں شاید کوئی حرج نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ لیکن اب تو زلزلے کو گزرے چار مہینے ہونے کو آئے۔ کیا اس کا ذہن قبول کر لے گا کہ وہ اتنے عرصہ بے ہوش رہا ہے؟'' عزیز خان کو تشویش سی ہونے لگی۔

''یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں اس حوالے سے اس کا ذہن تیار کرلوں گا۔'' ڈاکٹر فاروقی نے کہا۔

دو دن بعد اسے یہ بتا کر گھر منتقل کیا گیا کہ وہ لگ بھگ چار ماہ مسلسل کومے میں رہنے کے بعد ہوش میں آیا ہے۔ وہ اس پر حیران بھی تھا اور مسرور بھی۔ لیکن اتنے طویل عرصے کے مقابلے میں اسے اپنا

خواب بہت مختصر لگا۔ وہ جانتا تھا کہ منٹوں میں دیکھا ہوا خواب گھنٹوں کو محیط ہوتا ہے۔

''اس کا مطلب ہے میں نے جو خواب دیکھا اس کا طبعی دورانیہ چند منٹ ہی رہا ہوگا باقی تمام عرصہ میرا دماغ خوابوں سے تہی رہا۔'' اس نے رات کو سونے سے پہلے سوچا۔

(۶)

’’لگتا ہے زلزلہ بہت شدید تھا۔‘‘ زمان نے میدان کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر چٹان کو دیکھتے ہوئے سوچا، جو میدان کے آخری سرے پر ایستادہ ہونے کے بجائے نیچے کھائی میں اوندھے پڑی ہوئی تھی۔

وہ لگ بھگ گیارہ ماہ کے بعد نور آباد آیا تھا۔ اسپتال سے گھر منتقلی کے بعد اس نے سات ماہ اسلام آباد والے گھر میں ہی گزارے تھے۔ اب وہ گزشتہ کئی دنوں سے یہاں آنے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ لیکن اس کے اباجی نے یہ کہہ کر کہ ابھی وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوا، اسے یہاں آنے کی اجازت نہیں دی تھی، اور وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اب وہ ان کی اجازت کے بغیر یہاں آئے۔ پچھلے ہفتے جب اس نے بہت ضد کی تو سب لوگ یہاں آنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن اس سے پہلے فرمان کو کچھ ضروری ہدایات دے کر نور آباد بھیجا گیا۔ اس نے آتے ہی گاؤں کے تمام لوگوں کو حویلی طلب کیا اور انھیں زمان کی ذہنی حالت سے آگاہ کیا۔ ہر شخص نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ زمان سے اس کی گذشتہ ذہنی حالت کے بارے میں کوئی گفت گو نہیں کرے گا۔ پھر سب نے مل کر حویلی بالخصوص مہمان خانے میں موجود نیا فرنیچر، پرانے فرنیچر سے تبدیل کر دیا۔ پرسوں عزیز خان اپنے خاندان سمیت یہاں منتقل ہوئے تو زمان کو خصوصی طور پر مہمان خانہ دکھایا گیا، مگر اس طرح کہ اسے گمان تک نہ گزرے کہ اس میں کوئی تبدیلی کرائی گئی ہے۔ جب زمان نے مہمان خانے کی سیٹنگ پر نظر دوڑائی تو اسے تسلی سی ہوئی کہ پورا کمرہ ویسا ہی ہے جیسا زلزلے والی رات، وہ اسے چھوڑ کر، غار پر، چاندنی میں برف کا نظارا کرنے گیا تھا۔ لیکن چٹان والے معاملے کی طرف کسی کا دھیان ہی نہیں گیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ یہاں میدان میں پہنچا تو اسے کچھ اجنبیت کا سا احساس ہوا۔ اسے لگا جیسے میدان میں کوئی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ وہ کافی دیر میدان کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ میدان کے پہاڑ والے سرے سے پھوٹتے چشمے کا پانی بدستور بہہ رہا ہے۔ اس کی روانی اب بھی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔ پھر اس نے اپنی نظریں کٹھے (پانی کی نالی) پر مرکوز کر لیں اور انھیں بہتے پانی کے

ساتھ آہستہ آہستہ میدان کے آخری سرے کی جانب لے آیا جہاں سے وہ ایک آبشار کی صورت نیچے گرنے کے بجائے ایک چکر کھاتی نالی کے ذریعے دوبارہ برساتی نالے میں چھوڑا گیا تھا۔اس نے عین اس جگہ پر کھڑے ہوکر، جہاں سے پانی ایک آبشار کی صورت نیچے گرا کرتا تھا، کھائی میں جھانکا اور اسے اس اجنبیت کی وجہ معلوم ہوگئی۔اس نے دیکھا کہ چٹان، جو پہلے میدان کے سرے پر ایستادہ ہوا کرتی تھی، نیچے کھائی میں لڑھک چکی ہے۔

چٹان کو اس حالت میں دیکھتے ہوئے اسے لحہ بھر کے لیے لگا جیسا اس نے اسے پہلے بھی اس حالت میں دیکھا ہے۔اس نے ذہن پر زور ڈالا۔لیکن اسے کچھ یاد نہ آیا۔وہ چٹان کو مسلسل غور سے دیکھتا رہا۔

''یہ کیا؟اس پر تو کچھ لکھا ہوا ہے۔''اس نے دیکھا کہ چٹان کے اس سلیٹ نما حصے پر کچھ کندہ ہے۔دفعتاً اسے لگا کہ وہ چٹان پر کندہ عبارت پڑھ سکتا ہے۔

'' ساتواں فرمانِ مقدس۔۔۔یہ فرمان مہاراجہ اشوک ۔۔۔کی طرف سے جاری کیا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔''اس نے روانی سے پوری عبارت پڑھ ڈالی۔

کچھ دیر کے لیے اسے لگا جیسے یہ اس کا وہم ہے اور وہ عبارت نہیں پڑھ سکتا۔اس نے دوبارہ عبارت پر نظر دوڑائی۔اسے ایک دھچکا سا لگا کہ وہ اسے روانی سے پڑھنے پر قادر ہے۔

''یہ کون سی زبان ہے اور میں اسے کیسے جانتا ہوں۔''اس نے سوچا۔

''میں بارہ سال اس چٹان کو میدان کے سرے پر ایستادہ دیکھتا رہا ہوں،لیکن مجھے یہ عبارت کبھی نظر نہیں آئی۔ممکن ہے یہ عبارت فریبِ نظر ہو۔۔۔۔۔ہو سکتا ہے کہ یہ چٹان اب بھی میدان کے سرے پر ایستادہ ہو اور مجھے نیچے کھائی میں پڑی نظر آرہی ہو۔جیسے زلزلے کی رات میں نے بگ ڈپر کو دیکھا تھا۔جو مجھے ایک نیلگوں سمندر کے مانند لگا تھا۔''اس کا ذہن الجھنے لگا۔

اتنے میں فرمان اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔اس نے اسے چٹان کو بغور دیکھتے ہوئے دیکھا تو اسے؛اس کی ذہنی حالت پر شک سا ہونے لگا اور وہ کسی نہ کسی طرح اسے بہلا پھسلا کر گھر لے گیا۔

رات کو وہ بستر پر لیٹا تو چٹان پر کندہ حروف اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔وہ خیالوں ہی خیالوں میں عبارت پڑھنے لگا۔عبارت پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھ لگ گئی اور اس کے ذہن میں ہتھوڑے سے چلنے لگے۔اسے لگا جیسے کوئی اس کے دماغ میں چھینیاں نصب کر کے اس پر حروف کندہ کر رہا ہے۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔لیکن چھینیوں پر ہتھوڑے پڑنے کی آواز اسے مسلسل سنائی دیتی رہی۔اس نے کئی بار اس خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی لیکن چھینیوں کی آواز لحہ بہ لحہ بلند ہوتی گئی۔ پھر اس کے ذہن میں کچھ ہیولے سے لہرانے لگے، جو رفتہ رفتہ آدمیوں کی شکل میں ڈھلنے لگے۔کچھ ہی دیر میں اس کی نگاہوں میں پورا منظر آ گیا۔اس نے دیکھا کہ وہ وادی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والے راستے میں واقع ایک کاہو کے بڑے درخت کے نیچے لیٹا ہوا ہے اور کچھ لوگ چٹان پر فرمانِ مقدس کا عنوان کندہ کر رہے ہیں۔یہ چٹان راستے سے اٹھائیس تیس گز اوپر عین اس جگہ پر واقع ہے جہاں اب ایک پیالہ نما گڑھا ہے۔

وہ اس خیال کو جھٹک کر چاندنی راتوں میں دیکھے ہوئے اس منظر کے بارے میں سوچنے لگا۔
جب وہ چودھویں کی رات، پچھلے پہر، ڈھلتے چاند کی روشنی میں، مغرب کی سمت واقع چھوٹی پہاڑی پر، برف میں لپٹی ہوئی وادی کا نظارہ کرنے جاتا تو اسے یہ گڑھا اپنی خیالی محبوبہ کا پیالہ ناف معلوم ہوتا۔اس نے اس منظر کو اس تصوراتی منظر سے ملا کر دیکھا تو اسے شدید دھچکا لگا۔سینے کے دو ابھاروں کے نیچے مثلث بناتا ہوا ایک اور ابھار۔ابھی وہ اس منظر پر غور کر رہا تھا کہ دفعتاً اوپر والی دونوں چٹانیں بھی کچھ نیچے کو سرک آئیں اور ان کے اردگرد کچھ اور چٹانیں ابھر گئیں۔اس نے خیالوں ہی خیالوں میں اپنی نظریں اوپر غار کی جانب بڑھائیں تو دیکھا کہ غار کا دہن آگے کو پھیل کر لمبوترا سا ہو گیا اور اس پر موجود اس کا کمبل غائب ہو گیا۔اسے لگا جیسے وہاں اس کی چٹانی محبوبہ کے بجائے کوئی کتیا ٹانگیں پھیلائے لیٹی ہوئی ہے۔اسے اس منظر سے کراہت سی محسوس ہوئی۔

اسے ابکائی سی آنے لگی۔وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بھاگا۔واش بیسن میں الٹیاں کرتے ہوئے اس نے ایک نظر آئینے پر ڈالی۔اسے اپنے چہرے کے خدوخال میں کچھ تبدیلی سی محسوس ہوئی۔جب اس نے غور کیا تو دیکھا کہ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی نکل آئی ہے جو الٹیوں سے تر ہے۔اس نے ٹونٹی کھولی اور پانی سے اپنا چہرا اور داڑھی دھوئی۔

واپس بستر کی طرف آتے ہوئے اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا تو وہ غائب تھی۔اس نے دیوار میں لگے آئینے میں دوبارہ اپنا چہرہ دیکھا تو داڑھی بدستور موجود تھی۔پھر اس نے ایک نظر اپنے لباس پر ڈالی جو اسے عجیب وغریب لگا۔وہ کافی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا اپنا لباس دیکھتا رہا۔اسے یاد آیا کہ اس نے خواب میں انکل فاروقی کو ایسے ہی لباس میں دیکھا تھا۔

''میں ٹیکسلا شملہ جا رہا ہوں۔تم نہیں جاؤ گے۔فرمانِ مقدس کے چٹان پر کندہ کرائے جانے کی رپورٹ پیش کرنے۔''اس کے دماغ میں ڈاکٹر فاروقی کا کہا ہوا جملہ گونجا۔

اس جملے سے اس کا دھیان ایک مرتبہ پھر چٹان کی طرف گیا۔ جہاں اس کے کچھ شناسا چہرے حروف کندہ کرنے میں مصروف تھے۔اس کے دماغ پر دوبارہ ہتھوڑے برسنے لگے۔اس نے شدتِ درد سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

پھر اسے لگا جیسے ایک پتلی دوشاخہ چھڑی اس کے ناک کے رستے اندر گھسیڑی جا رہی ہے۔جس کی ایک نوک کا رخ اس کے دماغ کی طرف جب کہ دوسری کا اس کے دل کی طرف ہے۔دل کی طرف جانے والی شاخ کی نوک اس کے گلے میں پھنس گئی ہے۔جس کی وجہ سے اسے سانس لینے میں شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

اس کا سر چکرانے لگا اور وہ بہ مشکل اپنے بستر تک پہنچا۔ جوں ہی وہ بستر پر دراز ہوا۔اس کے ذہن میں یک بہ یک کئی مناظر گھوم گئے۔

"ہسپتال؛ جہاں اس کا باپ اور بھائی اس کے لیے اجنبی تھے۔
وہاں سے نورآباد کا سفر، جہاں کے سب منظر اس کے لیے اجنبی تھے۔
نورآباد؛ جہاں اس کا اپنا گھر اور عزیزو اقارب سب اس کے لیے اجنبی تھے۔
میدان؛ جہاں کھڑی چٹان اس کے لیے نیم اجنبی، نیم شناسا تھی۔
پیالہ نما گڑھا؛ جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔
گڑھے کے حوالے سے بھائی کی گفتگو؛ جو اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی۔
نیچے کھائی میں لڑھکائی گئی چٹان اور اس کی اپنی نگرانی میں اس پر کندہ کی گئی عبارت۔۔۔۔"

انھی ناقابلِ فہم مناظر پر غور کرتے کرتے نہ جانے کب وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

(۷)

صبح کاذب کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو وہ خوابیدگی کی سی حالت میں تھا۔اس نے سب سے پہلے اپنے لباس پر نظر دوڑائی ۔اسے یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ وہ عجیب وغریب لباس سے چھٹکارا پاچکا ہے۔پھراس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو اس کی داڑھی بھی غائب تھی ۔وہ بھاگ کر واش روم گیا اور اپنے خدوخال کو بغور دیکھنے لگا۔اس کی داڑھی واقعی غائب تھی اور خدوخال بھی اصلی حالت میں۔

''شکر ہے وہ سب خواب تھا۔'' اس نے سوچا۔

''لیکن یہ خواب شروع کہاں سے ہوا تھا؟'' وہ واپس بستر پر لیٹ کر رات کو دیکھے ہوئے خواب کے بارے میں سوچنے لگا۔اس نے خواب کے ایک ایک منظر کا تفصیلی جائزہ لیا۔اسے کچھ شک سا ہوا کہ اس نے جو کچھ دیکھا وہ خواب نہیں تھا۔اسے یاد آیا کہ شام کو وہ میدان میں گیا تھا اور اس نے چٹان پر کندہ عبارت روانی سے پڑھی تھی۔

''ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔'' وہ کافی دیر اس عجیب وغریب معاملے پر غور کرتا رہا۔

اس نے اٹھ کر ایک نظر کھڑکی سے باہر دیکھا پو پھٹ چکی تھی ۔باوجود اس کے کہ یہ نومبر کے آخری دن تھے اور باہر بہت سردی تھی؛ اس نے اوپر اوڑھا ہوا چھوٹا کمبل اپنے جسم کے گرد لپیٹا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔میدان میں پہنچ کر اس نے اک نظر چٹان کو دیکھا۔اسے سخت حیرت ہوئی کہ وہ چٹان پر اجنبی زبان میں لکھی ہوئی عبارت اب بھی روانی سے پڑھ سکتا ہے۔

''نہیں یہ خواب نہیں ہو سکتا۔نہ ہی میرا وہم۔''

''یہ ایک حقیقت ہے۔ایسی حقیقت جو علت و معلول کے رشتے سے ماورا ہے۔یا پھر میرا ذہن اسے سمجھنے سے قاصر ہے۔''

وہ علت و معلول کے رشتے پر غور کر رہا تھا کہ اسے لگا جیسے اس کے دماغ میں کوئی دریچہ سا کھل

گیا ہے اور اس سے تازہ خیال کے جھونکے سے آ رہے ہیں۔ اس نے احساسِ فرحت میں اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک اسے چٹان پر کسی بھاری شے کے گرنے کی آواز آئی اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ چٹان خون میں تر ہے اور اس پر ایک ہیولا سا ہاتھ پاؤں مار رہا ہے جیسے کوئی شخص شدید زخمی حالت میں تڑپ رہا ہو۔

وہ خوفزدہ سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چل پڑا۔

(۸)

گزشتہ برس آنے والے زلزلے کے بعد نور آباد میں نئے مکانوں کی تعداد پرانوں سے زیادہ ہو گئی تھی۔ بیشتر مکان منہدم ہو گئے تھے۔ اب گاؤں میں کچے مکان نہ ہونے کے برابر تھے۔ کچے مکانوں کا ایک فائدہ ضرور تھا کہ ان کے کمرے گرمیوں میں ٹھنڈے جب کہ سردیوں میں گرم ہوتے تھے۔ جب کہ پکے مکانوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سخت ٹھنڈے۔ ٹھنڈا علاقہ ہونے کے باوجود گرمیوں میں دن کے وقت پکے مکانوں میں بغیر پنکھے کے گزارہ مشکل تھا البتہ رات حسبِ معمول ٹھنڈی ہوتی۔ مگر سردیوں میں یہاں کے باسیوں کو سخت پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

شام ہوتے ہی مکانوں میں الاؤ جلنا شروع ہو جاتے اور خاندان کے تمام افراد اس کے گرد چادریں اور کمبل لپیٹ کر بیٹھ جاتے۔ عزیز خان کی حویلی میں نومبر کے آخر تک کمروں میں بجلی کے ہیٹر چلتے رہے لیکن جوں ہی دسمبر شروع ہوا اور سردی کی شدت میں اضافہ ہوا وہاں بھی الاؤ روشن کیے بغیر گزارہ مشکل ہو گیا۔

عزیز خان گزشتہ تیس سال سے اسلام آباد میں مقیم تھے۔ وہ کبھی کبھار ہی نور آباد آتے، وہ بھی گرمیوں کے دنوں میں ہی۔ سوائے کسی خاص مجبوری کے، اس دوران میں انھوں نے سردیوں کی کوئی رات شاید ہی یہاں گزاری ہو۔ لیکن اب انھیں اپنے بیٹے کی خاطر مجبوراً یہاں ٹھہرنا پڑ رہا تھا۔ گزشتہ بارہ سالوں میں اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اگرچہ یہیں گزارا تھا۔ لیکن اب چوں کہ وہ ایک طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوا تھا اس لیے وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

ہر سال سات دسمبر کو نور آباد کے عقبی میدان میں ایک میلہ سجتا تھا۔ جس میں مختلف کھیلوں خاص کر؛ کبڈی، گھڑ دوڑ، مرغوں اور کتوں کی لڑائی کے مقابلے ہوتے۔ چوں کہ اس میلے کا آغاز عزیز خان کے دادا سردار کاظم خان نے تقریباً ایک صدی قبل کیا تھا اس لیے ہر سال اس میلے کا افتتاح سردار جی سے کرایا جاتا جس کے لیے وہ بطورِ خاص نور آباد آتے۔ وہ ہر سال سات دسمبر کو میلے کا افتتاح

کرنے کے بعد دن ڈھلے واپس شہر چلے جاتے۔ چوں کہ اس سال وہ خوش قسمتی سے اپنے خاندان سمیت یہاں موجود تھے اس لیے پندرہ دن پہلے ہی اس سال کے میلے کی تیاریاں شروع کر دی گئیں اور میدان کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا۔

صبح نو بجے سردار جی نے حسبِ سابق میلے کا افتتاح کیا۔ کچھ مقابلے دیکھے اور حویلی میں آ گئے۔ سہ پہر تین بجے کے قریب میدان سے ایک شور سا بلند ہوا اور لوگ گھروں سے نکل کر میدان کی طرف بھاگے۔ عزیز خان کو بھی کسی نے اطلاع دی کہ میدان میں حادثہ ہو گیا ہے اور ان کا ایک عزیز اکبر خان جاں بحق ہو گیا۔ وہ حویلی سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے میدان کی طرف نکلے تو زمان بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

جب وہ میدان میں داخل ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ اکبر خان کی لاش چٹان پر پڑی ہے۔ اکبر خان، جو گھڑ سواری کا مانا ہوا نام اور اتھرے سے اتھرے گھوڑے کو قابو کرنے کا ماہر تھا، آج گھوڑے کو موڑتے ہوئے نیچے کھائی میں جا گرا اور اس کا وجود چٹان کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔

زمان نے اکبر خان کی لاش دیکھی تو اس کی نگاہوں میں کچھ دن پہلے دیکھا ہوا منظر گھوم گیا۔ لاش چٹان پر عین اس جگہ پڑی تھی جہاں اس نے خون آلود ہیولے کو تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس نے یہ منظر صرف ابھی دیکھا ہے، لیکن وہ ناکام رہا۔ جب وہاں سے لاش اٹھائی گئی تو چٹان پر ایک خونی شبیہ سی بن گئی۔ اس نے دیکھا کہ عبارت کا ایک حصہ خون سے تر ہو کر مزید واضح ہو گیا ہے۔ خاص کر آخری جملہ، جس میں اپنے حواس کو قابو میں رکھنے کو مستحسن عمل قرار دیا گیا تھا۔

اکبر خان کی موت کا اسے بے حد دکھ ہوا۔ وہ اس کے رشتہ داروں میں واحد آدمی تھا، جس نے گزشتہ بارہ سالوں میں اس کا بے حد خیال رکھا۔ وہ روز اس سے حویلی میں ملنے آتا اور دیر تک اس سے گپ شپ لگاتا۔ ان کی گفتگو کا موضوع عموماً عرفان خان اور مخفی علوم ہوتے۔ اکبر کے دل میں گھڑ سواری کا شوق عرفان خان ہی کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ بل کہ ایک حد تک وہ اس کا استاد بھی تھا۔ عرفان خان کی پراسرار گمشدگی کے بعد اکبر خان واحد آدمی تھا جس سے وہ ہر بات شیئر کر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے خواب بھی۔

وہ رات بھر سو نہ سکا۔ جوں ہی وہ آنکھیں بند کرتا اس کے ذہن میں اکبر کا چٹان سے چپکا مردہ چہرہ گھوم جاتا اور وہ گھبرا کر دوبارہ آنکھیں کھول لیتا۔ اسی حالت میں صبح نے دروازے پر دستک دی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

آٹھواں باب

جاگے ہیں خواب میں

(۱)

آج وہ کافی عرصے بعد چٹانی چبوترے پر آیا تھا؛ لیکن کمبل کے بغیر۔ ویسے بھی جہاں وہ کمبل بچھایا کرتا تھا وہاں اب ایک گہرا شگاف بن چکا تھا، اتنا گہرا کہ اس میں آدمی آسانی سے اتر سکتا تھا۔ اگلے حصے کے سرکنے کی وجہ سے غار کا دہانہ کچھ تنگ سا ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ چٹان پر بنی ہتھیلی دو واضح حصوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ چاروں انگلیاں اور ان سے جڑے، ہتھیلی کے کچھ حصے کو چھوڑ کر، انگوٹھے سمیت ہتھیلی کا باقی ماندہ حصہ آگے کو سرک گیا ہے۔ اس نے ایک نظر اپنی بائیں ہتھیلی پر ڈالی، جہاں دماغی لکیر کے آخری سرے پر زخم کا نشان نمایاں تھا۔ پھر اس نے اپنی نظریں شگاف پر مرکوز کر لیں؛ جہاں دھندلکا سا تھا۔ وہ کافی دیر شگاف کے دھندلکے میں کچھ ٹٹولتا رہا۔ اچانک اس دھندلکے میں رنگ برنگی روشنی تیری جو دیکھتے ہی دیکھتے ماریہ کے سراپے میں ڈھل گئی۔ اس نے غور سے دیکھا تو وہ اسے حویلی کے بنیرے پر کھڑی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں اس کا دھلا ہوا کرتا تھا جسے تار پر پھیلانے کے وہ اسے نچوڑ رہی تھی، جوں ہی وہ اسے تار پر پھیلانے کے لیے بڑھی اس کا بھاری وجود ڈولنے لگا۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ منظر غائب ہو گیا۔ اس نے ایک خیالی جھٹکے سے اپنے آپ کو شگاف سے باہر نکالا اور خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

شام کو جب اس کا سامنا اپنی بیوی سے ہوا تو اس کی آنکھوں میں ندامت سی ابھر آئی۔ اگرچہ مرورِ وقت نے اس کے بدن پر چربی کی تہہ چڑھا دی تھی مگر نکلتے ہوئے قد کے باعث اس کا بدن اب بھی متناسب ہی لگ رہا تھا۔ وہ سادگی کو سنگھار کیے کپڑے استری کرنے میں مگن تھی اور زمان کن انکھیوں سے اسے دیکھنے میں۔ اس نے گذشتہ سولہ سالوں میں پہلی مرتبہ اسے غور سے دیکھا اور شدتِ جذبات سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''اس بے چاری کی جوانی میں نے خراب کی ۔ ہماری شادی کو سولہ سال ہونے کو آئے ۔لیکن میں نے کبھی اسے محبت سے دیکھا تک نہیں ۔کتنی صابر ہے۔آج تک اس نے مجھ سے شکایت تک نہیں کی ۔ ماہ نور سے محبت کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں اس سے نفرت کرنے لگوں ۔ میں شاید اس سے شدید نفرت کرتا ہوں ۔اتنی نفرت کہ لاشعوری طور پر اس کی موت کی خواہش کرنے لگا ہوں۔تبھی میں نے خیالوں میں اسے گرتے ہوئے دیکھا۔''

رات کو جب اس نے ماریہ کو کمرے میں بلایا تو اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی ۔وہ اس کے پاس پلنگ پر یوں سمٹ کر بیٹھ گئی جیسے ابھی تک کنواری ہو۔ایک حد تک صورتِ حال تھی بھی ایسی ہی ۔شادی کے ابتدائی دنوں کے علاوہ وہ کبھی اکٹھے نہیں سوئے تھے۔

کافی دیر تک کمرے میں خاموشی سرسراتی رہی ۔دونوں کی نگاہیں اپنے اپنے پیروں پر جمی ہوئیں تھیں ۔زمان کی ندامت اور شرمندگی کی وجہ سے جب کہ ماریہ کی شرم سے ۔

''مجھے معاف کردو''اس نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''میں نے تمھارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔''

''کوئی بات نہیں۔''وہ اتنا ہی کہہ سکی ۔زمان نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے ایک جھرجھری سی لی اور اس کی بانہوں میں سمٹ آئی ؛اور پھر سمٹتی چلی گئی۔وہ گزشتہ سولہ سالوں میں پہلی مرتبہ ٹوٹ کر ایک دوسرے سے ہم کنار ہوئے ۔

اس واقعے کے بعد زمان اپنی بیوی کا بے حد خیال رکھنے لگا اس کی طبیعت میں اس اچانک تبدیلی پر سب گھر والوں کو خوشی بھی تھی اور حیرت بھی ۔انھوں نے اپنے طور پر اندازہ لگایا کہ کومہ میں جانے کی وجہ سے ماہ نور کی یاد یا تو اس کے ذہن سے مکمل طور پر محو ہو چکی ہے یا اس کی شدت میں کمی آ گئی ہے۔

ایک رات وہ صحن میں لیٹا خلاؤں میں گھور رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک خوفناک منظر لہرایا۔اس نے دیکھا کہ ماریہ حویلی کے صحن میں زخمی حالت میں پڑی ہوئی ہے اور اس کے ہاتھ میں اس کا دھلا ہوا کرتا ہے ۔

وہ بھاگا بھاگا کمرے میں گیا جہاں اس کی بیوی کپڑے استری کر رہی تھی ۔

''تم آئندہ کبھی چھت پر کپڑے ڈالنے نہیں جانا۔''اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں کہا۔

وہ اس انوکھے حکم پر ہڑبڑا سی گئی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں جی۔''

''بس تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم چھت پر کپڑے ڈالنے نہیں جاؤ گی۔'' اس نے دوبارہ کہا۔

ماریہ حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔

یک دم اسے یاد آیا کہ کپڑے تو گھر میں کام کرنے والی خالہ دھوتی ہے۔ وہ تو صرف استری کرتی ہے اور وہ بھی صرف میرے، اس کے اپنے کپڑے تو استری بھی خالہ ہی کرتی ہے۔

''میرا مطلب ہے کہ اگر کبھی تم کپڑے دھوؤ تو۔ مجھے آواز دینا میں تمھارے ساتھ جاؤں گا۔ ٹھیک ہے؟'' زمان نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

'' کیوں جی؟ خیرت تو ہے ناں جی! آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' اس نے زندگی میں پہلی بار زمان سے کوئی سوال کیا۔

''یہ تو میں پھر کبھی تمھیں بتاؤں گا۔ بس تم وعدہ کرو۔''

''اچھا جی۔ وعدہ۔''

ماریہ نے نوٹ کیا کہ اب زمان پہلے سے بھی زیادہ اس کا خیال رکھنے لگا ہے۔ وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی اسے لگا جیسے اسے زندگی کی ہر خوشی میسر آ گئی ہے اور وقت جو پہلے اس کے لیے رک سا گیا تھا، تیزی سے گزرنے لگا۔

'' آپ نے اس دن مجھے چھت پر جانے سے روکا کیوں تھا؟'' کئی دن بعد ایک رات اس نے اچانک سوال کر دیا۔

''اس لیے کہ اگر تم وہاں گئیں تو گر جاؤ گی۔'' اس نے بغیر سوچے کہا۔ یک دم اسے احساس ہوا کہ اسے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔

''آپ بھی ناں۔۔۔! میں کوئی بچی ہوں؟'' وہ ہنس پڑی۔

لیکن وہ سنجیدگی سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

پھر وہ اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر چھت میں گھورنے لگا۔ جہاں اسے پنکھے کے گھومتے ہوئے پروں سے ایک گاڑی ٹکراتی دکھائی دی۔ اس کے دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا جس سے منظر مزید واضح ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ماہ نور کی گاڑی ایک ٹرک سے ٹکرائی اور لوگ گاڑی کا دروازہ کاٹ کر اسے باہر نکال رہے ہیں۔ اس سے یہ کرب ناک منظر دیکھا نہ گیا اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے دوبارہ چھت کی طرف دیکھا تو حیرت زدہ ہو گیا۔ پنکھا ساکن تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ جنوری کے سرد ترین دن ہیں گزشتہ

کئی مہینوں سے پنکھا تو چلا ہی نہیں۔

ماریہ کو لگا جیسے وہ کسی شدید کرب میں مبتلا ہے۔

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا جی۔'' ماریہ گھبرا گئی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' اس نے اداکاری کی۔

صبح اٹھ کر اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعے ماہ نور کے شوہر کا فون نمبر ٹریس کرایا۔

''ہیلو!'' نوید کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے فوراً نمبر کاٹ دیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

کافی دیر کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر نمبر ڈائل کیا۔

جوں ہی دوسری طرف سے ہیلو کی آواز ابھری۔ وہ جلدی جلدی بولنے لگا:

''نوید۔ میں زمان بول رہا ہوں۔ ماہ نور سے کہنا کہ آئندہ گاڑی احتیاط سے چلائے۔ اور ہاں میری طرف سے نہ کہنا۔ پلیز تم اپنی طرف سے اسے سمجھانا۔ وہ بہت تیز گاڑی چلاتی ہے۔ پلیز اسے بچا لو۔ اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آنے والا ہے۔ بس میں نے یہی بتانے کے لیے تجھے فون کیا ہے۔'' اس سے پہلے کہ دوسری طرف سے کسی قسم کی کوئی آواز ابھرتی اس نے فون کاٹ دیا۔ اس کا دل اب بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ مگر اسے لگا جیسے اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا۔

(۲)

کچھ دن بعد اسے رات کے وقت اطلاع ملی کہ ماہ نور کی گاڑی کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ شدید زخمی حالت میں اسپتال میں پڑی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

اس نے ڈرائیور کو اس کے گھر سے بلوایا اور اسلام آباد چلنے کو کہا۔ وہ بے چارہ ہکا بکا ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ ''صاحب جی ابھی؟'' زمان خاموش رہا۔ ڈرائیور بھاگا بھاگا بڑے خان جی کے پاس گیا اور انھیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ خان جی گھبرائے ہوئے، زمان کے کمرے میں داخل ہوئے اور اس کے چہرے پر کرب کی گہری لکیر دیکھ کر اور بھی گھبرا گئے۔ ماریہ نے اپنے تایا کو اسلام آباد میں ہونے والے واقعے کی خبر سنائی، جو اسی کے ذریعے زمان تک پہنچی تھی۔

وہ دونوں سوئے ہوئے تھے کہ زمان کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ ماریہ نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف زمان کا ایک قریبی دوست تھا۔ ماریہ نے جب اسے بتایا کہ زمان سو رہے ہیں اور اس وقت انھیں جگانا مناسب نہیں تو اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔

عزیز خان نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا اور فرمان کو بھی ساتھ بھیج دیا۔ گاڑی دامنِ کوہ سے اتر رہی تھی کہ صبحِ صادق کے نورانی سائے فضا میں لہرانے لگے۔ زمان نے دیکھا کہ ان روشنیوں کے بیچ ماہ نور کا ہالہ بھی تیر رہا ہے، جو آہستہ آہستہ سیاہ ہو رہا ہے۔

زمان نے آئی سی یو کے دروازے میں لگے شیشے سے دیکھا۔ سفید بستر پر ماہ نور کا جسم بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ پیلا ہٹ زدہ تھا۔ جسم کا جتنا حصہ اسے نظر آ رہا تھا اس پر کسی قسم کی چوٹ کا نشان نہیں تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کی نظروں میں ماہ نور کا ہنستا مسکراتا چہرہ گھوما؛ اور پھر بتدریج سیاہ ہوتا ہالہ۔

اسے لگا جیسے اب کے دکشا نے چندر دیوتا کے بجائے روہنی (الدبران) کو سزا کے لیے منتخب کر لیا ہے اور باقی دیوتاؤں نے اس سزا کو خاموشی سے قبول کر لیا ہے، کیوں کہ وہ اس کی خوبصورتی سے جلتے ہیں۔

سخت سردی کے باوجود، وہ تین دن تک اسپتال میں رہا اور اس دوران میں وہ لحہ بھر کے لیے بھی نہیں سویا۔ اسے گھر لے جانے کی تمام کوششیں بے کار گئیں۔ وہ اسپتال سے ماہ نور کی میت کے ساتھ ہی نکلا۔

ماہ نور کی موت کے چوتھے دن نوید اسے اسلام آباد والے گھر میں ملنے آیا۔ نوید بیٹھا سسکیاں بھرتا رہا، لیکن وہ پتھرایا ہوا سا رہا۔

"اس کی موت کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں اسے تمھارا پیغام نہیں پہنچا سکا۔ تم اسے مجھ سے زیادہ چاہتے تھے۔ اس لیے تم نے اس کی موت پہلے ہی دیکھ لی۔ اور میں۔۔۔ میں تو تمھاری بات کو تمھارا پاگل پن سمجھتا رہا۔ مجھے معاف کر دو۔" نوید نے کہا۔ اس نے محسوس کیا کہ زمان کے چہرے پر ایک ایسا کرب ہے جیسے اس کے ناخن پلاس سے کھینچ کر گوشت سے الگ کیے جا رہے ہوں اور وہ ضبط کیے جا رہا ہو۔ اس نے کچھ عرصہ ایک خفیہ ادارے میں ملازمت کی تھی۔ جہاں اس نے ایسے کئی کرب ناک منظر دیکھے تھے۔ اس کی نوکری چھوڑنے کی وجہ بھی سرکاری اہلکاروں کی ایسی ہی بربریت تھی جسے وہ تفتیش کے نام پر روا رکھتے تھے۔

زمان کو آئی وو آندریچ یاد آیا۔ جس نے اپنے ناول "درینہ کا پل" میں اپنے ایک کردار مصطفیٰ دواڑیا کو بلی چڑھانے کا منظر دکھایا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ مصطفیٰ دواڑیا ہے اور بلی چڑھانے کے لیے سرینوں پر سے اس کی پتلون کاٹی جا رہی ہے۔ اس نے چشمِ تصور میں دیکھا کہ وہ غار کے چبوترے پر منہ کے بل لیٹا ہوا ہے اور چیڑ کے ایک بالے کو، چیڑ ہی کے دو لٹھوں پر اس طرح ٹکا کر رکھ دیا گیا ہے کہ اس کی نوک اب اس کی ٹانگوں کے بیچ ہے۔ بالے کی نوک پر لوہے کی شام چڑھی ہوئی ہے۔ ایک آدمی نے کاہو کی ایک موگری اٹھائی اور اس پر ضربیں لگانی شروع کر دیں۔ موگری کی ہر ضرب پر اس کا بدن ایک مٹھی کی طرح بند ہو جاتا ہے اور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک کوبڑ پن سا بن جاتا ہے، جسے رسے سے کھینچ کر پھر سیدھا کر دیا جاتا ہے اور مزید ضربیں لگائی جاتی ہیں۔ لیکن انتہائی احتیاط سے۔ تاکہ بالا اس کے جسم میں اس طرح سے داخل ہو کہ اس کا دل، جگر اور پھیپھڑے متاثر نہ ہوں، جس سے اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ اس کا بدن زمین سے گز بھر کے فاصلے پر اوپر فضا میں ایک بالے میں پرویا ہوا ہے۔ یوں جیسے باربی کیو کے لیے بر ہ پرو یا جاتا ہے اور وہ بدن پرونے والوں کو محبت سے دیکھ رہا ہے۔ جیسے عیسیٰ ابنِ مریم نے صلیب چڑھانے والوں کو دیکھا تھا۔ پھر اسے وہ حدیث یاد آئی جس کے مطابق آنحضرت نے طائف میں پتھر برسانے والوں کے لیے دعا مانگی تھی اور اس کے ہاتھ

بے اختیار دعا کے لیے اٹھ گئے۔

نوید کافی دیر اس کے دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھوں کے پیچھے چھپے چہرے کی طرف دیکھتا رہا ، رفتہ رفتہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے چہرے پر کرب کی جگہ شانتی سی چھا رہی ہے۔ وہ جانے کے لیے اٹھنے ہی والا تھا کہ فرمان کمرے میں داخل ہوا اور اس نے ماریہ کے حویلی کی چھت سے گر کر زخمی ہونے کی اندوہناک خبر سنائی۔ نوید کو یہ خبر سن کر انتہائی دکھ ہوا، مگر اس نے دیکھا کہ زمان کے چہرے پر بدستور شانتی ہے۔ بدھا کے مجسمے کی سی شانتی۔ یہ شانتی ایک دن نوید کو بھی نگل گئی۔ کچھ ہی دن بعد زمان نے دیکھا کہ نوید نے ماہ نور کی جدائی کے غم میں خودکشی کر لی ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ نوید کو اس اقدام سے روکے۔ لیکن پھر اس نے خود ہی اس کی زندگی پر کراس کا نشان لگا دیا۔

نوید کے گھر والوں پر کبھی نہ کھل سکا کہ اس نے خودکشی کی یا؛ زیرو پوائنٹ کے قریب، عین اس جگہ پر، جہاں ماہ نور کا ایکسی ڈنٹ ہوا تھا، اس کی موت محض ایک حادثہ تھی۔

البتہ گل زیب کی اندوہناک موت کے بارے میں سب کو یقین تھا کہ وہ محض ایک حادثہ تھی۔ صرف زمان جانتا تھا کہ بظاہر شادی کی ایک تقریب میں ہونے والی فائرنگ میں جاں بحق ہونے والے گل زیب کو، باقاعدہ ایک سازش کے تحت ہلاک کیا گیا تھا کہ اس نے کچھ سال پہلے ایک ایسے شخص کو اپنے گھر میں کئی سال تک جگہ دیے رکھی تھی جسے مشکوک ہونے کی بنا پر انھوں نے حضرت ظفر علی خان کے مزار کے احاطے سے بے دخل کیا تھا۔ یہی نہیں بل کہ زلزلے کے کئی ماہ بعد جب اس نے اپنے مکان کا ملبا ہٹایا تھا تو اس سے برآمد ہونے والی ہڈیوں کے بارے میں بھی اسے یقین تھا کہ وہ عرفان سرکار ہی کی ہیں اور اس نے بڑے سردار جی سے سفارش کروا کر انھیں حضرت ظفر علی خان کے مزار کے احاطے میں دفن کروایا تھا۔

(۴)

وقت کا دھارا اپنی رفتار سے بہتا رہا۔ایک دن زمان نے دیکھا کہ اس کا باپ ،عزیز خان ؛ جسے سب بڑے سردار جی کہہ کر پکارتے تھے، بخار میں مبتلا ہو کر دم توڑ رہا ہے۔کچھ دنوں بعد سب کچھ؛ جاگتی آنکھوں سے دیکھے ہوئے ،اس کے خواب کے مطابق ہوا۔

''میں جیسا دیکھتا ہوں ویسا ہوتا ہے یا جیسے ہوتا ہے ویسا دیکھتا ہوں'' باپ کو دفنانے کے بعد حویلی میں قدم رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

''یقیناً میں جیسا دیکھتا ہوں ویسا ہوتا ہے۔میں ان سب کی موت کا ذمہ دار ہوں۔ میں نے انھیں کرب ناک موت مرتے ہوئے دیکھا تبھی وہ مرے۔''

''لیکن میرا ایسا دیکھنا اختیاری تو نہیں ہے۔اگر میرا انھیں مرتے دیکھنا،ان کی موت کی علت ہے تو بھی اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔''

''پھر بھی اگر میں چاہتا تو انھیں بچا سکتا تھا۔اگر میں انھیں بتا دیتا کہ وہ مرنے والے ہیں تو ہو سکتا ہے وہ اپنے بچ نکلنے کی کوئی تدبیر نکال لیتے۔اور نہیں تو کم از کم ماہ نور ضرور کوئی رستہ نکال لیتی؛ اور جیتی رہتی۔نوید کے لیے۔وہ نہ مرتی تو نوید بھی نہ مرتا۔''

''لیکن اس دوران میں اور بھی تو بہت سے لوگ مرے میں نے ان کی موت کو پہلے کیوں نہیں دیکھا؟''

''شاید اس لیے کہ ان کا مجھ سے کوئی خونی یا جذباتی رشتہ نہیں تھا۔''

ایسا سوچتے ہوئے اس نے اپنے وجود پر غور کیا تو اسے اپنے گرد ایک دیو قامت ہالہ دکھائی دیا جس میں ماہ نور،نوید ، اکبر خان، اورنگزیب چچا اور عزیز خان کے ہالے اپنے تمام رنگوں سمیت موجود ہیں جب کہ اس کے باہر بھی کچھ ہالے گردش کر رہے ہیں۔جن میں سے اس کی ماں، بہن اور بھائی کے ہالے واضح طور پر پہچانے جا رہے ہیں۔

ہالے سے پھوٹتی ہوئی روشنیاں کسی وجہ سے اندر کو مڑ رہی ہیں جس کی وجہ سے ان کا رنگ سرخ اور مدھم ہو رہا ہے۔ کافی دیر غور کرنے کے بعد اس پر کھلا کہ یہ روشنیاں ماہ نور، نوید، اورنگ زیب چچا، اکبر خان اور عزیز خان کے ہالوں کی ہیں۔ جوں ہی یہ روشنیاں اس کے ہالے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتی ہیں؛ اس کے ہالے کی بیرونی تہہ انھیں واپس اندر دھکیل دیتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کا ہالہ اپنے گرد گھومتے ہالوں کو بھی اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔

اسے لگا جیسے وہ ایک بلیک ہول ہے۔ جو ہر اس شے کو، جس میں اس کے لیے کوئی بھی کشش ہو؛ چاہے وہ نفرت ہی کی کیوں نہ ہو، نگل رہا ہے اور اس وقت تک نگلتا رہے گا، جب تک اس کے اندر ان کے لیے کوئی بھی کشش موجود ہے۔

''کیا میں ایک بلیک ہول ہوں اور یہ ہالہ میرا ایونٹ ہورائزن۔'' اس نے اپنے ہالے کو بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔

''کچھ بھی ہو ان لوگوں کی موت کا کوئی نہ کوئی تعلق مجھ سے ضرور ہے۔'' اسے ایک دھچکا سا لگا اور اس نے اپنے آپ کو کھینچ کر اپنے ہالے سے الگ کیا۔

نفسیات دانوں میں وہ ژونگ کا مداح رہا تھا اور ہر معاملے میں اسے فرائیڈ پر ترجیح دیتا رہا تھا۔ اس مداحی میں اس کے مزاج کے علاوہ عرفان کا بھی ہاتھ تھا۔ عرفان، ژونگ کو روحانی سائنس دان کہا کرتا تھا۔ اس نے عرفان کی ترغیب پر ژونگ میں؛ اور ژونگ کی تحریروں کی ترغیب پر مابعد الطبیعیات میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ حالاں کہ وہ بنیادی طور پر طبیعیات کا طالب علم اور اسٹیفن ہاکنگ کا مداح تھا۔ جب غار پر اس نے اپنی ہتھیلی کی لکیروں سے ملتی جلتی لکیریں دیکھی تھیں تو اس نے فرائیڈ کی نفسیات اور ہاکنگ کی طبیعات دونوں کو خیر آباد کہہ دیا تھا لیکن جب سے اس نے جاگتی آنکھوں سے اپنے کچھ پیاروں کی موت کے خواب دیکھے اور بعد میں سب کچھ اس کے مطابق ہوا۔ وہ دوبارہ فرئیڈ کی نفسیات کی طرف متوجہ ہو گیا اور بالآخر اس بات پر ایمان لے آیا کہ اپنے پیاروں کی موت کے خواب دیکھنا دراصل ان کی موت کی آرزو کرنا ہے۔ اس نے اس حوالے سے فرائیڈ کا شہرہ آفاق مضمون کئی بار پڑھا۔ اس دوران میں اس نے کئی بار خود کو تسلی بھی دی کہ اس نے یہ خواب سوتے میں نہیں دیکھے تھے اس لیے انھیں نیند میں دیکھے ہوئے خوابوں پر معمول کرنا صحیح نہیں

ہوگا لیکن آہستہ آہستہ اس نے اس بات کو شعوری طور پر تسلیم کر لیا کہ وہ ان سب کی موت کا ذمہ دار ہے۔ اسے اپنے وجود سے خوف سا آنے لگا۔

''میں جیسا دیکھتا ہوں ویسا ہوتا ہے۔میرا وجود ایک بلیک ہول ہے۔جو لوگوں کی زندگیاں نگل رہا ہے۔'' وہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا۔

اس نے اپنے عزیز و اقارب سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو ایک اندھیرے کمرے میں بند کر لیا۔وہ بہت کم اس سے باہر نکلتا۔اسے وہم سا ہونے لگا کہ وہ جس سے بھی ملے گا،اس کی موت کا خواب دیکھے گا یوں اس کی موت کا ذمہ دار ٹھہرے گا۔

فرمان جب بھی اس کے پاس آتا ،کچھ ہی دیر بیٹھتا،اس سے حال احوال پوچھتا لیکن اس کی طرف سے خاموشی دیکھ کر اسے تنہا چھوڑ دیتا۔رہی ماریہ تو وہ،اپنے گرنے والے واقعے کے بعد سے اسے ولی اللہ سمجھنے لگی تھی، جو غیب کا علم بھی جانتا ہے،اسے پورا یقین تھا کہ وہ تنہائی میں بیٹھا چلہ کاٹ رہا ہے لہٰذا وہ اس کی تنہائی میں مخل ہونے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔البتہ جب اس کی ماں اور بہن آتیں تو اسے کریدنے کی کوشش کرتیں اور وہ ان کا دل رکھنے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ان سے باتیں کرتا رہتا۔اگر وہ زیادہ دیر بیٹھتیں تو سونے کا بہانہ کر کے ان سے جان چھڑا لیتا۔اور دوبارہ اپنے حیرت انگیز وجود کے بارے میں سوچتا۔

''وجود کے بارے میں سوچنا؛حیرت کدے میں داخل ہونا ہے۔'' وہ ہمیشہ غور و فکر کا آغاز اس فقرے سے کرتا۔

وہ ہفتوں مابعد الطبیعیاتی مسائل میں الجھا رہا۔جوں جوں ان پر غور کرتا اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا جاتا۔

''طبیعیات تجسس سے اور مابعد الطبیعیات حیرت سے جنم لیتی ہے۔مابعد الطبیعیات وہاں سے شروع ہوتی ہے،جہاں طبیعیات کی حدیں ختم ہوتی ہیں۔جب آدمی حیرت کھو دیتا ہے تو وہ طبیعیات کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔''

اس دوران میں اس نے انسان،کائنات اور خدا کے حوالے سے اٹھنے والے بے شمار سوالوں

پر مسلسل غور کیا۔ مگر سوائے حیرت میں گندھے ہوئے مزید سوالوں کے، اس کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ تا ہم اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ کسی حد تک اس دکھ سے نکل آیا جو اسے جاگتی آنکھوں سے دیکھے ہوئے خوابوں نے دیے تھے۔

ایک دن وہ کمرے سے نکلا اور ٹہلتا ہوا بازار کی طرف نکل گیا۔ وہ بہت عرصے بعد ادھر کو آیا تھا۔ بظاہر تو وہ پرسکون تھا مگر ایک پریشان کن احساس بھی اس کے ساتھ تھا۔

بازار میں داخل ہوتے ہی وہ رک گیا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دائیں مڑے یا بائیں۔

''میرا بایاں کون سا ہے۔'' وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھکا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ غار پر جانے کے لیے چٹانوں کے درمیان واقع پیالہ نما گڑھے کے قریب سے گزرا کرتا تھا تو ایسے ہی ٹھٹھک جایا کرتا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ وہ بائیں سمت والی چٹان پر کچھ دیر کے لیے جا کر ستائے۔ وہ ایک دو قدم اس طرف بڑھاتا بھی لیکن پھر بغیر کچھ سوچے سمجھے واپس پلٹ کر چڑھائی چڑھنا شروع کر دیتا تھا۔

''میں آئندہ جب بھی غار پر گیا۔ ضرور بائیں سمت والی چٹان پر کچھ دیر کے لیے بیٹھوں گا۔'' یہ سوچتے ہوئے اس نے بائیں سمت قدم بڑھا لیے۔

اس نے محسوس کیا کہ لوگ اسے یوں دیکھے بغیر گزر رہے ہیں، جیسے وہ اپنے بدن میں موجود ہی نہیں۔

''شاید وہ مجھ سے خوف زدہ ہیں۔ انھیں پتہ چل گیا ہوگا کہ میں کئی لوگوں کی موت کا ذمہ دار ہوں۔ میں نے ان کی موت کے بارے میں سوچا اس لیے وہ مر گئے، انھیں ان کی موت کے دکھ سے زیادہ اپنی موت کا خوف لاحق ہے۔''

اتنے میں وہ اسلم کی دکان پر پہنچ گیا۔ اسلم؛ جو تیسری جماعت تک اس کا ہم جماعت رہا تھا۔ بچپن میں وہ ہر بات اس سے شیئر کرتا تھا۔ انھوں نے بچپن میں کبھی کوئی بات ایک دوسرے سے نہیں چھپائی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو وہ گندے خواب بھی سنا دیتے تھے جنھیں دیکھ کر پہلے پہل وہ خود سے بھی شرمانے لگتے تھے۔ پھر وہ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ زمان شہر چلا گیا اور اسلم کے باپ نے اسے سکول سے اٹھوا کر دکان پر بٹھا دیا، جہاں وہ آج تک بیٹھا ہوا ہے۔

زمان پندرہ سال پہلے یہاں آیا تو ان کے درمیان ایک مرتبہ پھر ایک تعلق سا قائم ہو گیا۔ لیکن ان کے درمیان ویسی گہری دوستی نہ ہو سکی۔ شاید اس کی وجہ دونوں کی ذہنی اور فکری سطح میں تفاوت

تھی۔وہ دونوں ایک دوسرے سے تپاک سے ملتے مگر بات علیک سلیک اور چھوٹی موٹی رسمی باتوں سے آگے نہ بڑھتی۔زمان کی باتیں اس کے پلے ہی نہ پڑتیں۔اس کی طرف سے عدم دلچسپی دیکھ کر زمان جلد ہی اکتا جاتا اور پھر کوئی بہانہ بنا کر اٹھ کھڑا ہوتا۔

لیکن آج نہ جانے کیوں اسلم کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ جس دکھ بھرے راز کو وہ ایک عرصے سے اپنے دل میں چھپائے بیٹھا ہے۔اسے اسلم پر افشا کر کے جی کو ہلکا کر لے۔

اسلم نے اس کی ساری باتیں انتہائی توجہ اور خلوص سے سنیں۔لیکن کوئی بات بھی اس کے پلے نہیں پڑی۔الٹا اس کی ذہنی حالت پر شک سا کرنے لگا۔

''سردار جی۔''وہ اس کا ہم عمر ہونے کے باوجود اسے احترام سے سردار جی کہتا تھا۔''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔میں آپ کے لیے کڑک چائے لے آؤں؟''

''نہیں۔''وہ اٹھ کھڑا ہوا۔جوں ہی وہ اس کی دکان سے نکلا۔کتے کا ایک پلا،دم ہلاتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔وہ پیدل چلتا ہوا۔بازار کے مشرقی سرے تک گیا۔جب وہ واپس پلٹا تو اس کا رخ مغرب کی طرف تھا۔اس نے دیکھا کہ سورج بازار سے کلومیٹر بھر کے فاصلے پر واقع ٹیلے کے پیچھے ڈوب رہا ہے۔

''شاید سورج کے ساتھ میرا دل بھی ڈوب رہا ہے۔'' اس نے ڈوبتے سورج کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

اگلے ہی لمحے!اسے اپنے سینے میں بائیں طرف درد کا احساس ہوا۔اسے لگا جیسے اس کا دل واقعی بیٹھ رہا ہے۔ایسا سوچتے ہوئے اسے ایک گہری اداسی نے آگھیرا۔اس نے اس خیال کو جھٹکا اور قدم آگے بڑھانے لگا۔کچھ قدم چلنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ کتے کا پلا اب بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔وہ ایک ہوٹل کے سامنے رک گیا وہاں سے اس نے دو روٹیاں خریدیں اور انھیں کتے کے آگے ڈال دیا۔کتے نے ایک نظر اس کے چہرے کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا اور پھر بغیر کسی اشارے کا انتظار کیے،روٹیوں پر پل پڑا!اور وہ کھڑا اسے روٹیاں پھاڑتے دیکھتا رہا۔

کتے نے پل بھر میں دونوں روٹیاں ہڑپ کر لیں۔

''نہ جانے کب سے بھوکا تھا بے چارہ۔''اس نے سوچا۔

''میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔''اس نے بغیر ادھر ادھر دیکھے گھر کی راہ لی۔

''اندھیرا کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ایک ایسی حقیقت جس کا ادراک صرف اندھیرے ہی میں ممکن ہے۔''اس نے سوچا اور راستے سے ہٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اندھیرا گھنا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پلا اب بھی اس کے ساتھ ہے۔

''جانور،انسانوں سے کتنی جلدی مانوس ہو جاتے ہیں!اور دوستی کر لیتے ہیں۔''اس نے سوچا

''ڈبو! میرے ساتھ دوستی کرو گے؟''اس نے پلے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔اس کے ہاتھ کا لمس پاتے ہی وہ دم ہلانے لگا جیسے اسے یہ انداز تخاطب اچھا لگا ہو۔

''اجنبیت انواع کے درمیان خوف پیدا کرتی ہے اور مانوسیت ترحم۔ایک نوع دوسری نوع سے نہیں اس کی اجنبیت سے ڈرتی ہے۔اگر کسی طرح یہ اجنبیت دور ہو جائے تو شیر اور بکری،انسان اور بھیڑیے، بلی اور چوہے، میں دوستی ہو سکتی ہے۔حتیٰ کہ عدم اور وجود میں بھی۔''آخری فقرے پر وہ چونکا:

''عدم اور وجود میں دوستی؟ہاں۔بالکل ممکن ہے۔''

''جیسے اندھیرے اور میرے درمیان دوستی ہے۔''

''پہلے میں اندھیرے سے ڈرتا تھا۔لیکن اب مجھے اس کی گود میں آ کر سکون ملتا ہے۔ویسا سکون جیسا کبھی ماہ نور کی بانہوں میں ملتا تھا۔''اس نے خود ہی سوال اُٹھا کر خود ہی دلائل گھڑے۔

''عدم اور وجود کے درمیان کوئی منطقی پُل موجود نہ سہی۔مگر عدم بھی ایسا ہی ممکن ہے،جیسا وجود۔شاید عدم زیادہ ممکن الوجود ہے۔موجود نہ ہونا؛موجود ہونے سے زیادہ قرینِ قیاس اور قابلِ فہم ہے۔''ایسا سوچتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔اسے یہ محسوس کر کے مایوسی ہوئی کہ وہ موجود ہے۔

''موت اور زندگی دونوں ایک ساتھ عدم سے وجود میں آتے ہیں۔''یہ عجیب فلسفہ سوجھتے ہی اسے چکبست کا شعر یاد آیا:

زندگی کیا ہے ، عناصر میں ظہورِ ترتیب

موت کیا ہے؟ انھی اجزا کا پریشاں ہونا

''زندگی عناصر میں ظہورِ ترتیب اور موت ان کی پریشانی سہی مگر عدم کا پیراڈائم بہت بڑا ہے۔اتنا بڑا کہ:

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

عدم کی کوئی حد ہے نہ سرحد۔وہ ازل گیر وابد آثار ہے۔

اور موت اس ابدیت کی سلطنت میں داخلے کا دروازہ۔

ابدیت کے اس بے کنار سمندر میں وجود کی حیثیت ایک بلبلے کی سی ہے۔''

''جوں ہی زندگی کا کوئی بلبلہ وجود پاتا ہے'موت ایک خلا کی صورت اس میں داخل ہو جاتی ہے۔یوں پہلا سانس موت کی طرف پہلا قدم بھی ہے۔زندگی،موت کے گرد تنا ہوا ایک مہین پردہ ہے جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔''زندگی کی بے ثباتی سے اس کا دھیان برف پر ثبت خرگوش کے پنجوں کی طرف گیا اور اس کے بدن میں ایک سرد لہر تیر گئی۔

وہ اٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔ڈبو بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

(۴)

''ہر خواب اپنی تعبیر آپ ہے۔ خواب کا مطلب وہی ہوتا ہے جو خواب کہتا ہے۔'' ژونگ کا یہ جملہ اس نے آج سے تین سال پہلے اس رات کی اگلی صبح پڑھا تھا، جب وہ بازار سے ایک پلے کے ساتھ گھر آیا تھا۔ اس جملے نے اس کے وجود سے قاتل کا لیبل لحہ بھر میں اتار پھینکا تھا اور اس کی زندگی یک دم بدل سی گئی تھی۔

''جیسا ہوتا ہے، میں ویسا دیکھتا ہوں۔'' اس نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے سوچا تھا۔

وہ ایک مرتبہ پھر ژونگ کی فرائیڈ پر برتری کا قائل ہو گیا تھا۔ اس جملے نے اسے ژونگ کی مزید کتابوں کے مطالعے پر اکسایا۔ اس نے ژونگ کی کتابوں کا مکمل سیٹ اپنے ایک دوست کے ذریعے برطانیہ سے منگوایا۔ تمام کتابیں اس اہتمام سے پڑھیں جیسے وہ باقاعدہ کسی امتحان کی تیاری کر رہا ہو۔

مخفی علوم کے بارے میں ژونگ کے نظریات نے اسے مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا اور اس کی شخصیت میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا۔

جب سے ڈبو بازار سے اس کے ساتھ آیا تھا ایک اور مشغلہ بھی اس کی زندگی کا معمول بن گیا تھا اور وہ تھا ڈبو کے ساتھ سیر سپاٹا کرنا۔ وہ جب بھی مطالعے سے اکتاتا ڈبو کے ساتھ جنگل کی سیر کو نکل جاتا۔ وہ میلوں پھیلے جنگل میں گھنٹوں گھومتے رہتے یا غار کے دو لخت چٹانی چبوترے پر بیٹھے رہتے اور بسا اوقات آدھی آدھی رات کو واپس آتے۔ گھر میں بھی وہ اپنا فالتو وقت ڈبو کے ساتھ کتے لاڈیاں کرتے گزارتا۔ اس کے گھر والے ڈبو کا خیال گھر کے ایک فرد کی طرح رکھتے، خاص کر اس کی ماں۔ وہ اپنے طور پر یہ سمجھتی تھی کہ ڈبو کا قدم اس گھر میں بہت مبارک ثابت ہوا ہے، وہ جب سے آیا ہے اس کا بیٹا معمول کی زندگی کی طرف لوٹ آیا ہے۔ یہاں تک کہ اب وہ اپنی بیوی کا بھی خیال رکھنے لگا تھا۔ وہ اس تبدیلی پر اتنی خوش تھی کہ اپنے شوہر کی ناگہانی موت کا دکھ بھی کسی حد تک بھلا بیٹھی تھی۔

آج وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ وہ کھیتوں کے درمیان بنے راستے سے گزرتا، پگڈنڈیاں عبور کرتا، جنگلی اناروں کے جنگل میں گھس گیا۔ جہاں اناروں کے پھول اب ڈوڈیوں

کا روپ دھار رہے تھے۔ یہ پھل لگنے کی نشانی تھی۔ اسے یاد آیا کہ بچپن میں وہ بستی کے دوسرے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ یہاں اکثر آیا کرتا تھا، خاص کر خزاں کے ابتدائی دنوں میں جب انار پکنا شروع ہوتے۔ وہ پہلے ہر درخت سے ایک ایک انار توڑتے، اسے چکھتے، اگر وہ کھٹا ہوتا تو اسے پھینک دیتے اور اگلے درخت کی طرف نکل جاتے۔ جس درخت کا پھل میٹھا ہوتا اس کے دوست بھاگ کر اس پر چڑھ جاتے لیکن اس نے کبھی ان کی پیروی نہیں کی۔ وہ نیچے کھڑے زمین کی طرف جھکی شاخوں سے انار چونڈتا، دانتوں سے چکی لگا کر اسے گھائل کرتا پھر دونوں ہاتھوں سے اسے دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے اس کے دانے چنتا اور مزے لے کر کھاتا۔

بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کچھ دیر کے لیے اسے لگا جیسے جنگل پہلے سے گھنا ہو گیا ہے اور اناروں کے پیڑوں کی ٹہنیاں پھلوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی ہیں، ایک ٹہنی اس کے منہ کے بالکل آگے ہے، جس کے ساتھ درجن کے قریب انار لگے ہوئے ہیں جن میں سے ٹہنی کے آخری سرے پر دو انار شکل وصورت میں ایک دوسرے سے اتنے مماثل ہیں کہ اگر انھیں چونڈ کر کسی ڈبے وغیرہ میں رکھ لیا جائے اور پھر ہلا کر ڈبہ کھولا جائے تو یہ اندازہ لگانا ناممکن ہوگا کہ کونسا والا انار ٹہنی پر دائیں طرف تھا اور کونسا بائیں طرف۔ وہ انھیں حیرانی سے دیکھ رہا تھا کہ اسے چٹاخ کی سی آواز آئی اور اس نے دیکھا کہ بائیں طرف والا انار تڑخ سا گیا ہے اور اس کے دانے نظر آ رہے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ تڑخنے کی اس آواز پر ڈبو بھی چونکا اور اس نے بھی نظر اُٹھا کر ٹہنی کی طرف دیکھا۔ چٹخا ہوا انار اسے کسی مسکراتی ہوئی حسینہ کے چہرے کی طرح لگا۔ اس نے پلک جھپک کر دوبارہ دیکھا تو وہاں دو ڈوڈیاں سی لٹک رہی تھیں، جو ابھی پھل بننے کے ابتدائی مرحلے میں تھی۔

اس واقعے سے اس کا دھیان پھر سے خوابوں کی طرف چلا گیا اور وہ ان کی ماہیت پر غور کرنے لگا۔

''کیا یہ واقعہ بھی خواب کے ذیل میں آتا ہے۔ اگر یہ محض میرا خواب تھا تو ڈبو کیوں چونکا ہوا۔ کیا اس نے بھی میرے ساتھ کوئی خواب دیکھا؟'' اس نے کتے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا جو اب بھی چونکا تھا اور گردن اٹھائے ٹہنی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''خواب ماضی میں لاشعوری طور پر دبائی گئی خواہشات کا اظہار ہیں، یا مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا اشارہ۔ میں نے نیم خوابیدگی کی حالت میں جس انار کو تڑختا ہوا دیکھا، یہ میری کسی دبائی ہوئی خواہش کا اظہار ہے یا مستقبل کا کوئی منظر ہے؟''

''اگر یہ مستقبل کا کوئی منظر ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ میں انار پکنے کے موسم تک زندہ رہوں؟ بالفرض اگر میں اس دوران میں مر جاؤں تو یہ منظر کون دیکھے گا؟''

وہ اس بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور اس کے دماغ میں اندھیرا سرسرانے لگا۔ اچانک اس اندھیرے میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا، جس میں اسے اپنی ماں کا چہرہ کفن میں لپٹا ہوا نظر آیا۔ اس نے مارے خوف کے اپنی آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ڈبو بھی خوف سے ہانپ رہا ہے۔ جیسے اس نے بھی کوئی ایسا ہی خوف ناک منظر دیکھا ہو۔

''میں اپنی ماں کو سب کچھ بتا دوں گا، وہ تمام خواب جو میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھے، شاید اس طرح وہ مرنے سے بچ جائے۔ میں اپنی ماں کو مرنے نہیں دوں گا۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر کی طرف چل پڑا۔ ڈبو بھی اس کے ساتھ تھا مگر اس بار وہ اس کے پیچھے نہیں آگے آگے تھا۔ جیسا سے زمان سے بھی پہلے گھر پہنچنے کی جلدی ہو۔

گھر پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس کی ماں حسب معمول گھر کے کاموں میں مشغول ہے۔ عزیز خان کی موت نے اس کی زندگی کے دکھوں کے ساتھ ساتھ اس کی ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

ماں کو کاموں میں مشغول دیکھ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں کفن میں لپٹا اس کا زردی مائل چہرہ گھوم گیا اور اس کا پورا وجود کانپ کر رہ گیا۔ ماں نے جب اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تو پریشان سی ہو گئی۔ اس نے دور ہی سے اندازہ لگا لیا کہ جنگل میں ضرور کوئی ان ہونی ہوئی ہے۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی طرف آئی۔

''بیٹا تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔'' ماں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اور یہ ڈبو کو کیا ہوا۔'' اس نے دیکھا کہ کتے کی چال ڈھال بھی بدلی ہوئی ہے۔

'' کچھ نہیں ماں۔ بس تھک سا گیا ہوں۔ آج ہم دونوں بہت بھاگتے رہے ہیں۔'' زمان نے بہانہ بنایا۔ لیکن ماں فوراً بھانپ گئی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

''جنگل میں طرح طرح کی مخلوق ہوتی ہے۔ خدا نہ کرے اس نے کوئی ایسی ویسی چیز دیکھ لی ہو۔'' ماں نے سوچا اور خاموش رہی۔

اس نے کئی مرتبہ ارادہ باندھا کہ وہ ماں کو سب کچھ بتا دے لیکن اس کی ہمت نہیں بندھ رہی تھی۔ ادھر ماں کے دل میں بھی طرح طرح کی خدشے ابھرتے رہے۔

''ہوسکتا ہے کہ اگر میں ماں کو بتا دوں تو وہ اسی غم میں ہی مر جائے کہ اس کے شوہر کی موت کا ذمہ دار میں ہوں۔ وہ کبھی مجھے معاف نہیں کر سکے گی۔'' زمان نے تیرہ اداسی میں ڈوب کر سوچا۔ ایک مرتبہ پھر اس کے ذہن میں اس اندیشے نے جگہ بنالی کہ وہ اسی وجہ سے مرے کہ اس نے ان کو مرتے ہوئے دیکھا تھا۔

''کیا میرا ان کو مرتے دیکھنا ان کی موت کی علت ہے؟'' علت اور معلول کے رشتے پر غور کرتے ہوئے اسے ڈیوڈ ہیوم کا قول یاد آیا:

''یہ ٹھیک ہے کہ علت اور معلول ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں لیکن اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ علت ،معلول کی وجہ ہے ،اس کے پس منظر میں فہمِ انسانی کا محدود ہونا بھی تو ہو سکتا ہے۔'' اس فقرے نے اسے کچھ حوصلہ دیا۔ اسے اپنا فہم واقعی محدود لگا۔ اگلے ہی لمحے اسے ادراک ہوا کہ اس بات کا ادراک صرف اسی نے نہیں کیا بلکہ ڈبو نے بھی اس خطرے کی بو کو محسوس کیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ پچھلے ماہ جب وہ نصف رات کے قریب غار سے اتر کر ڈبو کے ساتھ گھر کی طرف جا رہا تھا تو راستے میں ڈبو یک دم رک گیا تھا۔ پہلے وہ بھاگتا ہوا بائیں سمت والی چٹان کی طرف گیا اور کافی دیر بھونکتا رہا، پھر اس نے اچانک بھونکنا بند کر دیا اور بھاگتا ہوا واپس اس کے پاس آ کر اس کی ٹانگوں میں گھس گیا تھا۔ اتنے میں چٹان کے اوپر ایک خوفناک سایا سا لہرایا تھا، جو چاندنی میں ڈیڑھ سو گز کے فاصلے سے بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے اسے اپنے وہم پر معمول کیا تھا۔ جب وہ میدان کے آخری سرے سے اتر رہا تھا، اسے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی اور ڈبو جو اس وقت اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا بھاگ کر اس کے آگے آگے ہو لیا تھا، اس وقت اس کے نتھنوں میں ایک اجنبی سی بو کا بھبھوکا آگھسا تھا۔ ایک ایسی بو جسے کسی دوسری بو سے مماثل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسناہٹ سی سنائی دی تھی اور خوف سے اس کے دانت بجنے لگے تھے۔ لیکن اس نے خود پر قابو رکھا تھا۔ لحہ بھر کے لیے اسے پیچھے مڑ کر دیکھنے کا خیال آیا تھا لیکن اس کی ہمت نہیں بندھی تھی اسے لگا تھا جیسے اگر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتھرا جائے گا۔ نیلاں بھوتو کی جھیل کے کنارے پتھرائے ہوئے بھینسے کی طرح۔

پتھرائے ہوئے بھینسے کا خیال آتے ہی اس کے قدم مزید تیزی سے اٹھنے لگے تھے اور پیچھے سے آتے قدموں کی آہٹ بھی تیز ہو گئی تھی۔ قدموں کی یہ آہٹ اسے بستی کے قبرستان تک سنائی دیتی رہی تھی جوں ہی اس نے قبرستان پار کیا اور بستی میں داخل ہوا تھا، ہوا میں چیخوں کی ایک لہر سی ابھری تھی،

جو حویلی کے دروازے تک اس کا پیچھا کرتی رہی تھی۔ایسا سوچتے ہوئے اس کے جسم میں خوف کی سوئیاں چبھنے لگیں۔لمحہ بھر کے لیے اسے یوں لگا جیسے اس کے ہر مسام میں ایک سوئی پیوست ہے۔اس نے اس خیال کو جھٹکا تو دیکھا کہ سوئیاں غائب ہیں وہ اس بات کا فیصلہ نہیں کر پایا کہ سوئیاں اس کے جسم سے باہر کہیں گریں یا وجود کی پہنائیوں میں۔

''جانور انسانوں سے زیادہ حساس ہوتے ہیں،وہ خطرے کو پہلے بھانپ لیتے ہیں۔''اس نے ڈبو کو دیکھتے ہوئے سوچا۔جس کی آنکھوں میں کسی ان ہونی کی تصویریں لرزاں تھیں۔

ڈبو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے اسے اپنے ذہن میں خالی پن کا احساس ہوا۔کامل خالی پن کا احساس۔اور اگلے ہی لمحے ایک مرتبہ پھر اسے اپنی ماں کا کفن میں لپٹا ہوا چہرہ نظر آیا۔

رات کو اسے ایک کرب آمیز بے چینی نے آگھیرا۔اس نے محسوس کیا کہ اس بے چینی کی کربنا کی اس خوف سے کہیں زیادہ شدید ہے جو اس رات ڈبو کے ساتھ اس نے محسوس کیا تھا۔

''ممکن ہے ویسا ہی کوئی خوف اس بے چینی کو کم کر سکے۔''اس نے خوف کے اس تجربے سے دوبارہ گزرنے کے لیے فوراً غار پر جانے کا پروگرام بنالیا۔اس نے ماریہ سے،جو کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھی،اجازت چاہی۔پچھلے کچھ عرصے سے وہ جہاں کہیں بھی جاتا ماریہ سے اجازت لے کر جاتا تھا، اسے روکنا تو دور کی بات ماریہ تو اسی بات پر خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی کہ اس کا مجازی خدا اس سے باقاعدہ اجازت لے کر جاتا ہے۔لیکن آج نہ جانے کیوں ماریہ کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ جائے۔اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا کہ وہ اسے روک لے،لیکن پھر یہ سوچ کر کہ کہیں وہ اس کا برا ہی نہ مان جائے، خاموش رہی۔

چاند کی پھانک کو غائب ہوئے گھنٹے سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ہر شے پر اندھیرے اور اندھیرے پر سسکتی خامشی کا خوف طاری تھا۔وہ کمبل کے بجائے اسی خوف کو لبادہ کیے وادی کی طرف چل پڑا۔جب وہ پیالہ نما گڑھے کے دہانے سے گزر رہا تھا تو حسبِ معمول لمحہ بھر کے لیے رکا؛ جوں ہی اس نے اپنے قدم بائیں سمت والی چٹان کی طرف بڑھائے،ڈبو اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا،اسے لگا جیسے وہ اسے اس طرف جانے سے روک رہا ہے۔یک دم اسے بازار میں خود سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا۔اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈبو کی گردن کو دبوچ کر اسے خود سے الگ کیا اور خلافِ معمول بائیں سمت والی چٹان کی طرف قدم بڑھانے لگا۔کچھ ہی دیر میں چٹان پر جا کر وہ کافی دیر چٹان کی چوٹی پر اپنے قدم مضبوطی سے جمائے کھڑا رہا۔اس دوران میں اس نے کئی مرتبہ اوپر غار پر جانے کا ارادہ باندھا مگر پھر اس

نے اچانک فیصلہ کرلیا کہ آج وہ یہیں لیٹ کر آسمان کا نظارہ کرے گا۔وہ چٹان سے اترا اوراس کی پہاڑ والی سمت سے ٹیک لگا کر تاریک خلا میں گھورنے لگا۔گزشتہ روز ہونے والی بارش کی وجہ سے ہوا میں خنکی اور فضا میں شفافیت تھی۔

یک دم اسے کوئی خیال سوجھا۔اس نے اپنی کلائی پر بندھی الیکٹرونک گھڑی کی لائٹ آن کی۔ جوں ہی سکرین روشن ہوئی، اس کی نظر 20:18:45 کے ہندسوں پر پڑی،مگراس سے قبل کے سیکنڈوں والا ہندسہ تبدیل ہوتا،وہ مبہوت سا ہو کر تاریخ کے ہندسوں 28.8.10 کو دیکھنے لگا۔''ناگاساکی اور ہیروشیما سے اٹھنے والے شعلوں کی روشنیاں الدبران پر پہنچ چکی ہوں گی۔''وہ زیرِ لب بڑبڑایا اور خلا میں الدبران کوتلاش کرنے لگا۔

''اندھیرا اور عدم ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔''اس نے اپنی نظریں تاریک خلا سے چھن چھن کر آتی ستاروں کی روشنی پر مرکوز کرتے ہوئے سوچا۔''جس طرح اندھیرے کے پردے پر یہ ستارے ٹانکے ہوئے ہیں اسی طرح عدم کے مہین پردے پر ان گنت وجود۔جن میں سے ایک میرا بھی ہے۔''

''اندھیرے کے اُس طرف تو جھلمل کرتے ستاروں کی روشنی ہے۔لیکن عدم کے اُس طرف؟''اُس نے کچھ دیر توقف کیا۔

''یقیناً اُدھر بھی روشنی ہی ہے۔ازلی وابدی روشنی۔''روشنی کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے اپنے دماغ کے اندر بھی روشنی کا احساس ہوا۔

''اگر وجود کا غبار چھٹ جائے تو ازل سے ابد تک کا ہر منظر آئینہ ہو جائے۔جیسے یہ ستارے۔جن میں سے بے شمار لاکھوں سال پہلے مٹ چکے ہیں۔''

''نہیں لاکھوں سال پہلے نہیں۔اسی لمحے،جس لمحے میں،مَیں انھیں دیکھ رہا ہوں۔ازل ابد تو ایک ہی لمحے کے دو سرے ہیں؛اس لمحے کے جس میں بگ بینگ ہوا تھا۔یہ درمیانی وقفہ تو میرا فرض کیا ہوا ہے۔''

''بالکل ایسے ہی جیسے میں نے اپنے سائنسی علم کی بنیاد پر فرض کر رکھا ہے کہ الدبران اور میرے درمیان پینسٹھ نوری سال کا فاصلہ ہے۔''اس نے الدبران پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''حالاں کہ یہ بات بھی مجھے سائنس ہی نے بتائی ہے کہ یہ کرن جو اس وقت میری آنکھوں کے پردوں سے ٹکرا رہی ہے،اس کی عمر اب بھی اتنی ہے جتنی پینسٹھ سال پہلے الدبران سے روانہ ہوتے وقت تھی۔''

''اب اگر میں یہ دونوں باتیں اسلم کو بتاؤں تو وہ مجھے پاگل سمجھے گا۔بل کی آئن سٹائن کو بھی۔''
وہ خیالوں ہی خیالوں میں مسکرایا۔

''ہر وجود کا اپنا ازل اور اپنا ابد ہے۔میرا اپنا؛اسلم کا اپنا۔ہم دونوں اپنے اپنے ازل،ابد کے درمیان حائل ہیں۔''

''جیسے کائنات کے ازل و ابد کے درمیان خلا حائل ہے۔''

''۔۔۔۔ورنہ ازل سے ابد تک کا تمام وقفہ ایک ہی لحہ ہے؛جسے خلا نے تقسیم کر رکھا ہے۔خلا میں ہونے والا ہر واقعہ دراصل ایک ہی لمحے کے اندر وقوع پذیر ہو رہا ہے۔جیسے میرے خواب،میرے خیالات،میرے احساسات،میرے جذبات،میرے اوہام؛میرے وجود کے اندر وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔وجود جو میرے ازل ابد کے درمیان حائل ہے۔''اس نے اندھیرے میں اپنے وجود کو ٹٹولا،ایک لمبی آہ بھری۔اور دوبارہ الدبران کو دیکھنے لگا:

''یہ منور لحہ پینسٹھ سال پہلے کا لحہ ہے۔اگر میں پینسٹھ سال پہلے اس کرن کی رتھ پر سوار ہوتا تو آج میری عمر ایک لحہ ہوتی اور میں ابد تک اپنی عمر کے اگلے لمحے کو ترستا رہتا۔جیسے بگ بینگ سے ابھرنے والا ایک فوٹان؛جس کی عمر آج بھی اتنی ہے جتنی بگ بینگ کے وقت تھی۔پونے چودہ ارب سالوں سے وہ اگلے لمحے کو ترس رہا ہے۔''

''لیکن ان دونوں لمحوں کے درمیان؛جو ایک اور بالکل ایک ہیں،یہ پونے چودہ ارب سال کہاں سے آ گئے۔''

''خلا کی مداخلت سے۔جس نے ایک لمحے کو پونے چودہ ارب سال پر تقسیم کر دیا۔''

''اگر یہ خلا نہ ہوتا تو۔۔؟''اس نے خلا میں گھورتے ہوئے سوال اٹھایا۔''تو بھی شاید خلا ہی ہوتا۔''اسے عجیب سا فلسفہ سوجھا۔لیکن اگلے ہی لمحے وہ پھر طبعیات کی طرف لوٹ آیا۔جو کسی زمانے میں اس کا پسندیدہ سبجیکٹ رہا تھا:

''اگر کائنات کے مجموعی مادے سے خلا کو نکال دیا جائے تو اس کا حجم گرنڈے کے کانٹے کی نوک برابر رہ جائے۔''ایسا سوچتے ہوئے،اس نے اندھیرے میں بائیں ہتھیلی پر دماغ کی لکیر ٹٹولی اور دائیں ہاتھ کی انگلی سے اسے مس کیا۔اسے لگا جیسے زلزلے کی رات،پوری کائنات،گرنڈے کے کانٹے کی باریک نوک میں سمٹ کر اس کی ہتھیلی میں موجود دماغ کی لکیر میں اتر گئی تھی؛اور زمان و مکان ایک ہو کر رہ گئے تھے۔

''۔۔اور میں تئیس سو برس کا ہو گیا تھا۔چٹان پر کندہ عبارت کی عمر جتنا۔''اس کے کانوں میں جھینگروں کے چٹان سے ٹکرانے کی آوازیں آنے لگیں۔اس نے بغور سنا تو یہ آوازیں میدان کے نیچے واقع کھائی میں پڑی چٹان کے بجائے پیالہ نما گڑھے سے آ رہی تھیں۔

''یہ آوازیں اب بھی خلا میں محفوظ ہیں۔''اس نے سوچا۔

''خلا بھی عجیب شے ہے، جو بیک وقت ہے بھی اور نہیں بھی۔اس کی کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔گرنڈے کے کانٹے کی نوک جتنا مادہ اس کے ہاتھ لگا اور اس میں داخل ہو کر اس نے اسے چودہ ارب نوری سال کو محیط ایک وسیع کائنات بنا دیا۔اگر مادے سے خلا خارج ہو جائے تو وہ پھر سے ایک ذرے میں سمٹ آئے۔پھر شاید یہ ذرہ، ضدِ مادہ سے ٹکرا کر فنا ہو جائے اور پیچھے وہی خلا رہ جائے۔''

نہ تھا کچھ تو 'خلا' تھا، کچھ نہ ہوتا تو 'خلا' ہوتا۔''غالب کے مصرعے میں من مانی تبدیلی کر کے اسے سرشاری کا احساس ہوا۔

''خلا ہی کائنات کی اساس ہے۔الیکٹرون جیسے بنیادی ذرے کے اندر بھی خلا ہے۔''ایسا سوچتے ہوئے اسے اپنے اندر بھی ایک خلا کا احساس ہوا۔لیکن اگلے ہی لمحے اسے یہ خلا پُر ہوتا اور وجود سمٹتا ہوا محسوس ہوا۔وہ کافی دیر اس سمٹاؤ کو محسوس کرتا رہا۔اسے لگا جیسے یہ سمٹاؤ اتنا لامتناہی ہے کہ وہ کسی بھی الیکٹرون میں داخل ہو سکتا ہے۔ایک خوردبینی ذرے میں داخل ہونے کے خیال سے وہ خوف زدہ ہو گیا اور اس خیال کو جھٹک کر الیکٹرون کی ماہیت کے بارے میں سوچنے لگا۔

''ممکن ہے ہر الیکٹران کے اندر بھی ایک کائنات ہو۔ایک بند کائنات۔''اس نے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔

''اور اس الیکٹرونی کائنات میں ہماری کائنات کی طرح کی لاتعداد کہکشائیں۔ان کہکشاؤں میں سے ایک میں نظامِ شمسی سے ملتا جلتا ایک نظام ہو۔جس میں سورج جیسے کسی ستارے کے گرد زمین سے ملتا جلتا ایک سیارہ گردش کر رہا ہو۔اس سیارے پر ایشیا جیسا ایک براعظم ہو، براعظم کے نقشے میں پاکستان جیسا ایک ملک ہو۔جس کے دارالحکومت کے شمال میں کچھ پہاڑیاں ہوں۔ان پہاڑیوں میں نور آباد نام کی ایک بستی ہو۔بستی کے شرق میں ایک پہاڑ ہو۔پہاڑ کے دامن میں ایک غار ہو۔جس کی پتھریلی چھت پر انسانی ہتھیلی کی لکیروں سے ملتی جلتی لکیریں ہوں۔جو دماغی لکیر والی جگہ سے دولخت ہو۔غار کی بالکل سیدھ میں نیچے ایک گڑھا ہو، گڑھے کے دونوں طرف کچھ اوپر مثلث بناتی دو چٹانیں ہوں، جن میں سے ایک سے ٹیک لگائے میرا کوئی ہم نام اور ہم شکل بیٹھا اپنے نظامِ شمسی سے

پرے کا نظارا کر رہا ہو، اور یہ سب اسی ایک ازل گیر و ابد آثار لمحے میں ہو رہا ہو۔''
''پھر اس امکان کو بھی تو رد نہیں کیا جا سکتا۔'' اس نے اپنے اس خیال کو بڑھاوا دیا۔
''کہ اس الیکٹرونی کائنات کے ہر الیکٹرون کے اندر ایک اور کائنات بند ہو؛ ہماری اس بسیط کائنات جیسی۔ پھر اس کائنات کے اندر ایک اور کائنات۔''
''۔۔۔ اور ہر کائنات میں میرا ایک ہم زاد۔''
''لیکن اس بات کی کیا دلیل ہے کہ میں ایک وسیع کائنات کا باشندہ ہوں اور وہ ایک الیکٹرونی کائنات کے۔''
''یہ بھی تو ممکن ہے کہ میری کائنات؛ کسی اس سے بھی کھربوں گنا بڑی کائنات کے ایک الیکٹرون میں سانس لے رہی ہو۔ اور اصل زمان خان وہاں کی کسی چٹان سے ٹیک لگائے خلا میں گھور رہا ہو۔'' اس نے خود کلامی کے تسلسل میں توقف کیا اور کچھ فاصلے پر بیٹھے ڈبو کو دیکھنے لگا، جو اندھیرے میں ایک ہیولا سا لگ رہا تھا۔
''چلو ایسا ممکن نہ سہی۔ مگر ایسا فرض کرنے میں کیا حرج ہے۔'' کچھ توقف کے بعد اس نے خود کلامی کو وہیں سے جوڑا۔
''ہم ہر بات فرض ہی تو کرتے ہیں۔ جیسے میں نے یہ فرض کیا کہ میں پیدا ہوا؛ پڑھا لکھا، عشق کیا، شادی کی، یہاں بیٹھ کر خلاؤں میں گھورا کیا۔ اور اپنے عزیزوں کی موت کا سبب بنا۔''
''حالاں کہ نہ میں پیدا ہوا اور نہ وہ مرے۔ جب وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تو میں ان کی موت کا سبب کیسے بن سکتا ہوں۔ ایک آدمی جو کبھی معرضِ وجود ہی میں نہیں آیا، وہ کیسے ان لوگوں کو مار سکتا ہے جو کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے۔''
''ممکن ہے یہ سب خواب ہو۔'' اس نے اپنی سوچ کا زاویہ بدل کر سوچا۔
''اور خواب میں مجھے جن لوگوں کے بارے میں وہم ہو رہا ہے کہ میں نے انھیں مار دیا۔ دراصل وہ جاگ گئے ہوں اور میرے خواب سے غائب ہو گئے ہوں۔''
''کیا ان لوگوں سے میری ملاقات ممکن ہے؟''
''اوووں۔ ہاں۔''
''لیکن اس کے لیے مجھے بھی خواب سے باہر نکلنا پڑے گا۔'' اس نے اپنے بائیں ہاتھ پر چٹکی کاٹی حسبِ معمول اسے یہ دیکھ کر شدید دھچکا لگا کہ وہ خواب سے باہر ہے۔ اس نے وقت دیکھا 2:12

ہو رہے تھے۔ وہ اٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ ڈبو بھی اس کے ساتھ تھا، اس نے نوٹ کیا کہ وہ بے چین ہے اور چلتے ہوئے بار بار اس کی ٹانگوں سے الجھ رہا ہے۔ وہ کئی بار راستے سے ہٹا کہ شاید وہ آگے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن جیسے ہی وہ اسے راستہ دینے کے لیے رکتا ڈبو بھی رک جاتا۔ جب وہ میدان کے آخری سرے سے نیچے اتر رہا تھا تو ڈبو نے اس کی شلوار کا پائنچہ پکڑ کر اسے پیچھے کھینچا، جیسے وہ اسے گھر جانے سے روک رہا ہو۔

گھر پہنچ کر جوں ہی اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا، ڈبو نے اچھل کر اپنی اگلی ٹانگیں دروازے کے پٹوں پر دے ماریں اور دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اس کی آواز سن کر ماریہ بھی جاگ گئی، دونوں میاں بیوی نے بڑی مشکل سے قابو کر کے اسے اس کی کوٹھری میں باندھا اور اپنا دروازہ بند کر لیا۔ کافی دیر تک اسے ڈبو کے غرانے کی آوازیں آتی رہیں۔ اس غرغراہٹ میں ایک عجیب خوف تھا۔ وہ اسی خوف کو اوڑھ کر ماریہ کے پہلو میں لیٹ گیا۔ آہستہ آہستہ اسے لگا جیسے نیند اس پر غلبہ پا رہی ہے۔

(۵)

نیم خوابی کی حالت میں اسے اپنے پورے بدن میں ایک کھنچاؤ کا سا احساس ہوتا ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے اس کے پاؤں سُن ہو رہے ہیں۔ وہ بستر سے اٹھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ناکام رہتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی پنڈلیاں بھی سن ہونے لگتیں ہیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا نچلا دھڑ مکمل طور پر سُن ہو چکا ہے۔ جوں ہی سن ہونے کا یہ عمل اس کی ناف تک پہنچتا ہے اسے لگتا ہے کہ جیسے وہ اپنے بدن سے آہستہ آہستہ باہر آ رہا ہے۔ کچھ لمحوں بعد وہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے بدن سے مکمل طور پر باہر آ کر اوپر فضا میں تیر رہا ہے جب کہ اس کا جسم پلنگ پر ساکت پڑا ہوا ہے۔

وہ اک نظر اپنے جسم کے ساتھ پڑی ماریہ کی طرف دیکھتا ہے جس کا سینہ سانسوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اوپر نیچے حرکت کر رہا ہوتا ہے۔ پھر وہ ایک ساتھ اپنے اور ماریہ کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے۔ اسے حیرت ہوتی ہے کہ اس کے اپنے چہرے پر تو پژمردگی سی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن ماریہ کا چہرہ تر و تازہ اور پُرنور ہے، بالکل ماہ نور کے چہرے جیسا۔

وہ اپنے چہرے سے نظریں بچاتے ہوئے ماریہ کے چہرے کے خدوخال کو بغور دیکھتا ہے، اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کہ نیچے بستر پر اس کے جسم کے ساتھ پڑا ہوا دوسرا جسم ماریہ کا نہیں ماہ نور کا ہے۔ وہی چہرہ، وہی ماتھا، وہی آنکھیں، وہی ناک، وہی ابھرے ہوئے ہونٹ، اور بائیں نتھنے کے نیچے سیاہ لمبوترا تل؛ جیسے کوئی درویش کالا کمبل اوڑھے سو رہا ہو۔ وہ لمحہ بھر کے لیے آنکھیں بند کر کے اس منظر کو ذہن میں تازہ کرتا ہے جب چاندنی راتوں میں پچھلے پہر چٹانی چبوترے سے اتر کر مغربی سمت واقع چھوٹی پہاڑی پر کھڑے ہو کر وہ اپنی محبوب پہاڑی حسینہ کا دیدار کرتا ہوتا تھا۔

پہاڑ کا منظر تصور میں ابھرتے ہی وہ اپنی نظریں غار پر جماتا ہے لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کا کالا کمبل، جسے وہ دانستہ چبوترے پر چھوڑ آیا کرتا تھا اس کے تصور سے غائب ہے۔ پھر

وہ اپنی نظریں آہستہ آہستہ نیچے چٹانوں کے ابھاروں کی طرف لاتا ہے۔ جہاں بائیں چٹان کے ابھار پر اسے اپنا ہیولہ سا دکھائی دیتا ہے۔ وہ خوف زدہ سا ہو کر اک اچٹتی سی نظر پیالہ نما گڑھے پر ڈالتا اور پھر اس کی نظریں نیچے وادی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے والے قدیم راستے پر آ کر ٹھہر جاتی ہیں۔ وہ حسب معمول اپنی نظریں دوبارہ اوپر کی طرف لے جانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ چبوترے پر پہلے کمبل کو اور پھر اس میں خود کو تلاش کر سکے لیکن ایسا کرنے میں وہ خود کو ناکام پاتا ہے۔ وہ ماہ نور کے خدوخال کو ذہن میں لانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کے تصور میں ماریہ کے نین نقش ابھرتے ہیں۔ تنگ آ کر وہ اپنی نظریں اس ممنوعہ خطے کی طرف لانے کا فیصلہ کرتا ہے، جسے دیکھنے کا اسے کبھی حوصلہ نہیں ہوا تھا۔ جوں ہی اس کی نظریں اس خطے میں داخل ہوتی ہیں، وہ اپنے آپ کو ماریہ کے وجود میں گم ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ وہ ماریہ کے وجود کی پہنائیوں میں بھٹک رہا ہوتا ہے کہ اسے ماریہ کی ایک دلدوز سی چیخ سنائی دیتی ہے، جسے سن کر فرمان بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔

زمان فوراً اپنے آپ کو ماریہ کے وجود سے الگ کر کے دوبارہ فضا میں معلق ہو جاتا ہے اور ماریہ بے ہوش ہو کر بستر پر گر جاتی ہے۔ فرمان کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلے ماریہ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جیسے ہی اس کی نظر اس کے بے حس وحرکت جسم پر پڑتی ہے وہ ماریہ کو چھوڑ کر اس کی طرف لپکتا ہے اور بدحواس سا ہو کر اس کی نبض ٹٹولنے لگتا ہے۔ جوں ہی فرمان کا ہاتھ اس کی نبض پر پڑتا ہے، اس کے منہ سے ایک سسکاری سی نکلتی ہے اور اس کا چہرہ یک دم فق ہو جاتا ہے۔ وہ باہر کی طرف بھاگتا ہے۔ زمان اسے بلانے کی کوشش کرتا ہے، مگر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی آواز اسے سنائی نہیں دے رہی۔ تھوڑی دیر میں اس کی ماں اور دیگر لوگ کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ جوں ہی اس کی ماں اسے دیکھتی ہے اس کی ہچکی بندھ جاتی ہے اور وہیں فرش پر ڈھیر ہو جاتی ہے۔ فرمان اور اس کے کچھ عزیز اس کی ماں کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جاتے ہیں۔

کچھ دیر بعد جب ماریہ کو ہوش آتا ہے تو وہ اس سے لپٹ کر زور زور سے چلانے لگتی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے عزیز واقارب اس کے اردگرد جمع ہونے لگتے ہیں۔ اس کے کانوں میں رونے اور بین کرنے کی صدائیں آنے لگتیں ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ صدائیں مزید گہری ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں آواز اس کی بہن کی ہوتی ہے۔ کچھ دیر بعد اس کا ایک عزیز آ کر

اس کی بہن کے کان میں کچھ کہتا ہے،اور وہ دیوانوں کی طرح دوسرے کمرے کی طرف بھاگتی ہے۔پھر یکے بعد دیگرے لوگ اس کے پاس سے اٹھ کر جانے لگتے ہیں اور اس کے اردگرد صرف اس کے دو تین قریبی عزیز و اقارب ہی رہ جاتے ہیں۔

اتنے میں صبح ہو جاتی ہے اور اس کے اردگرد پھر سے ایک میلہ سا لگ جاتا ہے۔اسے نہلا دھلا کر کفن پہنایا جاتا ہے؛اس پر طرح طرح کی خوشبوئیں چھڑکی جاتی ہیں اور اسے ایک چارپائی پر ڈال کر باہر صحن میں رکھ دیا جاتا ہے۔تھوڑی دیر میں اس کے کچھ عزیز و اقارب ایک اور چارپائی اٹھائے صحن کی طرف آتے ہیں اور اس کی چارپائی کے برابر میں رکھ دیتے ہیں۔اس پر بھی کفن میں لپٹی ایک لاش رکھی ہوتی ہے۔

اسے تجسس ہوتا ہے کہ یہ دوسری لاش کس کی ہے؟ تھوڑی دیر میں دونوں لاشوں کے چہرے سے کفن سرکایا جاتا ہے۔وہ دیکھتا ہے کہ دوسری چارپائی پر اس کی ماں کا کفن میں لپٹا ہوا چہرہ ہے،اور یہ منظر بالکل ویسا ہے جیسا اس نے جنگلی اناروں کے جنگل میں دیکھا تھا۔اسے حیرانی ہوتی ہے کہ اپنی ماں کو مردہ دیکھ کر اسے ذرہ برابر دکھ نہیں ہو رہا،الٹا ایک راحت کا سا احساس ہو رہا ہے۔

عصر کی نماز کے بعد جب دونوں میتیں اٹھا کر قبرستان کی طرف لے جائی جانے لگتی ہیں تو وہ ان کے ساتھ ساتھ فضا میں اڑتا ہوا جا رہا ہوتا ہے۔قبرستان پہنچ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ جنازہ گاہ میں اتنے لوگوں کے کھڑے ہونے کی گنجائش نہیں اس لیے جنازہ میدان میں ادا کیا جائے گا۔میدان کا سن کر اس کے وجود میں سرخوشی کی ایک لہری دوڑ جاتی ہے اور وہ چٹان پر کندہ عبارت کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔

میدان میں پہنچ کر جنازوں کو میدان کے مغربی سرے پر عین اس جگہ رکھا جاتا ہے، جہاں بیٹھ کر اس نے پہلی بار چٹان پر کندہ عبارت پڑھی تھی۔لوگ جنازہ پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں اور وہ چٹان کی عبارت۔

جنازے کے بعد صرف اس کی لاش کے چہرے پر سے کفن سرکایا جاتا ہے اور لوگ اس کا دیدار کرنے لگتے ہیں۔خود وہ بھی اپنا پھولا ہوا پیلا ہٹ زدہ چہرہ دیکھتا ہے۔اس کے ناک اور کانوں میں روئی ٹھنسی ہوتی ہے۔جن سے خون ملی زرد رطوبت سی بہہ رہی ہوتی ہے،جس سے اسے کچھ گھن سی آتی

ہےلیکن اگلے ہی لمحے اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ وہ اس وقت اپنے بدن میں موجود نہیں ۔

آخری دیدار کے بعد جب اس کی میت اٹھائی جانے لگتی ہےتو وہ اپنی نظریں چٹان کی عبارت پر مرکوز کرلیتا ہےاور نظروں سے اوجھل ہونے تک اسے ٹک ٹکی باندھے دیکھتا رہتا ہے۔

جب اس کی میت اس کی قبر کے کنارے رکھی جاتی ہےتو وہ ایک نظر قبرستان پر دوڑاتا ہے جہاں دوسو سے زائد قبریں ہیں ۔جن میں سب سے نمایاں قبر اس کے جدِامجد نورخان کی ہے جو ان کے اپنے پوتے ظفر علی خان کے مزار کے احاطے کے بالکل ساتھ ہے ۔زیادہ تر قبریں پکی ہیں لیکن کچھ قبریں ابھی تک کچی ہیں ۔ان کچی قبروں کے درمیان اس کے باپ کی قبر ہے جو نئی نئی پختہ کرائی گئی ہے اور اس پر مرجھائے ہوئے پھول پڑے ہیں ۔اس کے پہلو میں دو نئی قبریں تیار، اپنی میتوں کے انتظار میں ہیں ۔

پہلے اس کی ماں کو قبر میں اتارا جاتا ہے، قبر کا آخری تختہ رکھے جانے تک وہ کفن میں لپٹی اس کی لاش دیکھتا رہتا ہے۔

پھر اس کی نظر نورخان کی قبر پر سایہ کیے ہوئے جنگلی انار کے درخت کی ایک ٹہنی پر پڑتی ہے، جو اناروں سے لدی ہوئی ہے ۔ٹہنی کے آخری سرے پر دو انار شکل وصورت میں ایک دوسرے سے اتنے مماثل ہوتے ہیں کہ اگر انھیں ٹہنی سے چونڈ کر کسی ڈبے وغیرہ میں رکھ لیا جائے اور پھر ہلا کر ڈبے کھولا جائے تو یہ اندازہ لگانا ناممکن ہوگا کہ کونسا والا انار ٹہنی پر دائیں طرف تھا اور کونسا بائیں طرف ۔وہ انھیں حیرانی سے دیکھتا ہے ۔اتنے میں اسے چٹاخ کی سی آواز آتی ہے ۔وہ دیکھتا ہے کہ بائیں طرف والا انار تڑخ سا گیا ہےاور اس کے دانے نظر آرہے ہیں ۔سرخی مائل سفید دانے؛ جیسے کسی حسینہ کے دنداسہ ملے دانت ۔ڈبو، جو درخت کے نیچے بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم دکھائی دے رہا ہوتا ہے، انار چٹخنے کی آواز پر یک دم چونک اٹھتا ہےاور تیرہ اداسی سے ٹہنی کی طرف دیکھتا ہے ۔کچھ دیر وہ ڈبو کو دیکھتا رہتا ہے ۔اسے حیرت ہوتی ہے کہ ڈبو کو اداس دیکھ کر اسے کوئی دکھ نہیں ہوا۔

''کاش ماہ نور کی قبر بھی یہاں ہوتی ۔'' وہ اپنی نظریں ڈبو سے ہٹا کر اپنی ماں کی قبر پر مرکوز کرتے ہوئے سوچتا ہے ۔جس پر مٹی ڈالی جا چکی ہوتی ہے۔

ماں کی تدفین کے بعد سب لوگ اس کی لاش کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔جب اس کی لاش

قبر میں اتارنے کے لیے اٹھائی جاتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے یہ منظر پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، وہ اسے یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے اسے لگتا ہے جیسے وہ دماغ سے تہی ہے۔ وہ عجیب سی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس الجھن سے چھٹکارا اسے اس وقت ملتا ہے جب اس کی قبر پر تختے رکھے جا رہے ہوتے ہیں اور یک دم اسے وہ منظر یاد آ جاتا ہے، پوری جزئیات کے ساتھ۔ یہ منظر اس نے اس طویل خواب میں دیکھا ہوتا ہے جو اس نے کومے کے دوران میں دیکھا تھا، جب وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے مرشد کا سر ایک دریا کنارے دفن کر رہا ہوتا ہے۔

''مرشد!''۔ وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

جوں ہی قبر کا آخری تختہ رکھا جاتا ہے اور اس کی لاش اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے، اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے، وہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے، چیختا چلاتا ہے لیکن کوئی اس کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ یک دم اسے خیال آتا ہے کہ وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے، اپنے بائیں ہاتھ پر چٹکی کاٹنے کے لیے اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کو تیار کرتا ہے، چٹکی کاٹنے سے پہلے وہ حسبِ معمول ہتھیلی کھول کر لکیریں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ دیکھ کر کہ ہتھیلی پر صرف اس کے دماغ کی لکیر ہے اور وہ بھی خاصی دھندلی، باقی تمام لکیریں غائب ہو چکی ہیں، اسے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی بہت ہی عجیب و غریب خواب دیکھ رہا ہے۔

وہ ہتھیلی کی پشت پر زور سے چٹکی کاٹنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے یہ دیکھ کر شدید دھچکا لگتا ہے کہ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھا دونوں بائیں ہتھیلی کی پشت سے داخل ہو کر دوسری طرف سے باہر نکل گئے ہیں اور وہاں غار کے چبوترے پر پڑنے والے شگاف کی طرح شگاف پڑ گیا ہے۔ جوں ہی وہ انگلی اور انگوٹھا واپس کھینچتا ہے، شگاف دوبارہ بھر جاتا ہے۔ وہ بھونچکا سا ہو کر اپنے ہاتھوں کو دیکھتا ہے اور پھر دیکھتا ہے کہ اس کے عزیز و اقارب اس کی قبر کے تختوں کی درزیں بھر چکے ہیں اور مٹی ڈالنے کے لیے کدالوں اور بیلچوں کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

وہ چٹکی کاٹنے کے عمل کو کئی بار دھراتا ہے اور ہر بار اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھا بائیں ہتھیلی سے آر پار ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ دونوں ہاتھوں کو تالی بجانے کے انداز میں مس کرنے کی کوشش کرتا ہے جو مس ہوئے بغیر ایک دوسرے سے گزر جاتے ہیں۔ جیسے شیشے سے روشنی۔

وہ خود کو روشنی میں ڈھلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ اس کا وجود ایک، دو ابعادی روشن سایہ ہے جو ٹھوس سے ٹھوس چیز سے بھی گزر سکتا ہے جب کہ اس کی نظر چار ابعادی ہو گئی ہے اور ازل سے ابد تک کا ہر منظر اس پر آئینہ ہو گیا ہے۔

وہ دیکھتا ہے کہ ازل اور ابد ایک ہی لمحے میں سانس لے رہے ہیں اور ان کے چاروں طرف خلا ہے، خلا جو ابتدا و انتہا سے ماورا ہے۔

''کاش! میں اس خواب سے کبھی باہر نہ نکل پاؤں۔'' وہ سوچتا ہے۔

(۶)

ٹھیک ایک سال بعد ہزاروں نوری سال کی دوری سے آتی روشنی کی لہروں نے دیکھا کہ ماریہ حویلی کے صحن میں بچھے پلنگ پر سوئی پڑی ہے اور اس کے پہلو میں تین ماہ کا ایک بچہ، اپنی ماں کی موجودگی سے بے خبر، ستاروں بھرے آسمان میں نظریں جمائے یوں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے، جیسے ہر آن دور جاتے ستاروں کو پاس بلا رہا ہو۔ اپنے مرحوم باپ کی طرح اس کا پلکیں جھپکنے کا دورانیہ بھی حیرت انگیز حد تک طویل ہے۔ جب کہ اس کی بائیں ہتھیلی میں، پیدائشی طور پر، ایک مندمل ہو چکے زخم کا باریک سا نشان ہے، اتنا باریک کہ یہ ابھی تک اس کی ماں کے مشاہدے میں بھی نہیں آیا۔ تاہم اس بات کا امکان موجود ہے کہ دولخت چٹانی چبوترہ اس نشان پر برابر نظر رکھے ہوئے ہو۔